بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

اپریل 2019

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 10
حمد، زاہد قاسمی 11
نعت، امت الرحمن مومنہ 11
نبی کی باتیں، ادارہ 12

انٹرویو

احد میر سے ملاقات، شاہین رشید 247
جب تجھ سے ناتا، ز۔ ش 20
دستک، شاہین رشید 17
شعاع کے ساتھ، ادارہ 33

ناول

شہر تمنا، نعیمہ ناز 36
شام کی حویلی میں، رخسانہ نگار عدنان 152
شہرزاد، صائمہ اکرم 207

مکمل ناول

آسمان کا چاند، حیا بخاری 104
مثلِ ابرِ کرم ہے تو، شیریں ملک 178

ناولٹ

سبین کی سسرال، راشدہ رفعت 80

افسانے

پائل دار، افتین نعیم 66
چھوٹا سا دل، عندلیب زہرا 76
اسٹیٹس اپ لوڈ، عائشہ تنویر 97
اپنی باری، نظیر فاطمہ 147
خزاں کے بعد، سویرا فلک 175

نظمیں غزلیں

غزل، داغ دہلوی 240
نظم، احمد ندیم قاسمی 239
غزل، قیصر الجعفری 239
غزل، افتخار قیصر 240

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ)-----700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ----6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا---7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلے کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

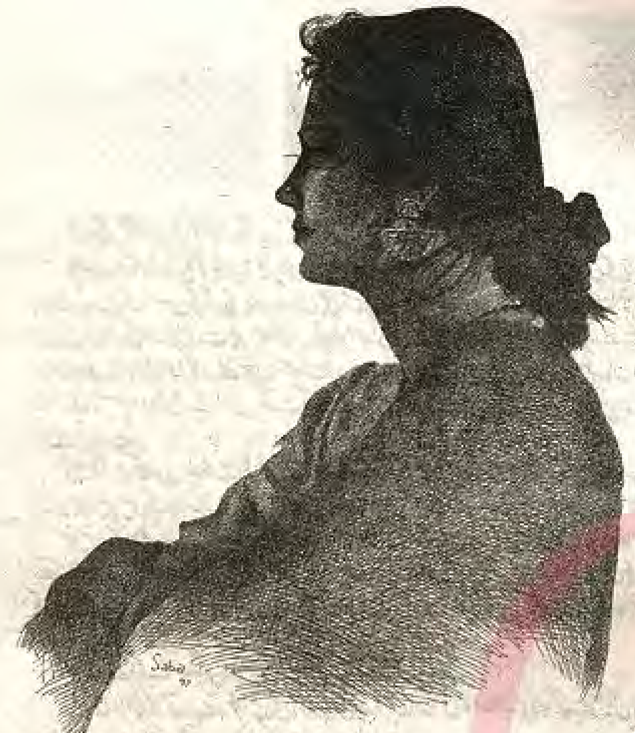

مستقل سلسلے

خط آپ کے، رضیہ جمیل 24
مسکراہٹیں، ادارہ 241
آئینہ خانے میں، واصفہ سہیل 251
باتوں سے خوشبو آئے، شگفتہ جاہ 244
کھلتا کسی پہ، خالدہ جیلانی 243
تاریخ کے جھروکے، امت الصبور 253
موسم کے پکوان، خالدہ جیلانی 256
خوبصورت بنیے، ادارہ 258

اپریل 2019
جلد 33 شمارہ 8
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا -
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ جیلانی

پہلی بات

شعاع کا اپریل کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

پچھلے ماہ آٹھ مارچ کو دُنیا بھر میں خواتین کا عالمی دن منایا گیا۔ عورت کے حقوق کی بات کی گئی خوش آئند بات یہ ہے کہ اس کی گونج ہمارے ہاں بھی سنائی دی۔ جس معاشرے میں غیرت کے نام پر قتل ہوتے ہوں۔ پسند کی شادی کی سزا موت ہو، جہاں باپ، بھائی اپنے دشمنوں کو قتل کر کے سزا سے بچنے کے لیے بہن، بیٹی پر کاری ہونے کا الزام لگا دیتے ہوں، جہاں عورت پر تعلیم کے دروازے بند ہوں، جہاں وہ مذہب و شریعت کے منافی رسم و رواج کے ہاتھوں گھٹ گھٹ کر جینے پر مجبور ہو، وہاں خواتین کی آزادی اور ان کے حقوق کی بات ضرور ہونی چاہیے۔

آج جبکہ ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں، عورت کے حقوق اور آزادی تو بڑی بات ہے، یہاں اسے انسان بھی تسلیم نہیں کیا جا سکا ہے۔

خواتین کے عالمی دن کے موقع پر ہمارے ہاں بھی مختلف تنظیموں اور این جی اوز کے زیرِ اہتمام سیمینار منعقد کیے گئے۔ تقاریر ہوئیں۔ جلوس نکالے گئے۔ جنہیں خواتین مارچ کا نام دیا گیا۔ لیکن ان مظاہروں میں خواتین جو پوسٹر لے کر کھڑی تھیں، ان پر درج تحریروں کا خواتین کے اصل مسائل سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ انہیں صرف بے ہودگی کہا جا سکتا ہے۔

انہوں نے ایک سنگین اور سنجیدہ مسئلے کو مذاق بنا کر رکھ دیا۔

آزادی ہر فرد کا حق ہے۔ خواتین کی آزادی کی جدوجہد اور اس کا مطالبہ بھی جائز ہے لیکن اظہار اور مطالبوں میں معقولیت اور انہیں عقل و دلائل کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔

کھانا گرم کرنا۔ موزے ڈھونڈنا عورت کا مسئلہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ وہ عزت، احترام اور آزادی ہے جو عورت کا بنیادی حق ہے۔

عورت کے حقوق اور اس کی آزادی کے لیے مردوں کے ساتھ عورتوں میں بھی شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ عورت خود عورت کی راہ میں رکاوٹ اور اس کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ ساس کے روپ میں بہو کی خوشیوں سے حسد، بہو کے روپ میں ساس سے عداوت، ماں ہے تو بیٹیوں سے امتیازی سلوک۔ اگر مرد بیوی سے بے وفائی کرتا ہے تو اس کے پیچھے بھی عورت ہی ہوتی ہے۔ پسند کی شادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ماں بہنیں ہی ہوتی ہیں۔

ہر مرد کی پہلی تربیت گاہ ماں کی آغوش ہوتی ہے۔ مختلف رشتوں کے روپ میں عورت کے احترام کا پہلا سبق اسے ماں ہی سکھاتی ہے۔ عورت اپنے حسد، جلن کے جذبوں پر قابو پا کر اسے عورت کے احترام کا سبق دے تو معاشرے میں جو تبدیلی آئے گی، وہ حقیقی ہو گی۔

اس شمارے میں،

- حیا بخاری کا مکمل ناول ۔ اس آسماں کا چاند، ، شیریں ملک کا ناول ۔ ابر کرم ہے تُو،
- راشدہ رفعت کا ناولٹ ۔ سبین کا سسرال، ، رخسانہ نگار عدنان اور نفیسہ ناز کے ناول،
- افشین نعیم، عندلیب زہرا، نذیر فاطمہ، عائشہ تنویر اور سویرا فلک کے افسانے،
- تجھ سے ناتا جوڑا ہے ۔ قارئین کا سلسلہ، ، معروف اداکار احد میر سے ملاقات،
- فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک، ، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

حمد

باری تعالیٰ

کعبہ دیکھا تو ہم دیکھتے رہ گئے
رب کا لطف و عطا دیکھتے رہ گئے

آنکھیں جھک جھک کے کعبے کو تکتی رہیں
فضلِ ربّ العلیٰ دیکھتے رہ گئے

ہم گنہگار کعبہ میں جب آ گئے
رب کی رحمت سدا دیکھتے رہ گئے

میں نے مانگی تھی کعبہ میں جو بھی دُعا
پوری ہوتی دُعا دیکھتے رہ گئے

دیکھی ہر آنکھ پُرنم خدا کے حضور
آنسوؤں کی گھٹا دیکھتے رہ گئے

میرے مولا نے بخشے گناہ بن کہے
زاہدِ بے نوا دیکھتے رہ گئے

زاہد قاسمی

نعت

رسول مقبولؐ

خدا نے آپؐ کو عالم کی سروری دے دی
یوں بشر کے تن مردہ کو زندگی دے دی

جہاں میں حق کا ہے نور آپؐ کے وسیلے سے
ختم اندھیرا کیا اور روشنی دے دی

بتایا مقصدِ ہستی، دکھائی راہ سیدھی
یہ آپؐ کا ہی ہے احسان، آگہی دے دی

مقام آپ کا یہ ہے کہ ربِ باری نے
ذکر بلند کیا، شان اک نئی دے دی

ہے دل مچلتا درِ مصطفیٰؐ پہ جانے کو
مجھے حضورؐ کے عشق نے دیوانگی دے دی

کروڑوں بار درود و سلام آقاؐ پر
کہ بارگاہِ خدا سے وابستگی دے دی

امت الرحمٰن مومنہ

ادارہ

اچھی اچھی باتیں

خیر (نیکی) کے کاموں پر خرچ کرنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے، اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔''

(سبا۔39)

اور فرمایا ''اور جو کچھ تم خرچ کرو گے تو اس کا فائدہ تمہیں ہی ہوگا اور تم جو بھی خرچ کرتے ہو، اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے کرتے ہو اور تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

(البقرہ272)

نیز فرمایا ''جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو، یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔''

(البقرہ273)

فائدہ...... ان آیات میں خرچ کرنے سے مراد نیکی اور اللہ کی پسندیدہ راہوں میں خرچ کرنا ہے۔ اس کی بابت ایک بات تو یہ کہی گئی ہے کہ تمہارا خرچ کیا ہوا ضائع نہیں جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کا بہترین بدلہ (دنیا یا آخرت یا دونوں جگہ) عطا فرمائے گا' تاہم یہ خرچ ریاکاری اور شہرت کی غرض سے نہ ہو کیونکہ اس صورت میں ثواب کے بجائے عذاب اور رضائے الٰہی کے بجائے اس کا غضب حصے میں آئے گا۔ اس لیے یہ خرچ صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ تمہاری خرچ کی ہوئی ایک ایک پائی کا علم اللہ کو ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کا پورا بدلہ عطا فرمائے گا۔

رشک

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''صرف دو آدمیوں پر رشک کرنا جائز ہے۔ ایک وہ آدمی جسے اللہ نے مال دیا اور پھر اسے حق کی راہ میں خرچ کی ہمت و توفیق بھی دی۔ اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے علم و حکمت سے نوازا، چنانچہ وہ اس کے ساتھ فیصلہ کرتا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔''

(بخاری و مسلم)

اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی پر رشک نہ کیا جائے سوائے ان ہر دو خصلتوں میں سے کسی ایک پر، یعنی ان پر رشک کرنا درست ہے۔

فوائد و مسائل

1۔ حسد نہایت مہلک اخلاقی بیماری ہے جو انسان کا امن و سکون برباد کر دیتی ہے۔ حسد کے معنی ہیں، کسی پر اللہ کا انعام دیکھ کر کڑھنا اور اس کے زوال کی آرزو کرنا۔ یہ حرام ہے اور اس سے انسان کی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔

2۔ ایک اور چیز غبطہ ہے جسے اردو میں رشک کرنا کہتے ہیں۔ یہ جائز ہے اور اس کا مطلب ہے کسی پر اللہ کا انعام دیکھ کر خوش ہونا اور یہ آرزو کرنا کہ اللہ اسے بھی یہ نعمت عطا فرمائے۔ اس حدیث میں غبطہ کو بھی حسد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ حسد الغبطہ ہے، مطلق حسد نہیں کیونکہ وہ تو جائز ہی نہیں ہے۔

3۔ بہر حال اس حدیث سے ایسے مال دار کی فضیلت واضح ہے جو اللہ کے دیے ہوئے مال کو صرف اپنی ذات ہی پر خرچ نہیں کرتا بلکہ اسے غربا و مساکین اور دین کی نشر و اشاعت پر خرچ کرتا ہے۔ اسی طرح دین کا علم حاصل کرنے والے کی فضیلت کا بیان ہے جو قرآن و حدیث کی روشنی میں لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو بھی قرآن و حدیث کی تعلیم دیتا ہے۔ ہر شخص کو یہ آرزو کرنا چاہیے کہ مال کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کا وافر جذبہ بھی اسے ملے اور دینی علوم اور اس کی حکمت سے وہ بہرہ ور ہو تاکہ انبیاء کی جانشینی کا شرف اسے حاصل ہو اور اس کا حق اچھی طرح ادا کر سکے۔

وارث کا مال

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تم میں سے کون ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟''

صحابہ نے کہا ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے ہر شخص کو اپنا مال ہی سب سے زیادہ محبوب ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''انسان کا مال تو وہی ہے جو اس نے (صدقہ و خیرات کر کے) آگے بھیجا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو وہ پیچھے چھوڑ گیا۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل

(1) اس میں بڑے حکیمانہ انداز سے انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت کو اجاگر اور ذہن نشین کیا گیا ہے کہ انسان کا اصل مال تو وہی ہے جو وہ مال کی محبت کو نظر انداز کر کے اللہ کے حکم کے مطابق اللہ کی راہ میں اور اس کی پسندیدہ جگہوں پر خرچ کرے گا کیونکہ روز قیامت یہی مال اس کے کام آئے گا۔ اس کے علاوہ تو اس نے کھا پہن کر ختم کر دیا اور اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ جو اس کے ورثا کے کام آ گیا۔

(2) اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ انسان کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہو تو اسے اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا چاہیے۔

تھوڑا سا خرچ

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تم آگ سے بچو، اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ساتھ ہی۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسب استطاعت اللہ کی راہ میں تھوڑا سا خرچ کر کے بھی اللہ کی رضا حاصل کی جا سکتی ہے۔

انکار کرنا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

''ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کا سوال کیا گیا ہو اور آپؐ نے جواب میں فرمایا ہو۔ ''نہیں۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ۔

اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق، کرامت نفس اور سخاوت کا بیان ہے کہ سائل کے سوال پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کبھی ''نہیں'' کا لفظ نہیں نکلا، بشرطیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ چیز موجود ہوتی، بلکہ بعض دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرض لے کر بھی سائل کی حاجت پوری فرما دیتے، یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو اس سے وعدہ فرما لیتے۔

دو فرشتے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ہر دن جس میں بندے صبح کرتے ہیں دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے ”اے اللہ! خرچ کرنے والے کو (بہترین) بدلہ عطا فرما۔“ دوسرا کہتا ہے۔ ”اے اللہ! روک کر رکھنے والے کے حصے میں ہلاکت کر۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

(1) جس خرچ پر دعائے خیر کی نوید ہے اس سے مراد صدقات نافلہ و واجبہ کے علاوہ اہل و عیال اور مہمانوں وغیرہ پر خرچ کرنا ہے اور جس امساک (ہاتھ روک رکھنے) پر بددعا ہے وہ زکاۃ، صدقات اور مستحبات پر خرچ کرنا ہے۔ ہلاکت سے مراد مال کی ہلاکت یا بخیل کی اپنی ہلاکت بھی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

(2) فرشتے اللہ تعالیٰ کی پاک مخلوق ہیں جو کسی صورت بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ ایسے فرمانبرداروں کی دعائیں ضرور قبول فرماتا ہے، اس لیے فرشتوں کی دعائیں ضرور لینی چاہئیں۔ جو بغیر کسی مفاد کے خلوص کے ساتھ دعا کرتے ہیں۔

خرچ کر

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”اے آدم کے بیٹے تو خرچ کر، تجھ پر بھی خرچ کیا جائے گا۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے پر خرچ کیا جائے گا، کا مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے فراخی اور بہترین بدلہ عطا فرمائے گا۔

بہترین خصلت

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

”کون سا اسلام بہتر ہے؟“ (یعنی اس کی کون سی خصلت یا کون سی خصلت والا شخص بہتر ہے؟)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم کھانا کھلاؤ، لوگوں کو سلام کرو، چاہے تم پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل

(1) کھانا کھلانے میں کسی کو صدقے یا ہدیے کے طور پر یا مہمان نوازی کے طور پر کھلانا شامل ہے علاوہ ازیں اس سے مراد ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کر دینا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بھوکا ہے تو اسے کھانا کھلایا جائے۔ کپڑے نہیں ہیں تو اسے لباس پہنایا جائے۔ بیمار ہے تو علاج کروایا جائے۔ مقروض ہے تو اسے قرض کے بوجھ سے نجات دلائی جائے۔

(2) سلام کرنے سے مراد، کثرت سے سلام کا پھیلانا ہے۔ اس سے دلوں میں محبت پیدا ہوتی ہے اور نفرت و عداوت دور ہوتی ہے۔

چالیس خصلتیں

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا۔

”چالیس خصلتیں ہیں ان میں سب سے اعلا دودھ کے لیے بکری کا عطیہ دینا ہے جو شخص بھی ان خصلتوں میں سے کسی ایک خصلت پر، ثواب کی امید سے اور اس پر کیے گئے وعدے کی تصدیق کرتے ہوئے عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔“ (بخاری)

فائدہ۔ منیحہ اس جانور (بکری یا اونٹنی وغیرہ) کو کہتے ہیں جو صرف دودھ یا اون لینے کے لیے عطیے کے طور پر دیا جائے اور اس کے بعد اسے لوٹا دیا جائے۔ یہ بھی ایک احسان اور اچھی خصلت ہے۔ حدیث میں وارد شدہ چالیس خصلتوں کو بعض علماء نے اپنے اپنے طور پر شمار کیا ہے لیکن حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ اس میں ہر خیر کی خصلت آ جاتی ہے انہیں شمار کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جب خود رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے اسے مبہم رکھا ہے تو پھر دوسرا اسے کیوں کر متعین کر سکتا ہے؟ علاوہ ازیں اس ابہام میں شاید یہ حکمت ہو کہ کسی بھی نیکی کے کام کو حقیر نہ سمجھا جائے، چاہے وہ کتنا بھی تھوڑا اور معمولی ہو۔

سوال کرنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم سے اسلام (کے نام) پر (یعنی نو مسلم کی طرف سے) کسی چیز کا سوال کیا گیا تو آپ نے وہ ضرور دی۔

ایک آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے دو پہاڑوں کے درمیان جتنی بکریاں تھیں اسے دے دیں۔ وہ اپنی قوم کے پاس گیا اور جا کر کہا۔ ”اے میری قوم! اسلام قبول کر لو، اس کے لیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس شخص کی طرح عطا کرتے ہیں جسے فقر کا اندیشہ نہیں ہوتا، یقیناً ایک آدمی صرف دنیا حاصل کرنے کی غرض سے اسلام قبول کرتا لیکن تھوڑا ہی عرصہ گزرتا کہ اسلام اسے دنیا میں موجود تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہو جاتا۔ (مسلم)

فوائد و مسائل

(1) اس میں مولفۃ القلوب (نو مسلموں) کو تالیف قلب کے طور پر مال دینے کا جواز ہے تاکہ وہ اسلام پر پختہ ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ابتدا میں قبول اسلام میں حصول دنیا کا جذبہ شامل بھی ہوتا تو تھوڑے عرصے بعد یہ جذبہ دل سے نکل جاتا اور وہ نہایت مخلص مسلمان بن جاتا۔ اسی حکمت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے مولفۃ القلوب کو ایک مصرف زکوٰۃ بھی قرار دیا ہے۔ یعنی زکوٰۃ کی رقم بھی اس مد پر خرچ کی جا سکتی ہے۔

(2) بعض علماء کے نزدیک اس مد پر خرچ کرنا اب جائز نہیں ہے لیکن صحیح بات یہی ہے کہ اس مد پر قیامت تک زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا جائز ہے۔ آج بھی اس کی ضرورت ہے۔ اگر نو مسلموں کی تالیف قلب کا صحیح اہتمام ہو تو آج بھی اس کے فوائد ہم دیکھتے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں بھی اس مد پر خرچ کرنے کی کافی ضرورت ہے۔

صبر و حلم

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں ایک وقت وہ جنگ حنین سے واپسی پر رسول اللہ صلی وسلم کے ساتھ چلے آ رہے تھے کہ کچھ اعرابی (دیہاتی) آپ سے چمٹ کر سوال کرنے لگے یہاں تک کہ آپ کو مجبور کر کے کیکر کے درخت کے پاس لے گئے۔ پس آپ کی چادر بھی اس (درخت کے کانٹوں) نے اچک لی (یعنی اس میں پھنس کر آپ کے جسم سے اتر گئی۔) نبی صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر گئے اور فرمایا۔

”میری چادر تو مجھے دو۔ پس اگر میرے پاس ان خاردار درختوں کے برابر بھی اونٹ یا چوپائے ہوتے تو میں یقیناً انہیں تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا پھر تم مجھے بخیل پاتے نہ جھوٹا اور نہ بزدل۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل

(1) اس میں بھی تالیف قلب کے طور پر دینے کے مسئلے کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کا بیان ہے کہ کس طرح آپ صبر و حلم کے ساتھ دیہاتیوں کی سختی اور ان کی بدویت

کو برداشت فرماتے۔

(2) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام کے اندر بخل، دروغ گوئی اور بزدلی جیسی مذموم صفات نہیں ہوئی چاہئیں، نیز بوقت ضرورت اپنی صفات حمیدہ کا ذکر کرنا بھی جائز ہے تاکہ جاہل لوگ بدگمانی کا شکار نہ ہوں۔ ایسے موقع پر یہ وضاحت فخر وریا میں شامل نہیں ہوگی جو مذموم فعل ہے۔

صدقہ کی برکت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”صدقے نے کبھی مال نہیں گھٹایا اور عفو ودرگزر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت میں اضافہ ہی فرماتا ہے۔ اور جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اسے ضرور اونچا کرتا ہے۔“ (مسلم)

فائدہ۔ اس میں تین حقیقتوں کا بیان ہے۔

(ا) صدقے سے مال کم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بقیہ مال میں برکت عطا کرکے اس کی تلافی فرمادیتا ہے یا بعض دفعہ اس کا معاوضہ عطا کردیتا ہے۔ علاوہ ازیں آخرت میں اس پر جو اجر وثواب ملے گا، اس سے تو یقیناً اس کے مالی نقصان کی تلافی ہوجائے گی۔

(ب) انسان سمجھتا ہے کہ میں عفو ودرگزر سے کام لوں گا تو لوگ مجھے کمزور خیال کریں گے، اس میں میری سبکی اور توہین ہے لیکن اس حدیث میں اس کے برعکس یہ حقیقت بیان کی جارہی ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ عزت میں اضافہ ہی فرماتا ہے، کمی نہیں کرتا کیونکہ معاف کرنے سے لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام بڑھ جاتا ہے۔ یا اس عفو ودرگزر پر آخرت میں اسے اجر وثواب ملے گا۔ اس سے اس کے مقام ومنزلت میں اور زیادہ اضافہ ہوجائے گا۔

(ج) اس طرح تواضع اور فروتنی کرنے والوں کی عظمت ورفعت بھی اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے یا پھر آخرت میں انہیں بلند مرتبوں سے نوازے گا۔

صدقہ

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک بکری ذبح کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔

”اس کا کتنا حصہ باقی ہے؟“

انہوں نے کہا۔ ”صرف ایک دستی باقی ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

”سب ہی باقی ہے۔ سوائے ایک دستی کے۔“

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔)

اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے دستی کے علاوہ سب صدقہ کردیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”صدقہ شدہ سارا حصہ ہمارے لیے باقی رہا کیونکہ آخرت میں اس کا اجر ملے گا۔“ (اور دستی باقی نہیں رہی کیونکہ اسے خود کھایا جس پر آخرت میں اجر نہیں ملے گا۔)

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو خود ہی سب کچھ نہیں کھانا چاہیے بلکہ صدقہ وخیرات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا چاہیے تاکہ یہ چیز آخرت میں اس کے کام آئے۔

اسراف اور تکبر نہ ہو

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”کھاؤ، پیو، صدقہ کرو اور پہنو، جب تک اس میں فضول خرچی یا تکبر کی آمیزش نہ ہو۔“

* * *

دستک دستک دستک

شاہین رشید

کبریٰ خان

”کیا حال ہیں آپ کے؟“

”الحمدللہ۔“

”کہاں غائب ہیں...... اسکرین پہ نظر نہیں آ رہیں؟“

”کہیں نہیں...... سب کام چل رہے ہیں۔ ماڈلنگ بھی، کمرشلز بھی میگزین شوٹس بھی اور آج کل لان کا سیزن ہے تو لان کے کمرشلز اور میگزین ماڈلنگ میں مصروف ہوں۔“

”اچھا!...... گڈ، مگر ڈرامے سے غائب ہیں؟“

”نہیں غائب نہیں ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب گیپ آتا ہے تو لمبا ہی آجاتا ہے اور جب ڈرامے چلتے ہیں تو لگاتار ہی چلتے ہیں تب ہوتا یہ ہے کہ جب نظر نہ آؤ تو لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی بک نہیں کرتا اور جب نظر آؤ تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ڈائریکٹر کو کوئی اور نظر نہیں آتا...... تو یہ ہے کہانی نظر آنے اور نہ آنے کی۔“

”مطلب یہ کہ ڈراموں کی ریکارڈنگ چل رہی ہے اور آپ کا اسکرین سے ناتا ٹوٹا نہیں؟“

”جی بالکل...... اور آپ یقین کریں کہ میں ان دنوں اتنی زیادہ مصروف ہوں کہ ملکی اور غیر ملکی فلموں کے لیے بھی پراپر ٹائم نہیں نکال پارہی مگر...... میں اچھے پروجیکٹ ضرور لیتی ہوں...... کیونکہ اچھا کام کروں گی تو مزید آفرز آئیں گی۔“

”فلموں میں بھی آپ کام کررہی ہیں۔ کیا پھر ڈراموں کو چھوڑ دیں گی یا کم کردیں گی؟“

”فلموں سے زیادہ ڈراموں میں کام کرنے کا مزا ہے، اور اسی لیے میں ڈراموں میں زیادہ کام کرتی ہوں۔“

”کیریئر کی ابتدا کس کام سے کی، ماڈلنگ، فلم یا پھر ڈراما سے؟“

”ابتدا تو ماڈلنگ سے کی، مختلف لوگوں کی گانوں کی ویڈیوز میں کام کیا اور ویڈیوز کو دیکھ کر مجھے ڈراموں میں کام کرنے کی آفر آئی اور فلم میں کام کرنے کی آفر آئی...... چنانچہ پہلے فلم میں کام کیا اور پھر ڈراموں میں۔“

”اپنی فلموں اور ڈراموں کے بارے میں بتائیں؟“

”فلموں میں تو ”نامعلوم افراد“۔ ”جوانی پھر نہیں آنی 2“ اور ”پرواز ہے جنوں“ اور ایک بالی ووڈ فلم میں بھی کام کیا ویلکم ٹو کراچی...... ایک انگریزی فلم The conversation میں بھی کام کرچکی ہوں...... اور ڈراموں میں ”سنگ مرمر“۔ ”الف اللہ اور انسان“ ”مقابل“ یہ میرے بہت مقبول ڈرامے ہیں اور انڈر پروڈکشن کام بھی چل رہا ہے۔“

”فلمی ہیروئنوں کے لیے ڈانس کرنا بھی بہت ضروری ہوتا ہے...... آپ نے سیکھا؟“

”ہیروئین مکمل ہی نہیں ہوتی جب تک وہ ڈانس نہ کرے اور میں نے باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے اور کررہی ہوں...... اور ظاہر ہے کہ اب یہ میرا پروفیشن ہے تو مجھے وہ سب کچھ سیکھنا ہے جو اس انڈسٹری کی ڈیمانڈ ہے۔“

”بالکل...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ورسٹائل کہلانے کے لیے محنت تو بہت ضروری ہے...... ویسے اس انڈسٹری میں محنت زیادہ ضروری ہے یا شکل و

صورت کا اچھا ہونا بہت ضروری ہے؟"

"دیکھیں......شوبز میں اچھی شکل وصورت کا ہونا تو بہت ضروری ہے۔ کیونکہ آپ کو بک ہی آپ کی شکل دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ بعد میں آپ کے ٹیلنٹ کو دیکھا جاتا ہے اور پھر اگر آپ میں ٹیلنٹ ہے تو آپ اپنی جگہ آسانی سے بنالیتی ہیں۔ لیکن اگر ٹیلنٹ نہیں ہے اور شکل بھی اچھی ہے تو آپ زیادہ دیر تک اس انڈسٹری میں چل نہیں سکتیں...... کیونکہ اس فیلڈ میں ٹیلنٹ کا ہونا بہت ضروری ہے اور آگے بڑھنے کا اور محنت کا جذبہ بھی بہت ضروری ہے۔"

"کس قسم کے کردار آپ کی ڈیمانڈ ہیں؟"

"ہر اچھا اور چیلنجنگ رول میری ڈیمانڈ ہے...... یہ نہیں کہ اگر میں ہٹ جا رہی ہوں تو ہر رول قبول کرلوں...... کیوں؟...... اب میں اپنے معیار کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں...... ہر وہ کردار کرنا چاہتی ہوں، جس میں کچھ سیکھنے کو اور کچھ پرفارم کرنے کو ملے......"

"آپ سمجھتی ہیں کہ آپ کو وہ مقام مل گیا ہے جس کے لیے لوگ برسوں محنت کرتے ہیں؟"

"مجھے ابھی بہت آگے جانا ہے اور بہت محنت بھی کرنی ہے اور ہاں میں سمجھتی ہوں کہ اللہ نے مجھے وہ مقام دے دیا ہے جس کے لیے لوگ بہت سالوں تک محنت کرتے ہیں اور تب کہیں ان کی پہچان بنتی ہے۔"

"آپ کی مقبولیت یا کامیابی میں اچھے پروجیکٹ کا بھی عمل دخل ہے یا صرف آپ کی محنت کا کمال ہے؟ یا ڈائریکٹر کا بھی کوئی رول ہے؟"

"دونوں کا...... مجھے اچھے پروجیکٹ ملے اور ان پہ میں نے بہت محنت کی اور اللہ نے مجھے کامیابی دی...... ہم اپنے رول کو کس طرح اچھا بنا سکتے ہیں اس میں ہماری محنت کا بھی دخل ہے اور ڈائریکٹر کی محنت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی ہدایات پر ہم سب چلتے ہیں کسی بھی چیز کی کامیابی کے لیے ٹیم ورک بہت ضروری ہے اور ٹیم ورک اسی وقت ہوتا ہے جب آپ کا پروڈیوسر اور ڈائریکٹر اچھا ہو۔"

"دیکھا گیا ہے کہ سلور اسکرین پہ کامیابی کے بعد فنکار ٹی وی ڈراموں سے دور ہوتے جا رہے ہیں؟"

"وہ ہی دور ہو رہے ہیں جو صرف فلموں میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ جنہیں دونوں جگہ کام کرنا ہے وہ کر رہے ہیں...... جیسے کہ میں ہوں۔ مجھے دونوں جگہ کام کرنا پسند ہے۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتاؤ؟"

"سب کو معلوم ہے کہ میں 14 جون 1993ء میں کراچی میں پیدا ہوئی اور میری پرورش برطانیہ میں ہوئی اور یہ کہ میرا اصلی نام رابعہ خان ہے اور میری تعلیم بھی برطانیہ میں ہی مکمل ہوئی۔"

☆☆☆

محمد جنید:......نیوز اینکر

"کیا حال ہیں آپ کے؟"

"الحمدللہ......ٹھیک ٹھاک۔"

"کیا مصروفیات ہیں؟"

"کچھ خاص نہیں۔ آفس اور آفس سے گھر۔"

"کام بہت آسان نہیں...... آفس آئے خبریں پڑھیں مطلب تین چار بلیٹن پڑھے اور پھر گھر......؟"

"جی نہیں...... اتنا آسان نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ خبریں پڑھنے سے دو تین گھنٹے پہلے لازمی آپ کو اسٹوڈیو پہنچنا ہوتا ہے۔ تمام معاملات کو، خبروں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ میٹنگ ہوتی ہے، پھر تیار ہونا پڑتا ہے کیونکہ کیمرے کے تقاضوں کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ پھر کہیں جا کر کیمرے کے سامنے آتے ہیں اور خبریں پڑھتے ہیں۔ یا کسی پروگرام کی میزبانی کرتے ہیں۔"

"اتنا کچھ کرنے کے بعد اور تمام مراحل سے گزرنے کے بعد جب نیوز چیئر پہ بیٹھتے ہیں تو کبھی کوئی غلطی یا حماقت ہوئی؟"

"کئی بار ہو جاتی ہے۔ آخر زبان ہی تو ہے...... اب جیسا کہ سب کو پتا ہے "میجر" چھوٹا رینک ہوتا ہے، اور "میجر جنرل" بڑا رینک ہوتا ہے۔ تو میں نے ڈی جی آئی ایس پی آر کو میجر جنرل کہنے کے بجائے صرف "میجر" کہہ دیا۔ کہنے کو تو کہہ دیا مگر بعد میں اچھی خاصی کلاس لگ گئی۔"

"خیر ہے۔ ایسی غلطیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں...... ویسے اس میں شک نہیں کہ آپ بہت اچھے اینکر ہیں...... ساتھی خواتین اینکرز میں کس کے ساتھ ایزی رہتے ہیں؟"

"سب بہت اچھی ہیں۔ سب کے ساتھ ایزی ہوتا ہوں۔ کوئی مسئلہ نہیں اور نام کسی کا نہیں لوں گا۔ کیونکہ سب میرے لیے محترم ہیں۔"

"ساتھی خواتین تو بہت اچھی ہیں۔ پر آپ مزاج کے کیسے ہیں۔ نرم یا گرم؟"

"نرم نہیں...... تھوڑا گرم ہوں۔ غصہ جلدی آجاتا ہے۔ مگر نقصان کسی کو نہیں پہنچاتا...... نہ ہی کسی کا دل دکھاتا ہوں۔"

"اس جاب سے گھر چلایا جاسکتا ہے؟"

"جی...... بالکل چلایا جاسکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پرنٹ میڈیا میں ابھی تک معاوضے بہت اچھے نہیں ہوئے...... مگر الیکٹرانک میڈیا میں معاوضہ اچھا ہے...... بلکہ بہت اچھا ہے۔"

"فیوچر میں کیا کرنا ہے؟"

"فیوچر میں اسی فیلڈ میں رہنا ہے اور اپنے آپ کو ایک بہت ہی اچھا اینکر ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بہت اچھا جرنلسٹ بننا چاہتا ہوں اور بہت ہی اعلا مقام حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ بس اللہ مجھے کامیاب کرے۔ آمین۔"

"اور ہم بھی آپ کے لیے "آمین" کہیں گے۔"

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
بساطِ دل
افشاں آفریدی
بھی چھپ گئی ہے
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ز۔ شس

جب سے یہ سلسلہ شروع کیا ہے آپ نے، میں تب سے قلم پکڑے بیٹھی ہوں اور آخر کار آج لکھ ہی ڈالا اس لیے کہ یہ سلسلہ مجھے بے حد پسند ہے۔

س: ”شادی کب ہوئی؟“

ج: ”میری شادی جنوری 1999ء میں ہوئی۔“

س: ”شادی سے پہلے کے مشاغل اور دلچسپیاں؟“

ج: ”شادی سے پہلے تو سونا میرا بہترین مشغلہ تھا اس کے علاوہ پڑھنا، کام کاج اور ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنا۔ اور آپ یقین کریں کہ ڈائجسٹ میں نے توڑوں کے توڑے ختم کیے ہیں لیکن پھر بھی دل نہیں بھرتا اور سب سے زیادہ دلچسپی شعاع میں تھی۔“

س: ”رشتے میں مرضی شامل تھی؟“

ج: ”مرضی تو شامل ہی تھی لیکن پسند امی نے کیا تھا، چونکہ میرا تعلق ایک دینی گھرانے سے تھا تو ابو نے سب باجیوں کی شادیاں مولوی ٹائپ بندوں سے کیں۔ میرے لیے بھی پہلے پہل ابو مولوی اور بڑی بڑی عمر کے رشتے دیکھ رہے تھے اور کئی تو پسند بھی کر گئے۔ لیکن میرا ذہن سب بہنوں سے الگ تھا اور امی کو میری پسند کا علم تھا۔ اس لیے سب کو انکار کر دیا اور میری پسند کے مطابق کر دیا۔ میں نے تو خیر کچھ نہ کہا تھا کہ امی تو میری پسند جانتی تھیں۔ اور ویسے بھی جو قسمت میں ہو وہی ملتا ہے۔ سب بہنوں کے شوہر ٹوپی اور شلوار قمیص پہنتے ہیں اور میرے جناب پینٹ شرٹ اب آپ خود ہی اندازہ کر لیں میری بہنوں کے ویسے ہی ہیں دینی لیکن میں دنیاداری میں آ گئی ہوں۔“

س: ”منگنی کتنا عرصہ رہی؟“

ج: ”چونکہ میرے گھر کا ماحول دینی تھا تو ابو خود بھی مولوی تھے تو وہ ایسی رسموں کو ناپسند کرتے تھے اسی لیے میرا سیدھا سیدھا نکاح کر دیا۔ آمنے سامنے بٹھا کر اور فون پر تو بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلامی طریقے کے مطابق دیکھا تھا بس ایک دوسرے کو تو بس بہت ہو گیا (میرے ابو کے نزدیک) اور رخصتی چھ ماہ بعد تھی۔“

س: ”شادی سے پہلے سسرال والوں کے متعلق کیا تصور تھا؟“

ج: ”سسرال والوں کے بارے میں خیالات تو جس طرح ہر لڑکی کے ہوتے ہیں میرے بھی ایسے تھے کہ اچھے ہوں پیار کرنے والے پیار و محبت سے رہنے والے لیکن یہ پیار و محبت تو بس زیادہ سے زیادہ دو سے تین ماہ ہی رہا اس کے بعد تو کہاں کا پیار اور کیسی محبت۔ شادی سے پہلے تو ہر ساس اپنی ہونے والی بہو کو پیار کرتی ہے تعریف کرتی ہے۔ تحفے تحائف اور پتا نہیں کیا کیا لیکن شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی تُو کون اور میں کون والا حساب اور حالات ہو جاتے ہیں۔“

س: ”شادی کے لیے کن کن چیزوں کی قربانی دینا پڑی۔“

ج: ”شادی سے پہلے میں امی کے ساتھ مل کر جامعہ میں پڑھاتی تھی اپنا جامعہ چلاتی تھی۔ لیکن شادی کے بعد اس کی قربانی دینی پڑی۔ میں تقریریں وغیرہ بھی کرتی تھی۔ میری ساس بھی بڑی شوقین درس وغیرہ سننے کی درس اٹینڈ کرتی اور آپ اتفاق دیکھیں جس درس میں میری تقریر رکھی ہوئی تھی انتظامیہ نے وہاں میری ساس بھی آئی اور وہیں میری تقریر سن کر عاشق ہو گئی اور اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا اور تب تک جان نہ چھوڑی جب تک شادی نہ ہو گئی۔ شادی سے پہلے ساس سسر کہتے تھے کہ ہم آپ کی بیٹی کو جامعہ بنا دیں گے لیکن بعد میں ان کو پتا ہی نہیں تھا کہ جامعہ بھی ہوتا ہے۔

اور دوسری ڈائجسٹ کی میں گھر میں شادی کے بعد سسرال میں اپنا پہلے والا گھر سمجھ کر ڈائجسٹ لے کر بیٹھی (مجھے کیا پتا تھا کہ یہ لوگ اچھا نہیں سمجھتے) میں اپنے ڈائجسٹ میں اتنی مگن کہ میری ساس آ کر سر پر کھڑی ہو گئی اور مجھے پتا تب لگا جب اس نے رسالہ میرے ہاتھ سے چھین کر پرے پھینکا میں ہکا بکا رہ گئی۔

س: ”شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران بدمزگی ہوئی؟“

ج: ”شادی خیریت سے انجام پائی......؟ بھئی جہاں دو خاندان ایک جیسا غصہ رکھنے والے اکٹھے ہو جائیں، وہاں کوئی کام خیریت سے ہو سکتا ہے نہیں نا؟ تو پھر نہ ہی سنیں تو بہتر ہے۔ اور شادی ایک بھی نہیں تین تھیں۔ میرے ساتھ دو بھائیوں کی بھی شادی تھی۔ شادی سے ایک دن پہلے، ابو اور بھائی میں جھگڑا ہو گیا۔ اور بس پھر ابو گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ بہت تلاش کیا سب نے مگر نہیں پتا لگا۔ ابو غصے کے جتنے تیز ہیں اتنے ہی دل کے نرم ہیں۔ پھر اگلے دن ہم دونوں بھائیوں کی باراتیں لے کر چلے گئے ظاہر اب شادی تو کینسل نہیں کی جا سکتی تھی ناں! ابو نے نہ آنا تھا اور نہ ہی آئے۔ لیکن پھر میری بارات کا مسئلہ تھا۔ وہاں تو چلو بہانا کر دیا تھا۔ میری بارات آنے والی تھی لیکن ابو کا کہیں پتا نہ تھا۔

پارلر والی نے تیار کرنے آنا تھا۔ وہ بھی لیٹ تھی۔ پھر جیسے تیسے کر کے امی کی شاگردہ کو لگایا تو اس نے دو گھنٹے لگا کر میک اپ کیا۔ پھر کہنے لگی ”منہ دھو کر آؤ۔“ میں پھر منہ دھو کر آ گئی یہ تو شکر ہوا کہ پارلر والی

آ گئی۔ ورنہ اس نے تو میرا منہ ہی چھیل دیا تھا پارلر والی آئی اور بارات بھی آ گئی اب میری ساس اور نندیں کہیں ذکیہ کو ہم نے تیار کرنا ہے۔ امی نے کہا نہیں ہم خود ہی کر لیں گے۔

اتنی بات تھی کہ میری ساس نے رونا شروع کر دیا کہ "ہائے میری شریکے کے سامنے بے عزتی ہو گئی۔"

سب پہلے ہی پریشان تھے کہ ابو کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ساس کے رونے دھونے سے مزید پریشان ہو گئے۔ پھر امی نے انہیں پیار سے سمجھایا تو بات سنبھلی۔

اتنا شکر ہوا کہ ابو میری رخصتی کے وقت آ گئے کہنے لگے میں اپنی بیٹی کو رخصت کرنے آیا ہوں۔

تاہم سب مطمئن تھے کہ ایک نیا جھگڑا شروع ہو گیا۔ ابو کہنے لگے کہ میں نے نکاح نامے میں یہ شرط رکھی ہے کہ لڑکا مونچھیں کٹوا کر آئے تو اس نے مونچھیں نہیں کٹوائیں۔ ابو نے ان سے کہا۔ کہ "میں اپنی بیٹی کو رخصت نہیں کروں گا۔ اسے آپ کے گھر چھوڑ جاؤں گا اس وقت آپ بارات واپس لے جاؤ۔"

میرے بھائیوں نے سمجھ داری سے کام لیا۔ میرے شوہر کو نرمی اور پیار سے سمجھایا اور اس کو ساتھ لے جا کر مونچھیں وغیرہ کٹوائیں تو کہیں رخصتی ہوئی۔

اور جس دن میرا ولیمہ تھا۔ اس دن بھائیوں کے مکلاوے تھے۔ ابو نے کہا "اپنی بیویوں کو جہاں مرضی لے جاؤ لیکن یہاں نہ آنا۔"

اصل میں ہمارے گھر میں بہت سے جنات رہتے تھے دم کروانے سے پتا چلا کہ ان کا ہمارے گھر پر ڈیرا ہے کیونکہ مکان کافی عرصہ خالی رہا تھا۔ ابو کی جنات سے لڑائی رہتی تھی وہ اکثر بہت شرارتیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ ہمارے گھر میں آگ بھی لگا دی تھی ہمیں اللہ نے بچا لیا۔ ابو کی ضد سے بھائی پریشان ہو گئے پھر چھوٹے بھائی نے ابو کو منانے کے لیے ایک گیم کھیلی اس نے کھانے کی ایک دیگ باتھ روم میں رکھ دی۔ ہمارے ڈبل باتھ روم تھے اکٹھے تو وہ کنڈی لگا کر دوسرے باتھ روم سے باہر آ گیا۔ اب سب باتھ روم کے آگے کھڑے ہیں اور دروازہ بجا رہے ہیں۔ اتنی دیر میں ابو اٹھ کر آ گئے کہنے لگے کیا ہوا؟"

بھائی بولا" اندر پتا نہیں کون ہے نہ کوئی بول رہا ہے نہ دروازہ کھول رہا ہے۔"

ابو نے کہا" دوسرے باتھ روم سے جا کر دیکھو چھوٹا بھائی اندر گیا اور کنڈی کھول دی اور باہر آ کر کہنے لگا۔

"ابو اندر کھانے کی دیگ رکھی ہے۔ یہ ضرور جنوں کی شرارت ہے۔"

ابو شروع ہو گئے اور جنوں کو برا بھلا کہنے لگے پھر بولے۔

"مجھے لگتا ہے جنوں نے ہی ہماری لڑائی بھی کروائی ہے۔ اب دیکھنا میں خود جا کر اپنی بہوؤں کو لاؤں گا۔"

بس اتنی سی گیم تھی اور ابو مان گئے۔ ولیمے پر میرے سب گھر والے آئے۔ مجھے مکلاوے کے لیے ان کے ساتھ جانا تھا۔ سب بہت خوش بھی تھے۔ لیکن یہاں آ کر سب کی خوشی ختم ہو گئی کیونکہ جناب میرے سسرالیوں نے ولیمے میں کھانا ہی نہیں رکھا تھا کیونکہ حکومت کی طرف سے تقریبات میں کھانا کھلانے پر پابندی تھی۔ لیکن ہم نے پابندی کے باوجود بارات میں کھانا رکھا تھا۔ اور یہاں سسرال والوں نے صرف چائے اور مٹھائی پر ٹرخا دیا۔ سب منہ لٹکا کر واپس آ گئے۔

س: "شادی کے بعد شوہر نے آپ کو پہلی بار دیکھا تو کیا کہا؟"

"شوہر نے پہلے تو کچھ نہیں کہا کیونکہ وہ بہت شرمیلے تھے بعد میں کہا۔" جب میں نے تمہیں دیکھا تو خوش ہو گیا کہ میری بیوی اتنی خوب صورت ہے۔"

س: "شادی کے بعد آپ کی زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟"

ج: "شادی کے بعد زندگی میں تبدیلیاں نہیں آتیں بلکہ زندگی ہی تبدیل ہو جاتی ہے اور میری زندگی بھی تبدیل ہوئی اور خود مجھ میں بھی بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ سب سے بڑی یہ کہ میں بہت آہستہ بولتی تھی کہ پاس بیٹھے ہوئے کو بمشکل سنائی دیتا۔ میرے سسرال والے کہتے اگر تم اونچا بولو گی تب ہی ہم تمہاری بات سنیں گے۔" انہوں نے کہہ کہہ کر میری آواز کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ اب خود ہی کہتے ہیں کہ آہستہ بولو۔" (خاص کر میرے شوہر)

س: "شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟"

ج: شادی کے ایک ماہ بعد ہی کام سنبھالا تھا اور سب سے پہلے مٹر والے چاول بنائے تھے جو سب کو بے حد پسند آئے۔

س: "میکے اور سسرال کے کھانوں میں کوئی فرق محسوس ہوا؟"

ج: ہمارے ہاں سبزیاں وغیرہ بھنی ہوئی پکتی تھیں اور یہ لوگ سبزیاں شوربے والی پکاتے تھے میں میکے میں جب دل چاہے چاول پکاتی تھی تقریباً روزانہ ہی چاول پکتے تھے لیکن یہاں اتنی کھلی چھوٹ نہیں تھی۔ میرے ابو کشمیری تھے ہمارے گھر جو روٹی پکتی تھی اتنی بڑی ہوتی کہ چار لوگوں کا پیٹ بھر جائے اسی لیے میں بھی بڑی بڑی روٹیاں پکانے کی عادی تھی لیکن سسرال میں اس کے برعکس چھوٹی اور باریک روٹیاں پکتی تھیں۔

س: "سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی؟"

ج: "تعریف یہ کہ کھانا بہت اچھا پکاتی ہو اور چائے بھی بہت مزے دار ہوتی ہے تمہارے ہاتھ کی۔ میں نے پہلی دفعہ جب سسرال میں بھنڈیاں پکائیں تو میرے شوہر اور دیور شاہد نے بہت زیادہ کھانا کھایا اور بہت خوش ہوئے میں نے پوچھا کیسی بنی ہیں تو کہنے لگے کہ پہلی دفعہ ایسی کھائی ہیں نہیں تو امی شوربے والی پکاتی تھیں تو ہم کھاتے ہی نہ تھے۔ لیکن آج بہت مزہ آیا ہے۔"

س: "شادی سے پہلے شوہر کے لیے کیا تصور تھا؟"

ج: "جس طرح ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے میرا بھی تھا عام لڑکیوں جیسا کہ شوہر خوب صورت ہو بزنس مین ہو پڑھا لکھا امیر کبیر و اچھی عادتوں والا وغیرہ۔"

س: "جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ رہنا؟"

ج: "کیا بتاؤں آپ کو مجھے تو جوائنٹ فیملی سسٹم اتنا پسند ہے۔ جو اگر سب رہنے والوں میں برداشت کا مادہ ہو چھوٹی چھوٹی باتوں کو نوٹ نہ کریں بلکہ اگنور کریں۔ دل بڑا ہو۔ حوصلہ اور پیار و محبت ہو تو ــ گھر جنت بن جائے ــ جہاں ہر طرف ہنسی خوشی مذاق قہقہے ہوں اور غمیاں خوشیاں و پریشانیاں دکھ سب مل کر گزاریں۔ تو بہت اچھا لگتا ہے اکٹھے رہنا لیکن جہاں پر چھوٹی سے چھوٹی بات کو نوٹ کیا جائے۔ لڑائیاں جھگڑے ہوں تو پھر انسان کو ذہنی سکون میسر نہیں ہوتا تو اچھا نہیں کہ الگ ہی رہیں۔ چلو سکون تو ہے۔

س: "نئی شادی شدہ بہنوں کے لیے پیغام؟"

س: میں نئی شادی شدہ لڑکیوں کو یہ ہی کہوں گی کہ سسرال چاہے جیسا بھی ہو لیکن آپ خود کو ٹھیک کریں۔ اپنا ظرف بڑا کر لیں۔ صبر اور برداشت سے کام لیں کیونکہ فائدہ اس میں آپ کا ہی ہے۔ کیونکہ آپ اچھی ہیں تو سب اچھے ہیں۔ سسرال والے تو بہو کی چھوٹی سی غلطی بھی برداشت نہیں کرتے۔ تو بہتر ہے کہ آپ اپنا گھر خراب کرنے سے پہلے ہی اس غلطی کو سدھار لیں جو آپ نے کی اور صبر کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔"

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

دل ایک گلشن
رضیہ جمیل

قیمت -/300 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

رخسانہ جمیل

جواب آں غزل

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

اقراء ممتاز اور صائمہ مشتاق سرگودھا سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

معروف شیف فرح محمد سے ملاقات کی۔ شادی مبارک میں آنٹی کوثر خالد...... کیا زبردست شادی تھی۔ شعاع کے ساتھ ساتھ ماریہ نذیر اور حفصہ اسلم نیازی کو جانا۔ ماریہ نذیر جب بھی تمہارا خط یا کوئی چیز پڑھوں، مجھے اتنا تجسس ہوتا ہے کہ تمہارا گھر کدھر ہے۔ اس دفعہ شہرزاد کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ یار دل دار ہمیشہ کی طرح زبردست افسانہ تھا۔ من عرفہ نفسہ نگہت سیما جب بھی لکھتی ہیں۔ دوسری رائٹرز سے ہٹ کر لکھتی ہیں۔ طواف عشق دوسری اور آخری قسط کیا کمال کی تھی۔ سمیرا حمید اللہ آپ کے قلم کو اور ترقیاں نصیب فرمائے (آمین)۔ افسانہ "آئینہ ہوں میں" کیا کوئی بریرہ جیسا بھی سچا اور کھرا انسان ہوگا۔ کوئی شام، مصباح علی سید کا ناول سپرہٹ تھا۔ دادی پوتی کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہوئے۔ "چاند گلی کی اسیرائیں"، نفشا محسن علی کوئی ناول لکھے وہ ہٹ نہ ہو یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔

پیاری اقرا اور صائمہ آپ نے خط لکھا۔ بہت خوشی ہوئی آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

اقصیٰ طیب الرحمان نے گاؤں سوہن ضلع ہری پور سے لکھا ہے

خط اس بار ابا جان نے پوسٹ کروایا اور شعاع میں میرے نام کے ساتھ اپنا نام دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ آپی ہمارا گھرانہ مذہبی ہے۔ پڑھے لکھے ہیں سب لیکن سوچ بہت پرانی ہے یا شاید گاؤں میں رہنے کا اثر ہے۔ آپی ہمارے گاؤں میں کوئی اگر بیمار ہو جائے تو اسے ڈاکٹر کے پاس نہیں لے کر جاتے۔ گھر کے ہی دیسی ٹوٹکے آزمائے جاتے ہیں۔ میری زندگی کے 21 سال گزر چکے ہیں۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی مجھے بخار ہوا ہو یا کہیں درد ہوا ہو اللہ کا شکر ہے۔ لیکن جنوری سے میری آنکھوں میں مسئلہ ہوا ہے۔ شروع میں پانی آتا رہا۔ پھر سوجنا شروع ہو گئیں اور اب مارچ کا مہینہ آگیا ہے۔ روز ٹکور کرتے ہیں۔ مختلف قسم کے حکیمی قطرے بھی ڈال رہی ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہے۔ آنکھوں کے نیچے موٹے موٹے گولے بن چکے ہیں۔ لیکن کچھ ہو جائے ڈاکٹر کے پاس نہیں لے کر جانا۔ میرے ابا جان کہتے ہیں تمہاری قسمت میں لکھ دیا تھا خدا نے کہ تمہاری آنکھیں خراب ہوئی ہیں۔ اب تم صرف دعا کرو۔

پیاری اقصیٰ آپ فوری طور پر ڈاکٹر کو دکھائیں۔ آپ کی آنکھوں میں انفیکشن ہے جو بڑھ کر مسئلہ بن سکتا ہے۔ آنکھوں کے بارے میں غفلت ٹھیک نہیں۔ آپ اپنے ابا جان سے کہیں، بیماری اللہ نے قسمت میں لکھی ہے تو علاج اور دوا بھی قسمت میں لکھی ہے۔ بیماری چھوٹی ہو یا بڑی اللہ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے۔ شفا اللہ ہی دیتا ہے ہمیں اللہ پر بھروسا کر کے دوا ضرور کرنا چاہیے۔ آپ اپنے والد صاحب کو ہمارا خط پڑھا دیں۔

برش گند بلوچ، ماسہ دورشم بلوچ اور داوشش بلوچ نے ڈی خان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

افسانہ "یار دل دار" تو ہمارے سب گھر والوں کا پسندیدہ ہے چھوٹے بڑے سب شوق سے پڑھتے ہیں۔ سمیرا حمید کی طواف عشق بھی بہت پسند آئی۔ ہمیں فوزیہ ثمر بٹ سسٹرز کے تبصرے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اور بھی یہ پری وِش سسٹرز کہاں گم ہیں ان کی کمی محسوس ہو رہی ہے پلیز بندھن میں منیب بٹ اور ایمن خان کو لائیں اور بلال عباس خان کا تفصیلی انٹرویو لیں۔

پیاری بہنو! بہت اچھا کیا کہ آپ نے ہمیں دوبارہ خط لکھا اور اپنے نام بھی لکھے، زیادہ اچھا ہوتا کہ ان ناموں کے معنی بھی لکھ دیتیں۔ آپ کے بھائی کو مسکراہٹیں پسند ہیں اور آپ لوگوں کی ماما بھی ہمارے رسالے شوق سے پڑھتی ہیں۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ ہماری طرف سے اپنی ماما کو سلام کہیے گا۔

آپ کی فرمائشیں شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

زارا ڈوگر گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں۔ لکھا ہے

دسمبر کے شعاع میں کوثر خالد کا "شعاع کے ساتھ" پڑھا بہت اعلا۔ حمزہ آیا پڑھ کر۔ یار دل دار کمال سیریز بڑا اچھا لگتا ہے۔ دسمبر میں مجھے "مولسری کے پھول" بڑا پسند آیا تھا۔ جنوری کے ناول ناولٹ افسانے سارے ہی اعلا تھے۔

خواتین میں جو رائٹرز کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا ہے یہ چلتا رہنا چاہیے۔ شازیہ الطاف کے افسانے تھوڑے پھیکے سے ہوتے ہیں مگر اچھا لکھتی ہیں۔

رسالے کی جان سمیرا حمید یعنی "طواف عشق" ان کا تو نام ہی کافی ہوتا ہے۔ کیا بندی ہیں یہ، اللہ نے کیا دماغ کیا سوچ اور کیا ٹیلنٹ دیا ہے۔ میری امی نے اک عرصے بعد دوبارہ پڑھنے شروع کیے ہیں پرانی قاری ہیں۔ "تاریخ کے جھروکے" بہت زبردست جا رہا ہے۔ خط بڑے لاجواب ہوتے ہیں۔ ان کے جواب بھی۔

پیاری زارا! آپ کی حوصلہ افزائی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ اپنی امی کا بھی ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دیجیے گا۔

شازیہ عابد نے کراچی سے لکھا ہے

زندگی میں پہلی بار کراچی شہر سے نکلنے کا موقع ملا "اللہ رب العزت" نے اپنا مہمان بنایا عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ شعاع واحد رسالہ ہے جو میری زندگی کے ہر موڑ پر ساتھ ساتھ رہا۔ ماشاء اللہ سے میری چار عدد بیٹیاں ہیں۔ سب علم حاصل کر رہی ہیں۔ "پہلی شعاع" میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ سمیرا حمید کا "طواف عشق"، "ایک اللہ کے لیے تین اللہ والے لے جاؤ" اس جملے نے رُلا ڈالا۔ نیا ناول "شہر تمنا" بہت خوب صورت شروعات ہے۔ "تاریخ کے جھروکوں سے" دل خوش ہو گیا۔

پیاری شازیہ بہت مبارک باد۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کے گھر کی مہمانی کا شرف حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ سعادت نصیب فرمائے۔ آمین۔

شعاع کی محفل میں شرکت کے لیے ممنون ہیں۔ پہلی بار آپ نے خط لکھا اب خیال رکھیے گا کہ یہ آخری بار نہ ہو۔

صائمہ، رضوانہ اور میمونہ نے موضع آدم واہن ضلع لودھراں سے شرکت کی ہے، لکھتی ہے

شعاع اور ہمارا ساتھ تقریباً دس سال پرانا ہے میں اور میری دو بھابھیاں بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ آپی میں جسمانی طور پر تھوڑی سی ایب نارمل ہوں۔ مطلب میرے سینے کی ہڈیاں اپنی جگہ پر درست نہیں جس کی وجہ سے بچپن سے ہی سانس چڑھتا ہے اسی وجہ سے میں نے صرف پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ زندگی کی اٹھائیس بہاریں دیکھ چکی ہوں، زندگی گزارنا مشکل ہوتا اگر جو شعاع نہ ہوتا۔ شعاع کے ہر ناول اور ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی سبق ضرور ہوتا ہے۔ میں اور میری بھابھیاں پڑھ کر آپس میں تبصرہ کرتی ہیں۔ ہم لوگ باری باری شعاع خریدتے ہیں۔ اف ابھی میرا خط مکمل بھی نہیں ہوا کہ امی نے بڑا سارا ساگ کا گٹھڑ لا کر میرے پاس رکھ دیا اور کہا فارغ ہو کر میرے ساتھ ساگ بنانے میں مدد کرو۔

خطوں کے جواب میں آپ کا اپنائیت بھرا انداز بہت پیارا لگتا ہے اور ہم نے اپنی امی کا (ٹاٹا جوڑا) لکھ کر بھیجا ہے کیا چھپ دیں جو کہ پینتالیس سال پرانا ہے۔ آخر میں اپنے علاقے کا تعارف بھی کرواتے چلیں۔ موضع آدم واہن کے ایک طرف ضلع لودھراں اور دوسری طرف ضلع بہاولپور شہر لگتا ہے اس لحاظ سے ہمیں یہاں زندگی کی ہر سہولت میسر ہے۔ سردیوں میں ہمارے علاقے کی مشہور سوغات ساگ اور سہانجنا گوشت ہے جو کہ اس موسم میں کثرت سے پکائے جاتے ہیں۔

صائمہ! رضوانہ اور میمونہ! جہاں تک ہمارا اندازہ ہے۔ خط آپ تینوں میں سے صائمہ نے لکھا ہے تو صائمہ بی بی! آپ نے خواہ مخواہ اتنے عرصے تک یہ سوچ کر خط نہیں لکھا کہ آپ کی رائٹنگ اچھی نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ کی رائٹنگ بہت اچھی ہے اور آپ نے خط بھی بہت اچھا لکھا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم تو ہر طرح

کی رائٹنگ پڑھنے کے عادی ہیں۔ خراب رائٹنگ ہمارے لیے مسئلہ نہیں بنتی۔

آپ بہت باہمت ہیں کہ اپنی بیماری کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کر رہی ہیں لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے کہ آپ کی بیماری لاعلاج نہیں۔ آپ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں۔

آپ ناتا جوڑا ہے کے سلسلہ میں اپنی ای کا سلسلہ ضرور بھجوائیں۔ 45 سال میں حالات بہت بدلے ہیں۔ آپ پرانی باتیں تفصیل سے لکھیے گا۔ شعاع کے تمام سلسلوں میں شرکت کریں یہ سلسلے آپ ہی کے لیے شروع کیے گئے ہیں۔

فائزہ بھٹی نے چنوکی سے لکھا ہے

ہمارے گاؤں میں 9 جنوری کی شام بہت بڑا حادثہ ہوا جس نے ہر ایک پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ پانچ افراد پر مشتمل ایک خوش حال گھرانہ ایک عورت، مرد اور تین بچیاں جن کی عمر یا لترتیب چھ سال، ساڑھے تین سال اور ڈیڑھ سال تھی۔ گھر کا واحد مرد کما کر لاتا اور باقی سب اس کی کمائی پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ 9 جنوری کی شام کو وہ آدمی کام سے واپس آیا سردی بہت زیادہ تھی تو اس نے اپنی بیوی کو بستر سے نکلنے سے منع کر دیا۔ تاکہ چھوٹی سوئی ہوئی بچی کی نیند خراب نہ ہو۔ خود سیلنڈر پر چائے بنانے لگا۔ سیلنڈر شاید خراب تھا۔ اس نے ماچس کی تیلی جلا کر جیسے ہی آگے کی، آگ بھڑک اٹھی۔ آدمی نے سلنڈر کو پکڑ کر باہر پھینکنے کی کوشش کی۔

اس کی یہ کوشش کافی بھاری پڑی۔ سلنڈر دروازے کے ساتھ لگا اور دروازہ بند ہو گیا اور سلنڈر اندر رہ گیا۔ ایک دم سے سارے کمرے میں آگ پھیل گئی۔ کمرے کی چھت بھی لکڑی کی تھی۔ جس نے آگ کو بھڑکنے میں اور مدد دی۔ جتنی دیر میں دوسرے لوگوں کو پتا چلا اور انہیں باہر نکالا گیا۔ وہ پانچوں بہت زیادہ جل چکے تھے۔

انہیں فوراً لاہور اسپتال لے جایا گیا مگر دو بچے اور ماں باپ جاں بر نہ ہو سکے۔

اب صرف تین ساڑھے تین سالہ بچی ہے جو ابھی بھی اسپتال میں زندگی اور موت کے درمیان جھول رہی ہے۔

کوئی کہے ہائے بے چاروں پر عذاب نازل ہوا ہے۔ کوئی بولے، جانے انہوں نے ایسے کون سے گناہ کیے ہیں جن کی اتنی سخت سزا ملی ہے۔ اور کوئی بولے اللہ کسی پر ایسی آزمائش مت لائے آمین۔

بندہ پوچھے...... ان بڑوں کو تو چھوڑیں ان معصوم بچیوں نے ایسے کون سے گناہ کیے ہیں۔ جن کی اتنی بڑی سزا ملی ہے۔ اور وہ جو ابھی زندگی موت کے درمیان پڑی ہے۔ کیا اس نے اتنے ۔ گناہ کر لیے کہ اس کی سزا ختم ہونے میں نہیں آ رہی۔

جب سے سمیرا حمید کی ”ام الیقین“ پڑھی ہے۔ تب سے ہمارا یقین اس بات پر اور بھی پختہ ہو گیا ہے کہ بیماری اللہ کی رحمت سے آتی ہے نا کہ غضب سے۔ اس کہانی میں جب سے پڑھا ہے کہ بیمار شخص اللہ کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے تو دل ایک دم سے پرسکون ہو جاتا ہے۔ میں خود جو کافی بیمار رہتی تھی۔ اور اب بھی کئی دفعہ جب اتنے علاج کے باوجود تکلیف محسوس کرتی ہوں تو پہلے جو کبھی کبھار شور مچا لیا کرتی تھی وہ بھی چھوڑ دیا ہے کہ اگر اللہ اسی طرح اپنے قریب رکھنا چاہتا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔

پیاری فائزہ! بہت افسوس ہوا آپ کا خط پڑھ کر۔ ہم لوگ کتنے ظالم ہو گئے ہیں کہ ایسے دل کو ہلا دینے والے واقعات پر بھی باز نہیں آتے۔ گناہ و ثواب کا فلسفہ لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو دوبارہ آگ کا عذاب نہیں دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ جو اذیت ان لوگوں کو پہنچی، وہ ان کے لیے آخرت میں کسی بڑے مقام کا سبب بن گئی ہو۔

منشا انصاری نے سیالکوٹ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سب سے پہلے مصنفہ عالیہ بخاری کے رفیق حیات نظام الدین صاحب کے لیے دعائے مغفرت۔

پہلی شعاع بہت زبردست۔ نبی کی باتیں بہت خوب صورت سلسلہ ہے۔ شیف فرح کا انٹرویو پڑھ کر اتنا ہی مزہ آیا جتنا ان کو ٹی وی پر دیکھ کر آتا ہے۔

”دکھائی دینے والی ہر چیز کم حیثیت ہے۔ حیثیت والی سب چیزیں پوشیدہ اور باپردہ ہیں۔

سمیرا جی کسی کمال کردیتا۔ چاندنی کی اپسرائیں بہت پسند آیا۔ (یار دلدار) شرمندگی تو بہت ہوئی عادل، حیدر اور حسن کو جن کی سانسیں ایک ساتھ رکی تھیں۔ ہاہاہا۔

باپ اور اماں کی بہت زبردست تھے اور باقی سلسلے بھی اچھے تھے۔

پیاری منشا! یاد آوری کا شکریہ۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

ثوبیہ افتخار نے صادق آباد سے لکھا ہے

میں شعاع، خواتین ڈائجسٹ کی برسہا برس کی خاموش قاری ہوں۔ ابا جی شعاع اور خواتین لا کر دیتے قسم سے اتنا پیارا باپ، شادی کے بعد شوہر نے کہا یہ فضول خرچا ہے تمہارا تو بس اتنا کہا میں فیشن نہیں کرتی ہوں پورے ماہ میں بس دو رسالے میری ڈیوٹیاں اور کنجوسیوں کے بدلے مجھے لینے دیں۔ اب ان رسالوں کا اپنی زندگی پر اثر انداز ہونا بتانا چاہتی ہوں۔ میں نے بہت مشکل زندگی گزاری ہے اور جب میں کسی مشکل کسی آزمائش میں پھنستی اس کی کوئی نہ کوئی کہانی مجھے نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ۔ قسم سے ایک ایک لفظ میرے لیے زندگی بنانے میں مددگار ثابت ہوا۔ ساتھی زندگی کا پڑھا لکھا اور سادہ اور میں ۔ انتہائی حساس عورت تو بس زندگی میں مجھے جب مشکل آئی تو پناہ قرآن پاک نے دی۔ رو کر چپ ہو جانا اور وضو کر کے قرآن پاک پڑھنا۔ صبر کرنا ہے اور آگے بڑھنا ہے۔ زندہ کیسے رہنا ہے یہ شعاع ۔ خواتین سے سیکھا۔

پیاری ثوبیہ! زندگی میں نہ دکھ ٹھہرتے ہیں نہ خوشیاں وقت کے ساتھ ساتھ زندگی بھی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ جو لوگ زندگی کا مفہوم سمجھ لیتے ہیں۔ وہ نہ خوشی میں بے قابو ہوتے ہیں نہ دکھ انہیں مایوس کرتے ہیں۔ ہر حال میں اپنے رب کو یاد رکھتے ہیں۔ آپ نے دکھ میں اللہ کو یاد رکھا۔ اسے پکارا۔ ان شاء اللہ اچھا وقت بھی ضرور دیکھیں گی۔

شعاع نے آپ کو دکھ کی گھڑیوں میں سہارا دیا۔ اس تعریف اور حوصلہ افزائی کے لیے ممنون ہیں۔

رباب علی خاقان نے کوٹ نڈری چنڈی داس ضلع شیخوپورہ سے شرکت کی ہے

”شہرزاد“ کے بعد ”شہر تمنا“ لگتا ہے زبردست پذیرائی حاصل کرے گی۔ اس کے بعد ثمین نعیم کی ”یار دلدار“ ہمیشہ کی طرح زبردست۔ ”منشا محسن علی“ کا ناولٹ بھی اچھا تھا۔

اور اب بات کروں گی۔ سمیرا حمید کے ناول ”طواف عشق“ کی تو کیا کہوں اور کیسے تعریف کروں۔ نہیں تعریف نہیں، اس سے بہت بڑھ کر سمیرا حمید کو اللہ نے ایسی صلاحیت دی ہے کہ انسان کی اللہ سے دوستی کروا دیتی ہیں۔

پیاری رباب! آپ نے ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کیا، بے حد خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ آمین۔

طوبیٰ مریم طاہرہ گاؤں چتال ضلع چکوال سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

میں اکثر افسانے ہی پڑھتی ہوں۔ ماما ناول پڑھنے نہیں دیتیں۔ ایک دفعہ میں نے ماما سے کہا اس دفعہ شعاع میں افسانے اچھے نہیں آئے تو ماما بولیں چلو جی۔ ”کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔“ مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں پرندے اور پھول دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتی ہوں۔ میرا نام طوبیٰ مریم ہے۔ میری عمر گیارہ سال ہے۔ میں نے ابھی پانچویں جماعت کا بورڈ کا امتحان دیا ہے۔ میں گورنمنٹ اسکول کی طالبہ ہوں۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ اور تمام اساتذہ کرام بہت محنتی اور قابل ہیں۔ مجھے خط لکھنا میری اردو کی ٹیچر نے سکھایا۔ میں ایک چھوٹی سی شیف بھی ہوں۔ میرا بنایا ہوا کیک پورے خاندان میں مشہور ہے۔ آپی ناول شہرزاد شوق سے پڑھتی ہیں۔ شعاع ماما کی نیند کی دوا ہے کیونکہ ماما شعاع پڑھتے پڑھتے سو جاتی ہیں۔ میرا خط میرے اسکول کے چچا (نائب قاصد) پوسٹ کریں گے۔

پیاری طوبیٰ! واہ بھئی، آپ تو بہت باکمال ہیں۔ اتنی کم عمر میں اتنے سارے کام! بہترین طالبہ، مقررہ اور شیف اور اس کے ساتھ ساتھ شعاع بھی پڑھتی ہیں۔ آپ کے اسکول کے اساتذہ اور ہیڈ مسٹریس بھی مبارک باد کی مستحق ہیں۔

نالہ گبر خان کے نواحی گاؤں سے رمشا شریک محفل ہیں، لکھا ہے

میں بہت چھوٹی تھی تب سے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیے آج ایک کہانی نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ”طواف عشق“ سمیرا آپی! کیا کہوں؟ الفاظ ہی نہیں ہیں میرے پاس۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تعریف کروں تو کیسے کروں کون سے الفاظ استعمال کروں؟ لاجواب، بے مثال، زبردست، فسوں خیز، روح کو ہلا دینے والی، ضمیر کو جھنجھوڑ دینے والی، دل کو بے قرار کر دینے والی یا آنکھوں کو نم اور لبوں کو ساکت کر دینے والی کہانی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ انہیں اور ان کے ذہن کو مزید کشادگی عطا فرمائیں۔ ناول میں شہرزاد، شام کی حویلی میں بہت

زبردست ہیں شہر تمنا کی قسط سے ہی بہت اچھی لگی۔ مکمل ناول اور ناولٹ بھی بہت اچھے ہیں افسانوں میں آپی میرا موسٹ فیورٹ "یار دل دار" افشین آپی پلیز پلیز ریکویسٹ ہے کہ بس یہ چلتا رہے ہمیشہ۔

پیاری رمشا! شعاع کی محفل میں خوش آمدید ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ آپ نے صفحے کے دوسری جانب خواتین کے لیے خط لکھ دیا۔ آئندہ خط لکھیں تو خواتین کے لیے علیحدہ کاغذ پر خط لکھیں۔ البتہ لفافہ ایک ہی استعمال کر سکتی ہیں۔

افق ارین کے پی کے، کرک سے رونق محفل ہیں

تین ماہ بعد جس تحریر نے قلم اٹھانے پہ مجبور کیا وہ ہے۔ "طواف عشق" اللہ اللہ سمیرا جی کہاں سے لاتی ہیں یہ دل فتح کرنے والے الفاظ۔ یہ وہ تحریر ہے جس نے "خالی آسمان" کے بعد پہروں رُلایا۔ افسانے سارے ایک سے بڑھ کر ایک تھے مگر "من عرفہ نفسہ" کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔

ناولٹ اس بار ایک تھا لیکن کمال کا تھا شکریہ "فشا محسن اتنی اچھی تحریر کے لیے۔ "شہر تمنا" ایک خوب صورت اضافہ لگ رہا ہے۔ "شام کی حویلی میں" بس اتنا کہوں گی کہ رخسانہ نگار، جب بھی آتی ہیں دل خوش کرتی ہیں۔

"کوئی شام" کے بارے میں یہی کہنا ہے انا کی جنگ میں ہار ہمیشہ محبت کی ہوتی ہے لیکن شکر ہے آخر میں شاکرہ کو عقل آ گئی۔

ج: پیاری افق! سمیرا سے ملاقات ہوئی تو ہمارا پہلا سوال یہی تھا کہ اتنے بڑے بڑے موضوعات پر آپ کیسے لکھ لیتی ہیں پھر زبان و بیان...... جملوں میں ایسی زبردست کاٹ کیسے آتی۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے شعر کی طرح کہانی بھی مصنف پر اترتی ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

نواب شاہ سے ام انعام لکھتی ہیں

سب سے پہلے سمیرا حمید کا ناول "طواف عشق" پڑھا۔ عزیزہ جنت، آمنہ، ان کی ہر کیفیت، ہر بات اپنی آنکھوں سے دیکھی اور محسوس کی ہے۔ کسوۃ الکعبہ دیکھنا۔ کاروان حج کے ساتھ جانا۔ امیر کاروان ابن موسیٰ اور درویش کی گفتگو۔ ان تینوں کی خوشی۔ صحرا کا حسن۔ حج ادا کرنے کی خوشی۔ ابن منصور کا حسد پڑھتے آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

آخر میں عزیزہ اور ابن موسیٰ کا نکاح۔ یا اللہ کیا دنیا۔ کیا لوگ۔ کیا آزمائشیں۔ اور کیا سرخروئی میرے پاس الفاظ نہیں سمیرا کے لیے۔ اور یہ آپ ہی سے سیکھا ہے۔ کہ اپنی رائے ضرور دیں —— الفاظ بے شک بھاری بھر کم نہ ہوں۔ میرے الفاظ سمیرا کو دل سے سلام پیش کرتے ہیں۔ اور آپ کا ادارہ خوش نصیب ہے کہ آپ روشنی اور حق کو فروغ دے رہے ہیں۔ آپ پہ اللہ سائیں کی رحمت ہے۔ سندھی ہوتے ہوئے بھی ہم اردو ادب سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔

ج: ام انعام! ہمیں خوشی بھی ہوتی ہے اور حیرانی بھی جب آپ ہمیں اردو کے علاوہ دیگر علاقائی زبانیں بولنے والی قارئین خط لکھتی ہیں۔ سمیرا حمید کافی فصیح زبان لکھتی ہیں۔ اردو مادری زبان نہ ہوتے ہوئے بھی آپ نے ان کی تحریر کو پڑھا، اس کا صحیح مفہوم سمجھا اور ہمیں خط لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ تو آپ ہم سے زیادہ داد کی مستحق ہیں۔

شمع یاسر جڑانوالہ سے لکھتی ہیں

سمیرا حمید کا "طواف عشق" زبردست تحریر۔ ایمان افروز قصہ اور صدائے عشق ہے۔ حقیقتاً حج صرف مناسک ادا کرنے کا نام نہیں ہے عشق کے بغیر کوئی حج نہیں صراط مستقیم پر لبیک کہنے کا نام ہے۔ پڑھتے وقت ایسی جذب کی کیفیت تھی کہ مجھے ہوش نہ رہا۔ میں کس جگہ، کس مقام وقت پر ہوں۔ آنکھیں اشک بار ہو گئیں رب کی یاد بھی بہت آئی۔

"بتا اے انسان! اللہ کو کیا منہ دکھائے گا اس کی مخلوق کو کمتر پائے گا تو خود کو کیسے معتبر بنا پائے گا۔"

انسان انسانیت کا معترف ہو جائے تو شاید فرشتہ بن جائے۔ یہ تحریر سمیرا حمید کے لیے زاد راہ اور صدقہ جاریہ ہے۔ بہت مبارک۔

ج: شمع! آپ نے اتنے اچھے انداز میں سمیرا کی تعریف کی ہے کہ پڑھ کر سمیرا کی آنکھیں بھی نم ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اسے ہم سب کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین۔

ازکی سعید، منڈی فیض آباد

میں ہاؤس وائف ہونے کے ساتھ ایک ٹیچر بھی ہوں مدرسے کی۔ یہ پرچہ کب اور کیسے پڑھنا شروع کیا کیا بتاؤں؟ تو پھر عمیرہ احمد کا میری ذات ذرہ بے نشان سے یہ سفر شروع ہوا اور نمرہ احمد کے نمل سے ہو کر سمیرا حمید کے طواف عشق تک پڑھا۔ اب جب کہ میری بیٹی اور بیٹا خیر سے انٹر تک پہنچ گئے ہیں یہ سفر جاری ہے۔

اب تو میری بیٹی ہادیہ میرے ساتھ کہانیوں پر تبصرہ کرتی ہے اس نے طواف عشق پڑھ کر کہا کہ "ویل ڈن ویل ڈن سمیرا حمید کیا ہی موضوع اور کیا ہی رب کی چاہت۔"

باقی حمد سے لے کر پورا پرچہ ہی نہایت شاندار، نگہت سیما نے ہمیشہ اچھا لکھا اور اس دفعہ کا من عارفہ نفسہ نہایت شان دار۔

چاند گلی کی اپسرائیں بہت پسند آیا کہ واقعی ہم میں سے کئی فریدہ خالہ کی طرح اپنے تئیں ٹھیک بات کرتے ہوئے دوسروں کے لیے غم کے کانٹے اگا دیتی ہیں۔ کبھی نہیں سوچتے کہ خوب صورت اور مکمل ہونے میں نہ ہمارا کمال اور کمی ہونے پر نہ دوسروں کا دوش مجھے یہ بات ابھی تک رلاتی ہے کہ میری بیٹی حفصہ برین ٹیومر کی وجہ سے اس کی آنکھ متاثر ہوئی تو وہ اسکول جانے سے ڈرنے لگی اور باہر جانے سے بھی کہ ماما بچے میرا مذاق اڑاتے ہیں (اللہ اس کو جنت نصیب کرے)

ج: پیاری ازکی! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ آپ کی بیٹی کو اللہ تعالیٰ جنت میں اعلا مقام سے نوازے اور آپ اپنی زندگی میں اپنے بچوں کی شان دار کامیابیاں دیکھیں۔ ہمارے ساتھ اتنی طویل رفاقت نبھانے پر شکریہ۔

صائمہ خان نے جوہر کالونی سرگودھا سے لکھا ہے

سمیرا حمید گریٹ "طواف عشق" پڑھتے کتنی دفعہ صفحہ گیلا ہوا۔ یار دلدار بہت کم ہوتا ہے۔ نگہت سیما کا افسانہ ذہن میں خدشات پیدا کر گیا الفاظ خوب صورت تھے "شہر تمنا" میں کچھ نیا نہیں تھا۔ احمد کا دکھ ہوا۔

ج: پیاری صائمہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔ قسط کا ناغہ ہمیں بھی اچھا نہیں لگتا اور یقیناً ہماری مصنفین کو بھی پسند نہیں ہو گا۔ لیکن دنیا میں رہتے ہوئے کوئی بھی انسان دکھ، بیماری اور تکلیف سے مبرا نہیں ہو سکتا۔

علیشبہ لکھتی ہیں

شعاع اور میرا ساتھ تو تقریباً چار سال سے ہے شعاع سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ گھر میں بھی کسی نے منع نہیں کیا، رسالہ پڑھنے سے میرا چھوٹا بھائی خود لا کر دیتا ہے۔ میں پچیس سال سے اسی بھی پڑھتی ہیں۔ آپ جواب بہت اچھے دیتی ہیں تو میں نے کہا میں بھی خط لکھ دیتی ہوں۔ ویسے ایک فرمائش کر رہی ہوں۔ پلیز نمرہ احمد کا انٹرویو لیں۔ طواف عشق مزہ آ گیا پڑھ کر الفاظ سیدھا دل میں اتر گئے۔ فرح بخاری کا بن باسی بہت اچھا تھا۔

ج: پیاری علیشبہ! بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے خط لکھا۔ نمرہ احمد کا انٹرویو ضرور لیں گے اور وہ شعاع کے لیے بھی لکھیں گی۔ حالم کی چند ہی اقساط باقی ہیں۔ فرح بخاری کا اگلا ناول بھی آپ جلد پڑھ سکیں گی۔

ماہا بشیر حسین ڈنگہ لکھتی ہیں

نبی کی باتیں، کی تو میں دیوانی ہوں۔ بندھن کو اگنور کر کے دستک پڑھی، ویسے شاہین آنٹی عجیب نہیں لگا آپ کو نائلہ کی تکلیفوں کو دہرا کر؟ "جب سے تجھ سے ناتا جوڑا" اس دفعہ پسند آیا، خوش گوار جو تھا ویسے ان خاتون کے شوہر ہیں بہت ہمت والے۔ "شعاع کے ساتھ" حفصہ اسلم کے جوابات پسند آئے۔ شادی مبارک، سچ کہوں تو سر پر سے گزر گیا کہ کیا لکھا ہے کوثر خالد نے؟ "طواف عشق" سمیرا حمید تو جادوگرنی ہیں۔ کوئی شام، مصباح علی نے کمال کا لکھا، بہت مس کیا ہم نے انہیں۔ اپسرائیں، میری بہن تبسم بشیر مجھے فشا کی کوئی کہانی نہیں پڑھنے دیتی۔ کہتی ہے کہ فشا کو صرف میں پڑھوں گی دیوانی جو ہوں ان کی۔ افسانوں میں یار دلدار، ماپ، آئینہ، اماں مخلصی اور محبت پسند آئے۔ آئینہ خانے ہمیشہ بیسٹ ہوتا ہے۔ اس ماہ عطیہ خالد نے نہیں لکھا؟

☆ پیاری ماہا! شاہین رشید کا مقصد نائلہ جعفری کی تکلیفوں کو دہرانا نہیں تھا بلکہ ایک باہمت لڑکی کو سامنے لانا تھا کہ وہ مردانہ وار اپنی بیماری کا مقابلہ کر رہی ہے۔

پرانی رائٹر کے افسانوں کی آپ کی تجویز اچھی ہے۔ ہم ضرور عمل کریں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ دونوں ناول آپ کو پسند نہیں آ رہے، ہم ان کو بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

گوجرانوالہ سے فاطمہ ناز نے لکھا ہے

ساتویں میں تھی جب ان ڈائجسٹوں سے تعارف ہوا۔ وہ بھی ٹیوشن والی باجی سے۔ اب تو گریجویشن کے بھی تین سال گزر گئے۔ وہ الگ بات کہ گھر والوں سے کتنی ڈانٹ پڑتی ہے۔ لیکن ہم نے ان سے ہی تو سب کچھ سیکھا ہے۔ زندگی کی تمام پریشانیوں، دکھوں، تکلیفوں

پر صبر، حوصلہ، استقامت۔ ہماری امی کو اعلا تعلیم بہن بھائیوں کو دلوانے کا بہت شوق ہے لیکن ہمارے خاندان میں پڑھائی پر بالکل بھی توجہ نہیں دی جاتی۔ میں نے اتنی تعلیم اپنی پیاری ماں جان کے ساتھ سے حاصل کی۔

☆ پیاری فاطمہ! آپ کی امی ایک نیک مقصد کے لیے کوشش کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے مقصد میں کامیابی دے۔ آپ سب لوگ دل لگا کر پڑھیں اور اعلا تعلیم حاصل کریں اور زندگی میں کامیابی حاصل کریں۔

سیدہ کلثوم فاطمہ نے کراچی سے لکھا ہے

جس کہانی نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور خط لکھنے کی ہمت دی وہ "یار دل دار" ہے۔ میری معصومانہ خواہش ہے کہ شعاع یا خواتین میں وسیم بادامی کا انٹرویو شامل کیا جائے۔

پیاری کلثوم! آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

حرا سجاد نے کوٹ برکت علی میاں چنوں سے لکھا ہے

سمیرا حمید کا تو نام پڑھ کر ہی پر جوش ہو جاتی ہوں۔ سمیرا حمید آپ کے ہاتھوں میں یقیناً جادو کی چھڑی ہے جس سے آپ اتنی اچھی کہانیاں لکھتی ہیں۔ جب میں نے رسالہ کھولا تو مجھے چاندگلی کی اپسرائیں نظر آیا، ہائے مجھے تو بہت کیوٹ لگی یہ اسٹوری۔ میری طرف سے شیخ خالد کو شادی کی مبارک باد۔ افسانے بھی بہت اچھے تھے۔ شاہین جی پلیز آپ مجھ سے دوستی کرلیں۔ میری کزنز، دوستیں، ماریہ، اقصیٰ، زرشہ اور بہن نوشی کہتی ہے کہ خط لکھو تو ہمارا ذکر بھی کیا کرو۔

☆ پیاری حرا! آپ اور آپ کی دوستوں ماریہ، اقصیٰ اور زرشہ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ سب نے ہماری محفل کی رونق میں اضافہ کیا۔

آپ کی بہن نوشی کا نام بھی شامل ہے، شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عشرت فاطمہ طالب حسین نے لکھا ہے

مجھے خط لکھنے پر مجبور کرنے والی فرزانہ کھرل ہیں۔ ان کی بہت بڑی فین ہوں، فرزانہ جی کی ہر تحریر دل چھو لیتی ہے۔ اتنا زبردست لکھتی ہیں۔ افشین نعیم "یار دل دار" کی تو کیا ہی بات ہے۔ سمیرا حمید "طواف عشق" پڑھتے پڑھتے کتنی بار آنسو صاف کیے۔ شام کی حویلی میں، رخسانہ جی خوب لکھ رہی ہیں۔ افسانے سب کے سب بہت اچھے تھے۔ سبق آموز محسوس ہوئے۔ مجھے شعاع سے بہت پیار ہے، ان سے بھی جو مجھے شعاع لا کر دیتے ہیں۔ میری سب سے پیاری دوست نسرین اور میری بہن ثناء اور میرا بھائی محسن۔

☆ پیاری عشرت۔ آپ خط میں اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں، آئندہ خط لکھیں تو اپنے شہر کا نام ضرور لکھیے گا۔ فرزانہ کھرل ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں۔ ہم ان کا ناول ضرور شائع کریں گے۔

نسرین، ثناء اور محسن تک آپ کی محبت اور شکریہ پہنچا رہے ہیں۔

اقصیٰ علی شیر، قائم پور ضلع سے لکھتی ہیں

"خواب شیشے کا" ناول اور صائمہ اکرم کے "شہر زاد" نے ہمیں قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ شعاع کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ حمد اور نعت تو ہمیشہ اچھی ہوتی ہے اور پیارے نبی کی پیاری باتیں تو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ بند حسن بہت پسند ہے۔ دستک بھی اچھا سلسلہ نے۔ نعیمہ ناز کا شہر تمنا کی پہلی قسط ہی بڑی زبردست تھی۔ جب میں نے اپنے پاپا کو کہا کہ میں آپ کو خط لکھ کے دوں گی آپ پوسٹ کرا آئیں گے تو میری پیاری بہنا عروج میرا مذاق اڑانے لگی، کہ پاپا آپ کی بیٹی رائٹر بن رہی ہے۔ اس کے بعد میں اپنا سروے بھی بھیجوں گی۔

☆ پیاری اقصیٰ! آپ نے خواہ مخواہ خط شائع نہ ہونے کے ڈر سے ہمیں خط نہ لکھا۔ پہلی بار تو یہ کہ ہماری قاری بہن ہمیں اتنے پیارے خط لکھے تو ہم کیوں نہ شائع کریں گے اور اگر کسی وجہ سے شائع نہ بھی کر سکے تو کم از کم شعاع کے بارے میں آپ کی رائے سے تو آگاہ ہو جائیں گے۔ اپنے دل سے ناکامی کا خوف نکال دیں، جو ناکام ہوتے ہیں وہ کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ جو کوشش نہیں کرتے انہیں تو کبھی کامیابی ملتی ہی نہیں۔

پسرور سے یاسمین نے لکھا ہے

شادی مبارک میں کوثر خالد نے اپنی بیٹی کی شادی کا احوال دلچسپ بتایا۔ عالیہ بخاری کے رفیق حیات کی وفات کا پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ صبر جمیل بخشے اور ان کے شوہر کو جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے، آمین ثم آمین۔ پہلی شعاع بڑی اچھی لگی۔ "طواف عشق" کی آخری قسط بہت اچھی لگی۔ سمیرا حمید مبارک باد کی مستحق ہیں۔ افسانوں میں مونا شاہ کی محبت اور شاہین ملک کی بھنور کہانیاں زیادہ اچھی لگیں۔ نظمیں غزلیں پسند آئیں،

مستقل سلسلے اچھے ہیں۔ 14 مارچ 2018ء کو آئینہ پسرور کے مصنف مشتاق احمد قریشی دنیا سے چلے گئے۔ ان کی نواسی سیالکوٹ میں رہتی ہیں۔ دو چھوٹے بچوں کی ماما ہیں لیکن شعاع ہر ماہ پڑھنے کے لیے وقت نکال لیتی ہیں۔ شعاع کے ذریعے ان سے اپیل کی جاتی ہے کہ شعاع میں بقلم خود لکھیں۔

☆ پیاری یاسمین! اگرچہ کہ یہ محفل پیغام رسانی کے لیے نہیں ہے لیکن آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بھیا مدیحہ جی نے لکھا ہے

میرا نام مدیحہ ہے لیکن سب لوگ مجھے بھیا جی کہتے ہیں کیونکہ میں گھر میں سب سے بڑی ہوں۔ میں شعاع اول کلاس سے پڑھ رہی ہوں۔ اب تو میں نے ایم اے اردو لٹریچر پنجاب یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا ہے۔ شعاع اور خواتین بہترین ہیں۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ ایسا نہ تو کسی ڈائجسٹ میں آیا اور نہ ہی آئے گا۔ بیسٹ ہے۔ اس ماہ مارچ 2019 میں م۔ الف۔ رخ۔ سے کہنا چاہتی ہوں آپ نے لکھا کہ آپ کے شوہر نے بہت سی قربانیاں دیں۔ غلط جس شخص نے خود پہلی بیوی سے قربانی مانگی اور اس پر سوکن لا دی، وہ شخص کیا قربانیاں دیتا؟ ایک شادی شدہ تین بچوں کے باپ سے چکر چلا کر شادی کر لینا۔ مجھے تو پڑھ کر بڑی شرمندگی ہوئی۔ آپ کے باپ نے آپ کو مرضی سے شادی کرنے کی اجازت دی اور آپ نے کسی دوسری عورت کا گھر برباد کر دیا۔ سچ ہے عورت کی سب سے بڑی دشمن عورت ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ گھر صرف میرا ہے۔ غلط وہ گھر آپ کی سوکن کا تھا۔ خدانخواستہ آپ پہلی بیوی ہوتیں تو کیا آپ اپنے شوہر کو کسی عورت سے تعلق رکھنے کی اجازت دیتیں۔ اگر مرد دوسری شادی کا ارادہ کر لے تو پھر وہ کسی سے بھی کر لیتا ہے جو بے وقوف بن جائے۔

☆ پیاری مدیحہ! ہمارے مذہب میں دوسری شادی کی اجازت دی گئی ہے لیکن دوسری شادی کرنے کے لیے مرد پر کچھ شرائط بھی عائد کی گئی ہیں۔ دونوں بیویوں اور سب بچوں کے ساتھ برابری کا برتاؤ اولین شرط ہے۔ اگر مرد برابری کا برتاؤ کرے تو کوئی گھر برباد نہیں ہوتا۔ گھر برباد کرنے میں خاتون کا نہیں ان صاحب کا حصہ زیادہ ہے۔ انہوں نے دوسری شادی کر کے پہلی بیوی اور بچوں کے حقوق ادا نہیں کیے۔ ہماری نظر میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں جہاں دوسری شادی کے باوجود مرد نے دونوں بیویوں کا برابر کا خیال رکھا اور دونوں بیویاں خوش رہیں۔

ان خاتون نے جو کچھ کیا، ہمارے معاشرے میں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن معاملات دل کے ہوں تو عقل رخصت ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ بہت عظیم ہوتے ہیں جو اپنے دل اور جذبات کی قربانی دے کر دوسروں کے بارے میں سوچتے ہیں، لیکن ہر ایک سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

ڈاکٹر فریال خان نے ڈی جی خان سے لکھا ہے

اس مرتبہ پرچے کی جان ہے "طواف عشق" سمیرا حمید آپ کے مطالعے نے حیران کر دیا۔ یقین کریں آپ سامنے ہوتیں تو ایک آدھ بار آئس کریم تو ضرور ہی بنتی تھی۔ اس قدر محبت اللہ کے گھر سے۔ کیا یاد کروا دیا سمیرا جی۔ میرا دل ہی نہیں بھر رہا اس ناول سے۔ میں بار بار اس کہانی کو پڑھ رہی ہوں ہر بار یہی لگتا ہے کہ نئے سرے سے پڑھ رہی ہوں۔ شام کی حویلی میں رخسانہ صاحبہ کا سلسلے وار ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے باقی قارئین کو تو آپ مس کر لی ہیں مجھے کبھی نہیں کیا کہ فریال آ جاؤ جہاں بھی ہو، آپ کو مس کر رہے ہیں۔ ویسے میرے جیسی زندہ دل ڈاکٹر آپ کو کہیں بھی نہیں ملے گی، خاص طور پر آپ کی گلی میں تو نہیں ہوگی، باقی شہر کا میں نہیں کہتی، ہاہاہا۔

☆ پیاری فریال! اس سلسلے میں ہمارا تجربہ حیران کن ہے۔ ڈاکٹرز مریضوں میں گھرے رہتے ہیں۔ لوگوں کو دکھ تکلیف میں دیکھتے ہیں، اس کے باوجود ہم نے بیشتر ڈاکٹرز اور نرسوں کو خوش اخلاق ہی پایا ہے۔ آپ کی کمی ہم نے محسوس کی اور ہماری قارئین نے بھی ضرور محسوس کی ہوگی لیکن اب ہر بات کا اظہار تو نہیں کیا جا سکتا۔

سمیرا حمید کا ناول آپ کو اتنا زیادہ پسند آیا اور آئس کریم صرف ایک آدھ بار۔

ریحانہ چوہدری نے مدوکے سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

کیا خوب صورت بات کی ہے میری پیاری بہن نے، ہم لوگ آج کل جنت میں جانے کے بھی شارٹ کٹ ڈھونڈنے میں لگے رہتے ہیں اور محبت کو نہیں

اپناتے مگر دوسروں سے اس سب کی توقع کرتے ہیں۔

ادارہ مبارک باد کا مستحق ہے جو ہمارے لیے پیارے نبی کی پیاری باتیں لے کر آتا ہے۔ دستک میں نائلہ جعفری کی باتیں عزم نو اور ہمت و حوصلہ کا درس دے رہی تھیں، اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ کوثر خالد شادی مبارک بہت اچھا لکھا ہے، ایک افسانے جیسا اسٹارٹ دیا ہے۔ مگر افسوس زیادہ اس بات کا ہو رہا ہے کہ امام مسجد کی بیٹیوں کو ایسا نہیں دکھانا چاہیے تھا۔ مگر محاورے اور روزمرہ کا استعمال بہت شاندار ہے۔ ناول پڑھتے ہوئے، اردو پڑھنے کا مزا آجاتا ہے۔ نگہت سیما جی آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ یہی بات تو میں اپنے اسٹوڈنٹس کو ہر وقت سکھاتی ہوں کہ اپنے آپ کو پہچانو۔ کشف بلوچ کی جانچتی نگاہوں نے ایک خوب صورت افسانہ قلم کے سپرد کیا ہے۔

سمیرا حمید نے "طواف عشق" لکھا۔ کیا کمال کیا؟ عشق رقم ہوا، عشق بکھر گیا۔ عشق رل گیا۔ عشق تو عشق تھا، عشق سچ تھا۔ عاشق حق پر تھا تو معشوق حقیقت۔ عشق کامران ٹھہرا۔ واہ کیا عشق کو بیان کیا ہے۔ کون ہے جو یہ کہتا ہے سمیرا عشق پر نہیں لکھتی۔ سمیرا ہی تو ہے جو عشق کو بیان کرتی ہے اور خوب بیان کرتی ہے، لفظ کاغذ پر نہیں بکھرتے ہوتے، ہماری سوچ کو نئی جست پرواز عطا کرتے ہیں، ہمارے خیال کو خوشبوؤں کے سنگ کرتے ہیں۔ منشا محسن کی چاندگلی کی اپسرائیں کی۔ اردو ادب میں خوب صورت اضافہ، کیا یاد رہ جانے والی تحریر۔ چاندگلی کی چھتوں سے جھانکتا بشر پر چاند بھی۔ اتنے جاندار کرداروں اور الفاظ کے زبردست چناؤ نے منشا کے افسانے کو یادگار بنا دیا۔ مصباح علی کا کوئی شام بچا رکھنا، بہت خوب صورت تحریر تھی۔ دادی کا کردار بہت پاورفل لگا۔ شام کی حویلی میں ہمارا شک یقین میں بدلتے جا رہا ہے کہ پہلی قسط میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ موحد، زینب کے شوہر کا بیٹا ہوگا۔ فروری میں بھی چار شادیاں اٹینڈ کیں۔ سمبڑیال ہائی اسکول، ماڈل اسٹینڈرڈ کے امتحان پر بارشوں کے دوران ڈیوٹی دینی پڑی۔ اسی دوران تین دفعہ شادیوال (اپنے میکے) کا چکر لگانا پڑا۔ اپنی اسکول کی ڈیوٹی اس کے علاوہ کہ آرڈر تھا جب سنٹر کی ڈیوٹی میں چھٹی ہوگی اپنے اسکول حاضری دینی ہے۔ صبح سات بجے کی گئی ساڑھے تین بجے لوٹتی تھی پھر باقی کی ذمہ داریاں ایسے میں آپ کے لیے وقت نکالنا ہماری آپ سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تاریخ کے جھروکے بہت اچھا سلسلہ ہے۔ عروج و زوال کی یہ داستانیں پڑھ کر اگر کوئی نصیحت حاصل کرلے تو آپ کے لیے اس سے بڑی بات کوئی اور نہیں۔

☆ پیاری ریحانہ! آپ کی محبت اور ہمت کے تو ہم معترف ہیں۔ اتنے کاموں کے درمیان شعاع کا مطالعہ اور پھر اتنا طویل اور خوب صورت خط۔ چھ فل اسکیپ صفحات پر مشتمل آپ کا خط بہت دلچسپ اور تبصرہ بہت خوب ہے۔ صفحات کی مجبوری نہ ہوتی تو ہم پورا خط شائع کرتے۔ آپ کا پیغام اصل کو دے دیا ہے، افسانے ابھی پڑھے نہیں گئے۔

* * *

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے
بہنوں کیلئے خوبصورت ناول
یہ گلیاں یہ چوبارے
فائزہ افتخار
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

صفیہ مہر...... رحیم یار خان

سوال 1: شعاع کب سے پڑھنا شروع کیا؟

جواب: شعاع سے وابستگی دو جولائی 2008ء سے نایاب جیلانی کا ناول "دلوں کے آئینے" پڑھ کر ہوئی، پھر تو جیسے شعاع زندگی میں لازم ملزوم ہو گیا، اتنے پیارے رسالے خوب صورت اصلاحی کہانیاں پڑھے بغیر رہ ہی نہیں پائے، اتنے سالوں میں زیست میں کئی اتار چڑھاؤ آئے مگر شعاع سے ناتا جوں کا توں رہا، شعاع سے دوستی اب ہم نے نہیں چھوڑنی "یہ زندگی کے ہر اندھیرے کو منور کرتا ہے اپنی روشن شعاعوں سے،" ہماری زندگی کی ہر اداسی مایوسی ختم کر کے ہمیں مثبت سوچ عطا کی ہے۔ پیارے شعاع نے (شکریہ شعاع)

سوال 2: دن کا آغاز کب ہوتا ہے؟

جواب: صبح کا آغاز، ہماری صبح چھ بجے سے ہوتی ہے، پہلے چھوٹے بھائی بہن اسکول جاتے تھے تو جلدی سے ناشتا بنانا ہوتی تھی لیکن اب وہ ہوسٹلز میں قیام پذیر ہیں تو اب اطمینان سے دل کی تمام خوشی، رضا مندی سے نماز پڑھتی ہوں، تلاوت پاک کرتی ہوں پھر بستر تہہ کر کے بکھرا کمرہ سمیٹتی ہوں پھر اپنی پھولوں کی کیاری کے پاس جاکر کچھ دیر ٹہلتی ہوں۔ فریش ہوکر آٹا گوندھتی ہوں ناشتا گرم گرم اماں، ابا کو دیتی جاتی ہوں، اور ان سے دعائیں سمیٹتی جاتی ہوں، میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں، اس لیے خود سے زیادہ اپنوں کو خوش رکھتی ہوں اماں کو ایک کام نہیں کرنے دیتی ماسوائے چائے بنانے کے۔ یہ ہے میری ہر روز کی صبح کا انداز۔

سوال 3: خوبیاں خامیاں؟

جواب: اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ مجھ میں کوئی خامی نہیں تو غلط کہتا ہے، ہر انسان کی طرح مجھ میں خامیوں، خوبیوں کی آمیزش ہے۔ خوبیاں یہ ہیں میں جھوٹ نہیں بول سکتی، نہ منافقت ہے میرے اندر، ہر وقت ہنستی رہتی ہوں۔

جی چاہتا ہے۔ مجھ سے وابستہ ہر رشتہ ہنستا مسکراتا رہے، صاف دل کی مالک ہوں، برائی برداشت نہیں ہوتی، سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ میں پنج وقتہ نماز کی پابند ہوں اللہ کے قریب رہنے کے جتن کرتی رہتی ہوں۔

خامیاں! منہ پھٹ ہوں، جو بات نہیں کہنی ہو، وہ بھی نکل پڑتی ہے منہ سے، حالانکہ بڑی کوشش کرتی ہوں، بڑی خامی یہ کہ بولتی بہت ہوں، بہت محنت کی کہ کم بولوں مگر رہ ہی نہیں پاتی، اپنوں کی بے حسی اور بے نیازی نہیں سہہ سکتی، سب کو خوش رکھنے کی خامی میں اپنا آپ بھول بیٹھی، جب یہ سمجھ میں آیا کہ کوئی کسی سے خوش نہیں رہ پاتا تب تک اپنا قیمتی وقت کھو چکی تھی، خود سے لاپرواہ ہوں، آج تک خود سے کوئی بھلائی نہیں کی ماسوائے آپ کے یہ رسالے پڑھنے کے۔”

سوال 4: پسندیدہ کہانیاں؟

جواب: آپ کا یہ سوال بہت ہی اچھا ہے، ساتھ میں پسندیدہ رائٹر بھی لکھوں گی، سمیرا حمید سب سے پہلے، بورشے، رب البشر، کا موسیٰ کا کریکٹر بہت ہی جان دار تھا، راہ نورد شوق کی دینا فضل کریم کی مستقل اسٹرگل داد کے لائق تھی، پھر چاہے طواف عشق، راہ نور، ام الیقین، مہر میراں، برہا بھاگ کی مینا، ولی، مہر ثبت، سب میرے دل پر نقش ہیں، سمیرا کے بعد فرزانہ کھرل کی ہر تحریر پروقار شان دار تحسین کے لائق ہے فرزانہ جی، عطیہ خالد، [illegible] محسن علی، ایمل رضا، یہ میری پسندیدہ کہانیاں لکھتی ہیں، اس سال میں نے اشفاق احمد کی، بابا صاحبا، پڑھی لفظ لفظ موتی تھے، ہر پیراگراف اصلاحی تھا، ہر موضوع پر اعلیٰ الفاظ سے اعلیٰ کارکردگی دکھائی ہے انہوں نے، قدرت اللہ شہاب کا شہاب نامہ، پڑھا بہت ہی اچھے طریقے سے قلم کا حق ادا ہوتا دیکھا۔

سوال 5: پسندیدہ شعر یا اقتباس؟

میری منزلیں بھی عجیب تھیں میرا فیض بھی کمال پر
کبھی سب کچھ ملا بنا طلب، کبھی کچھ نہ ملا سوال پر

اقتباس:
صراط مستقیم
(درست سمت) ہر شے کے معنی بدل دیتی ہے۔

اللہ کو کوئی چیز اتنی عزیز نہیں ہے جتنی کہ ”دعا“ اللہ کو کوئی آواز اتنی محبوب نہیں جتنی کہ طلب گار کی ”صدا“۔ سمیرا حمید ”ام الیقین سے اقتباس“

”صبر بیٹا صبر! صبر تو ایک سنہری پیالا ہے یہ اتنا بیش قیمت ہے کہ اسے خریدنے کا ہر کسی کا یارا نہیں۔

صبر بیٹا صبر، صبر تو مرچ اور زیرہ، نمک کا تیز مرکب ہے۔ یہ اتنا تلخ ہے کہ اسے چکھنے کی ہر کسی کو تاب نہیں۔
(شہاب نامہ)

عمارہ شفیق......اوچ شریف ضلع بہاولپور

سوال 1: شعاع کب سے پڑھنا شروع کیا؟

جواب: شعاع کب پڑھنا شروع کیا؟ تو جی ڈیڑھ سال یا ایک سال ہوا ہے پڑھتے پڑھتے۔ ہوا یوں کہ ایک دن بہت بور ہو رہی تھی کہ نظر ریک پر پڑ گئی جو رسالوں سے بھرا ہوا تھا کیونکہ امی بہت پہلے سے رسالے پڑھ رہی ہیں تو نئے پرانے سب رسالوں سے گھر بھرا پڑا ہے۔ تو میں نے ایک رسالہ اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا اور تب سے آج تک رسالے پڑھتی آ رہی ہوں۔ گھر میں جتنے بھی رسالے رکھے ہیں سب مجھے حفظ ہو چکے ہیں۔

سوال 2: صبح کس وقت اٹھتی ہیں۔ روزمرہ کے کام کیسے نمٹاتی ہیں؟

جواب: اذانوں سے کچھ دیر پہلے اٹھ جاتی ہوں۔ کچھ دیر سبق پڑھنے کے بعد نماز۔ پھر قرآن اس کے بعد اقصیٰ (بڑی بہن) کو جھنجوڑ کر اٹھانا کیونکہ وہ بھی ست، کاہل واقع ہوئی ہے اگر سونے کا مقابلہ ہو تو میری بہن گولڈ میڈل حاصل کرے گی۔ عموماً بڑی بہنیں ست بہت ہوتی ہیں۔ کیوں کیا خیال ہے؟ خیر اس کے بعد کالج میرا مطلب اسکول جانے کی تیاری اور رہی کام کرنے کی بات تو ابھی ہم نیش میں ہیں۔ اسکول میں بہت مزا آتا ہے۔ وہاں سے واپس آ کر کپڑے چینج کرنا پھر ٹی وی یا رسالے یا پھر میرا موٹا ترین رجسٹر جس پر کہانیاں لکھتی ہوں۔ ساتھ ساتھ اقصیٰ اور میری لڑائی بھی چلتی رہتی ہے باقی کا دن بور ہوتا ہے کہ عصر کے بعد پھر سے پڑھائی۔ اب تو پڑھائی اتنی حاوی ہو گئی ہے کہ جب بھی کوئی اچھا خیال سوچنے لگتی ہوں تو میرا ننھا دماغ چلا چلا کر کہتا ہے ”بائیو، کیمسٹری، فزکس“۔

سوال 3: کوئی ایسی تحریر جو آپ کو یاد ہو؟

جواب: تحریریں تو بہت ساری پسند ہیں لیکن ”مجھے سنو اردو“ اتنی پسند ہے کہ بہت بار پڑھی، دوسری کا نام تو نہیں آتا لیکن وہ تحریر جس میں لڑکی اپنی نانی کے ساتھ جاتی ہے اور اغوا ہو جاتی ہے پلیز کسی کو اگر نام پتا ہے تو بتا دے۔

سوال 4: خوبیاں، خامیاں؟

جواب: خامیاں خوبیاں تو اقصیٰ سے پوچھیں اس نے کہا کہ خوبی ہو تو بتاؤں لیکن خامیاں یہ بتائیں۔ غرور کرتی ہوں (آہ) کسی کو دوست نہیں بناتی (اف) گھل مل کر نہیں بیٹھتی مطلب میں جلدی فرینک نہیں ہوتی۔

خوبیاں اقصیٰ نے کہا کہ کسی سے ڈرتی نہیں ہوں، بہادر ہوں۔ چلو میں خود بھی بتا دیتی ہوں اقصیٰ نے تو ایک ہی بتائی۔ میں ایکٹو ہوں۔ مطالعے کا شوق بھی میرے حساب سے ایک خوبی ہے۔ بس۔

سوال 5: پسندیدہ اشعار بہت سارے ہیں آپ کے لیے صرف دو؟

جواب:

کسی مانوس لمحے میں
کسی معصوم چہرے سے
محبت کی نہیں جاتی
محبت ہو ہی جاتی ہے

دوسرا یہ ہے۔

سانپوں کی یہ بستی ہے ذرا دیکھ کے چل
یہاں کا ہر شخص بڑے پیار سے ڈستا ہے

اور میری عمر پندرہ سال ہے۔ میں جماعت نہم میں پڑھتی ہوں۔ میرے اسکول کا نام گورنمنٹ گرلز ہائی سیکنڈری اسکول اوچ شریف ہے۔ ☆

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ

اپریل 2019ء
کے شمارے کی ایک جھلک

- ”الف“ عمیرہ احمد کا ناول،
- ”حالم“ نمرہ احمد کے ناول کی قسط،
- ”الٹی وا کی دھار“ عنیزہ سید کا مکمل ناول،
- ”تم میرے پاس ہو“ سمیرا حمید کا مکمل ناول،
- نگہت سیما اور افشین نعیم کا ناولٹ،
- ”سمیرا حمید“ کا سالگرہ نمبر کے لیے خصوصی سروے،
- ”موسم بہار کے ساتھ ساتھ“ قارئین سے خصوصی سروے،
- سحر ساجد، قانتہ رابعہ، عطیہ خالد، عطاف شیخ، شازیہ الطاف ہاشمی اور عائشہ تنویر کے افسانے،
- آپ کی پسندیدہ مصنفہ ”راحت جبیں“ سے ملاقات،
- باصلاحیت فنکارہ ”انعم فیاض“ سے باتیں،
- کرن کرن روشنی احادیث نبوی کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا اپریل 2019 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

نعیمہ ناز

ساتھ ہمیشہ کا

عالیہ بیگم اپنی بیٹی حمنہ کے رشتے کے لیے خاندانی لوگوں کی تلاش میں تھیں۔ جب کہ ان کی ساس کا کہنا تھا کہ رشتہ کے لیے دین داری اور شرافت کو ترجیح دو۔

عائشہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ رشتوں کے نام پر اس کی ایک خالہ تھیں جن کے دو بچے فہد اور علیز ے تھے۔ فہد اپنے باپ کے پاس امریکہ میں پڑھنے گیا تھا۔ اس کی والدہ سلائی کر کے اپنے بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ عائشہ کی سہیلیاں اس کی بے پناہ خوب صورتی کو سراہتی تھیں۔

سید صاحب کو مسجد کمیٹی کا صدر منتخب کیا جا رہا تھا۔ ان کی بیٹی نائلہ ایک خودسر لڑکی تھی، اس کی اپنے شوہر سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ وہ آئے دن اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر باپ کے گھر آ بیٹھتی۔ اس میں ماں کے مزاج کی جھلک تھی۔ اسے اپنی خوب صورتی پر ناز تھا۔ سید صاحب اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ نائلہ کے شوہر سرمد کا دوست جمال اس پر مرمٹا تھا۔

طلال شیخ ایک نامور سیاست دان اور جاگیردار کا بیٹا تھا جو چنبیلی کے حسن پر مرمٹا تھا۔
شاہ میر رسول بخش کا سب سے چہیتا شاگرد تھا، جوان کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھا۔
احمد فجر کے بعد جلدی جلدی گھر سے نکلا۔ آج ڈبل سواری پر پابندی کی وجہ سے پڑوس کے کامران انکل اسے اپنی موٹر سائیکل پر لفٹ نہیں دے سکے۔ اسے کافی انتظار کے بعد بس کی کھچا کھچ بھری چھت پر جگہ ملی۔ انتہائی تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے کچھ مسافر نیچے جا گرے جن میں احمد بھی شامل تھا۔

تیسری قسط

"بہت مشکل سوال ہے بابا، کیلکیولیٹر کے بغیر سولو نہیں ہو گا۔" بڑی دیر حساب کتاب لگانے کے بعد انصار الحق نے ہار مان لی اور اپنی بند آنکھیں کھول کر دوستوں کی طرف دیکھا اور پھر میز کی طرف دیکھ کر اچھل پڑا۔

"سب کچھ کھا گئے تم لوگ، میرے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔" وہ چیخا۔

"آدھے سے زیادہ تو ہی کھا جاتا، ہمارے لیے کیا بچتا۔" منصور نے فرائی فش کے آخری ٹکڑے سے انصاف کرتے کہا۔

"اس لیے بھائی صاحب کو حساب کتاب پر لگایا تھا تاکہ تمہیں ٹھیک سے کھانے کا موقع ملے۔" مانی نے لقمہ دیا۔

"میرے حصے کا بھی سب کچھ کھا گئے۔" انصار کا صدمہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"یار ایک بات بتا، سچ سچ۔" شاہ ذین نے نہایت سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"کیا؟"

"اگر تو ایک وقت کھانا نہ کھائے تو تیری سدا بہار صحت پہ کیا اثر پڑے گا۔" شاہ زین کا لب و لہجہ بدستور سنجیدہ تھا مگر منصور اور مانی کے قہقہے کافی بلند و بانگ نکلے۔

"او سجنو! یہ اصلی دودھ مکھن اور گھی پر پلا بڑھا وجود ہے۔ تم لوگوں کی طرح چربی ملے گھی اور پانی ملے دودھ کا ذائقہ کبھی نہیں چکھا۔" انصار الحق اپنے موٹاپے کا یونہی دفاع کرتا تھا۔

"چل یہ لے میرے شہزادے، جان بنا اپنی۔" شاہ ذین نے مسکراتے ہوئے اس کی پلیٹ کا سارا مال اس کے سامنے رکھا۔

"کہاں چھپایا تھا؟" انصار کے چہرے کی رونق دوبارہ واپس آ گئی۔

"یہ راز بتانے کا نہیں ہے۔"

کھانے کے بعد کولڈ ڈرنک، آئس کریم، سب کچھ ٹھونس کر جب اچھی طرح انصار کی جیب ہلکی کروا دی تو وہ لوگ وہاں سے واپس ہوئے۔

اپنی موٹر سائیکلوں تک پہنچنے کے لیے بس تھوڑی دور ہی چلنا تھا، شاہ زین چلتے چلتے اچانک رک گیا، اس سے کچھ فاصلے پر دو لڑکیاں گزر رہی تھیں۔ دو موٹر سائیکل سوار ان کے آگے پیچھے منڈلا رہے تھے۔

"اکیلے اکیلے کہاں جا رہے ہو، ہمیں ساتھ لے لو جہاں جا رہے ہو۔"

ان میں سے ایک با آواز بلند گا نا گا رہا تھا۔ دوسرا فقرے بازی۔

"سواری حاضر ہے جناب، کیوں خود کو تھکا رہی ہیں۔"

"چلو، آئیں تو جنت کی سیر کرا دیں گے۔ رکیے تو، سنیے تو......"

لڑکیوں کے انتہائی قریب پہنچ کر دونوں اوباشوں نے ان کے گرد موٹر سائیکل گھمانی شروع کر دی۔

اس سے پہلے کہ وہ لڑکیاں اپنے ردعمل کا اظہار کرتیں، شاہ زین ان کے سروں پر پہنچ گیا۔

"اوئے ہوئے، یہ اب کہاں چل پڑا۔" منصور بڑبڑایا۔

"خوامخواہ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑاتا ہے۔"

"اب تو پھنسا لی نا چلو، ہم بھی وہیں چلتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہمارے یار کی ٹانگ پھنس کر رہ جائے۔" مانی دونوں کو ساتھ لے کر وہیں بڑھا۔

وہ دونوں اوباش اب شاہ ذین کے گرد اپنی موٹر سائیکل گھما رہے تھے، دونوں لڑکیاں آگے بڑھ چکی تھیں۔

"تو ان دونوں میں سے کس کا یار ہے؟" ان میں سے ایک کی تمسخرانہ آواز ان تینوں کے کانوں میں پڑی۔

"یہ پٹے گا۔" مانی نے تاسف سے سر ہلایا۔

اور اس کی توقع کے عین مطابق شاہ زین کا زوردار گھونسہ اس کے منہ پر پڑا، وہ الٹ کر موٹر سائیکل سمیت نیچے جا گرا۔

"تیری تو......" دوسرا سوار شاہ ذین پر جھپٹا۔

"اے بھائی، برادر! ذرا آرام سے۔" مانی اور منصور نے اسے لپک کر جکڑا۔ "اوئے جنجوعہ، جلدی کر۔"

"کیا کروں؟" وہ اک دم بوکھلا گیا۔

"کیا ہے تیری جیب میں نکال اسے۔" شاہ ذین نے اسے گھورا۔

"یہ۔" جنجوعہ نے جیب سے پسٹل نکال کر جملہ حاضرین کو دکھایا۔

"ایک کو ٹھوکنا ہے یا دونوں کو؟"

"ان ہی سے پوچھ لے۔" شاہ ذین ہاتھ باندھ کر ایک طرف اطمینان سے کھڑا ہو گیا، گرا ہوا نوجوان اپنی موٹر سائیکل اٹھا کر دوبارہ اس پر بیٹھ رہا تھا، دونوں نے ایک نظر ان چاروں کو دیکھا، دوسری نظر پسٹل پر ڈالی اور موٹر سائیکلوں کو کک لگا کر یہ جا وہ جا۔

چاروں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

"یار، تیرا یہ کھلونا ہے بڑے کام کا۔" مانی نے ہنستے ہوئے اس کا پسٹل ہاتھ میں پکڑا۔

"تو یہ بتا کیا ضرورت تھی پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی، حالات دیکھ کتنے خراب ہیں اور لوگ ان سے زیادہ خراب، اگر مجھ سے پہلے یہ لوگ اسلحہ نکال لیتے، وہ بھی اصلی والا تو؟" منصور اور جنجوعہ مل کر شاہ زین کو لتاڑ رہے تھے۔

"یار! یہ جو راہ چلتی لڑکیوں کو یا خواتین کو لفنگے قسم کے لوگ تنگ کرتے ہیں نا تو میرا خون کھول اٹھتا ہے، زہر لگتے ہیں مجھے ایسے لوگ۔" شاہ زین کے مزاج اور خیالات سے مانی خوب واقف تھا۔

"لڑکیوں کے حلیے بھی تو ایسے ہوتے ہیں، دعوت نظارہ دیتے ہوئے، آ بیل مجھے مار، بیل تو پھر آئیں گے ٹکریں مارنے۔" منصور نے اعتراض کیا تھا۔

"بات سنو دوستو، کوئی عورت حجاب میں ہو یا دوپٹہ گلے میں ڈالے، وہ بہرحال ایسے ہی قابل احترام ہے

جیسے ہماری سگی ماں یا بہن یا بیوی، بیٹی، زبانی کلامی بھی کسی کی عزت پامال کرنا، کم از کم مجھ سے تو برداشت نہیں ہوتا۔" شاہ ذین نے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تقریر جھاڑی۔

"ایموشنل ازم کم کرو، حقیقت پسند بنو۔" منصور نے اسے چھیڑنے کو نعرہ لگایا۔

"میرے دوستوں سے مجھے بچاؤ۔" شاہ ذین نے جوابی نعرہ لگایا اور اپنی موٹر سائیکلیں اسٹارٹ کرتے ہوئے چاروں کا بے فکرا قہقہہ فضا میں گونج اٹھا۔

☆☆☆

سرمد نے کھانا کھا کر تھوڑی دیر ٹی وی دیکھا پھر تھکن سے چور بدن لیے بستر پر لیٹا تو تھوڑی دیر میں ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا، کبھی کبھار جبلی تقاضوں کے تحت اپنی بیوی سے رومانس بگھارنے کی کوشش کرتا مگر جواباً اس کی حسین و جمیل بیوی اتنی سرد مہری اور رکھائی کا مظاہرہ کرتی کہ وہ بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا، ناچار بیوی کے بجائے کچھ دیر ٹی وی سے دل بہلاتا اور سو جاتا۔

ذرا سی دیر میں اس کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔

"اف!" اس نے انتہائی کوفت اور بے نیازی سے سرمد کو دیکھا۔

سانولا رنگ، عام سے نقوش، عام سا سراپا۔

ہونہہ، نہ جانے میرے باپ نے کیا دیکھا اس فقیر میں۔" اس کی نگاہوں میں تنفر تھا۔

"اپنے اپنے نصیب کی بات ہے، نابینا فقیر کی جھولی میں انتہائی بیش قیمت ہیرا کہیں سے آ گیا اور وہ اس کی قدر و قیمت سے بھی بے خبر ہے، ایسا نایاب ہیرا تو کسی جوہری کے پاس آنا چاہیے تھا، جو اسے بڑی قدر و منزلت اور محبت سے سنبھال کر اس کے شایان شان مقام پر رکھتا۔" اسے جمال کے الفاظ یاد آئے۔

"کتنا مختلف ہے جمال اپنے دوست سے۔" وہ جمال کا موازنہ سرمد سے کرتی تو اسے اپنے شوہر سے نفرت سی ہونے لگتی۔

وہ کچھ اسی قسم کے احساسات سے دوچار تھی جب اس کا موبائل بجا۔

اس نے روشن اسکرین دیکھی، جمال کا فون تھا، وہ موبائل لے کر برآمدے میں آ گئی۔

"میں ابھی آپ ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"زہے نصیب، ان کے پاس نہ سہی، ہم ان کے خیالوں میں تو ہیں۔" اس کی گمبھیر آواز نائلہ کی سماعتوں کو تراوٹ بخش رہی تھی، ایسی باتیں سرمد نے اس سے کبھی نہیں کی تھیں۔

"بائی داوے کیا سوچ رہی تھیں میرے بارے میں؟"

"بس یہی سوچ رہی تھی کہ آپ سرمد سے کتنے مختلف ہیں۔"

"مختلف تو ہوں مگر اس جیسا خوش نصیب تو نہیں، تم جیسا قیمتی ہیرا اس کی دسترس میں ہے۔" جمال گاہے بگاہے گرم لوہے پہ چوٹ مارتا ہی رہتا تھا۔

"خاک میں رلا ملا ہیرا بھلا کس کو نظر آتا ہے۔" نائلہ نے ایک آہ بھری۔

"ہم تو دل و جان سے تیار ہیں اس ہیرے کو کیچڑ سے اٹھا کر اس کے شایان شان مقام پر پہنچائیں۔ اپنے سر کے تاج میں سجائیں۔"

"ہاں، آپ تو جیسے کہیں کے بادشاہ ہیں نا، جو سر کے تاج میں ہیرا لگائیں گے۔" نائلہ ہنسی۔

"جس کے پاس آپ جیسی ہفت اقلیم کی دولت ہوگی، وہ تو بادشاہ ہی ہوگا نا۔"

"ایسی باتیں صرف سوچی ہی جا سکتی ہیں مگر پریکٹیکلی یہ سب کچھ کتنا مشکل ہے۔"

نائلہ یک بیک سنجیدہ ہو گئی، وہ بچی نہیں تھی، جمال کی باتوں اور اس کے مفہوم سے خوب آگاہ تھی، شروع شروع میں، کبھی کبھار اس کا ضمیر ملامت کرتا تھا، مگر اس نے تھپک تھپک کر اسے بھی سلا دیا تھا۔ اب اندر سے کوئی آواز ملامت کی اٹھتی ہی نہیں تھی یا پھر اس نے ہی دھیان دینا چھوڑ دیا تھا۔

"دنیا میں بہت سے کام مشکل ضرور ہوتے ہیں مگر ناممکن نہیں۔"

"مگر اس مشکل کو ممکن کرے گا کون؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے نائلہ، میں تمہارے ساتھ فلرٹ کر رہا ہوں یا ٹائم پاس، تمہیں اس حال میں، اس جگہ دیکھ کر میرا دل کیسے کیسے کڑھتا ہے، جلتا ہے، تمہیں کیا بتاؤں، میرا بس چلے تو تمہیں آن کی آن میں اس کوڑے دان سے اٹھا کر اپنے محل کی زینت بنا لوں، مگر تمہاری مرضی اور تعاون کے بغیر میں کیا کر سکتا ہوں۔" جمال نے بالآخر بلی کو تھیلے سے باہر نکال ہی لیا۔

"میں......" نائلہ نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اس کی نگاہ سامنے گئی، کمرے کے دروازے میں سرمد کھڑا اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

اپنے نرم، ملائم بال سمیٹ کر وہ سرعت سے اٹھی۔

"کیا ہوا؟" طلال نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے بارش ہو رہی ہے۔ آج گھٹا بھی تو چھائی ہوئی تھی نا، چنبیلی نے کھڑکی کا پردہ سمیٹا، باہر واقعی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

"اف، بارش میں تو میری جان ہے۔" اس نے بالکنی کا دروازہ کھولا اور باہر برستی بارش میں اپنی ہتھیلی آگے بڑھا دی۔

"بارش میں کتنا مزا آتا ہے نا۔" بچوں کی سی خوشی اس کے لہجے میں تھی۔

"خالی خولی بارش میں کیا مزا آتا ہے۔ اصل مزا تو بارش میں بھیگنے میں ہے۔" طلال نے اس کے چمکتے بے داغ رخسار پہ انگلی پھیری۔

"میرا دل چاہتا ہے۔ برستی بوندوں کے نیچے کھڑی ہو جاؤں، گول گول گھوموں، رقص کروں، اتنی بھیگوں اتنی بھیگوں کہ تن من سب کی پیاس بجھ جائے۔" چنبیلی جیسے خواب کے سے عالم میں بول رہی تھی، طلال ہنس پڑا۔

"اندر آؤ، پیار کی بارش میں بھیگتے ہیں، تن من سب کی پیاس بجھ جائے گی۔" چنبیلی کا بازو پکڑتے ہوئے اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"اونہوں، چلتے ہیں نا ابھی۔" چنبیلی برستی بوندوں کے خمار میں کھوئی ہوئی تھی۔

"کیوں ٹائم ضائع کر رہی ہے، وہ تیری مہک جان، آفت جان، ایک ایک سیکنڈ کا حساب رکھتی ہے۔" طلال اس کی زلفوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

"چند گھنٹوں کی زندگی ہم کب تک گزارتے رہیں گے، تم اپنے بابا سائیں سے کب بات کرو گے؟" چنبیلی نے برستی بارش سے اپنی ہتھیلی واپس کھینچ لی۔

"بابا سائیں سے؟ ان سے کیا بات کرنی ہے؟" طلال جیسے حیران ہوا۔

‘‘تم نے کہا تھا نا کہ ان سے شادی کی بات کرنی ہے۔’’

‘‘ان سے شادی کی بات؟ یار نشے میں کہا ہوگا۔’’ طلال ہنستے ہنستے دوہرا ہوگیا۔

‘‘کیا مطلب؟’’ چنبیلی نے یک دم خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ کیا وہ بھی کھلونا سمجھ کر اس سے کھیل رہا تھا۔

‘‘مطلب یہ کہ شادی مجھے کرنی ہے، ان سے پوچھ کے کیا کرنا ہے، وہ کون سا ہنسی خوشی اجازت دے دیں گے مجھے، اور ویسے بھی انہوں نے جو درجنوں شادیاں کی ہیں تو مجھ سے پوچھ کے مجھے بتا کر کی ہیں؟’’ طلال تمسخرانہ انداز میں بول رہا تھا۔

‘‘تو پھر......؟’’ چنبیلی نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سوال کیا تھا۔

‘‘تو پھر یہ کہ پہلے اندر چل کر مجھے ایک پیگ بنا کر دے، پھر بتاؤں گا آگے۔’’ طلال کمرے میں آگیا، ناچار وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آگئی۔

‘‘اب بولو۔’’ گلاس میں برف ڈالتے ہوئے اس نے پھر سوال کیا۔

‘‘شادی کرنی ہے نا، کر لیتے ہیں، کل لے آؤں مولوی کو؟’’

‘‘مذاق کر رہے ہو؟’’

‘‘نہیں، بالکل سنجیدہ ہوں۔’’

‘‘تم واقعی شادی کرو گے مجھ سے۔’’ چنبیلی پر جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

‘‘مرد بچہ ہوں زبان دے کر پھروں گا نہیں، جب محبت تجھ سے کی ہے تو شادی بھی کروں گا۔’’ طلال جذباتی لہجے میں ڈائیلاگ بولتے ہوئے اس کے قریب ہوا۔

‘‘پھر کب؟’’ چنبیلی نے گلاس اس کے لبوں سے لگایا۔

‘‘بہت جلد، تیری مہک جان سے تو بات کرنی پڑے گی نا۔’’

‘‘ہاں، اس سے تو بات کرنی پڑے گی۔’’ چنبیلی آنے والے خوش کن لمحات میں گم ہو کر بے خودی میں گویا ہوئی۔

‘‘بے فکر رہ، اس سے بھی بات کر لوں گا۔’’ طلال نے دھیرے دھیرے چسکیاں لیتے ہوئے اسے تسلی دی۔

☆☆☆

‘‘چھوٹی بالٹی میں رسی باندھ کر اس نے اس کی گرہ کو اچھی طرح چیک کیا، جب اسے اطمینان ہوگیا کہ گرہ مضبوط ہے تو بالٹی اس نے ٹینک میں ڈال دی۔ بھری ہوئی بالٹی اوپر کھینچی اور باری باری دونوں کین، ٹب اور بڑی بالٹی بھر کر اس نے آخری بار چھوٹی بالٹی بھر کر نکالی، اسے ایک طرف رکھا اور ٹینک کا ڈھکن بند کرنے لگی۔

‘‘بھر گیا پانی؟’’ امی نماز سے فارغ ہو کر باہر صحن میں آئی تھیں۔

‘‘جی......!’’ عائشہ کی سانس پھول گئی تھی، چارپائی پر بیٹھ کر وہ چہرے کا پسینہ خشک کرنے لگی۔

آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا تھا، سلائی مشین ٹھیک کروائے ہوئے ابھی ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ پانی کی موٹر خراب ہوگئی، پڑوس میں کلثوم خالہ ہی ہمدرد و غم گسار تھیں۔ ان کا بیٹا مکینک کو بلا لایا۔

‘‘پانچ سو کا سامان آئے گا، پانچ سو مزدوری، ایک ہزار کا خرچہ ہے۔’’ مکینک نے پانچ منٹ میں مشین چیک کر کے خرچہ اور مزدوری دونوں بتا دیں۔

‘‘اے بھیا! کچھ کم کر لو، غریب لوگ، ایسے مٹھی بھر رقم کہاں سے لائیں۔’’ بیٹے کے کچھ کہنے سے قبل خالہ کلثوم لجاجت سے مکینک سے مخاطب ہوئیں۔

‘‘چلو خالہ! میری مزدوری میں سے سو روپے کم دے دینا، مگر سامان تو اتنے پیسوں کا ہی منگوانا پڑے گا، میں چیزیں لکھ دیتا ہوں آپ کسی سے بھی منگوا لو۔’’

‘‘پھر؟’’ خالہ کلثوم نے سوالیہ نظروں سے عائشہ کی امی کو دیکھا۔

‘‘نہیں خالہ! فی الحال تو اتنی گنجائش نہیں ہے۔ رہنے دیں، دو تین ہفتے بعد دیکھتے ہیں۔’’ ان کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔

‘‘میں منگوا دیتی ہوں سامان، مزدوری بھی دے دوں گی، جب ہوں جب دے دینا، ابھی تو موٹر ٹھیک کروانا ضروری ہے، پانی کا بڑا مسئلہ ہو جائے گا، اوپر ٹنکی میں کیسے چڑھے گا۔’’ خالہ کلثوم نے پیش کش کی۔

‘‘بہت شکریہ خالہ، پیسے ہو جائیں گے تو میں بعد میں ٹھیک کروا لوں گی۔’’ وہ بڑی متانت سے خالہ کلثوم سے مخاطب ہوئیں۔

‘‘مگر......’’ خالہ کلثوم نے کچھ کہنا چاہا، لیکن خاموش ہو گئیں برسوں پرانا ساتھ تھا، ان کی غیور اور خوددار طبیعت سے خوب واقف تھیں۔

‘‘اب پانی کیسے بھرا جائے گا؟’’ شام میں عائشہ نے سوال اٹھایا۔

‘‘ٹینک میں تو پانی آتا ہے نا، آدھے سے زیادہ ٹینک بھر جاتا ہے، بالٹی میں رسی باندھ کر نکال لیں گے، یہ کین، ٹب اور بالٹی وغیرہ بھر کے اسی سے کام چلا لیں گے، کون سا لمبا چوڑا کنبہ ہے ہمارا، گنے چنے برتن ہوتے ہیں، مختصر سے کپڑے، نل کے بغیر بھی دھل سکتے ہیں۔’’

‘‘خالہ سے لے لیتیں، بعد میں دے دیتے، سلائی کے کپڑے تو آئے ہوئے ہیں۔ مکمل کر کے دے دوں گی تو رقم بھی مل ہی جائے گی۔’’

‘‘وہ تو ٹھیک ہے بیٹا!’’ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

‘‘بس مجھے اچھا نہیں لگتا کسی کے سامنے یوں ہاتھ پھیلانا، اشد مجبوری یا ضرورت کی بات الگ ہے مگر جہاں تک ممکن ہو سکے اس سے بچنا ہی چاہیے۔’’ امی نے سمجھایا۔

‘‘تو ہم کون سا مدد مانگ رہے ہیں، ادھار ہے، بعد میں چکا دیں گے۔’’

‘‘ادھار مانگو یا مدد مانگو، ہاتھ تو پھیلانا ہے نا دوسرے کے سامنے، اللہ بس اپنا محتاج بنائے بندوں کا محتاج نہ بنائے۔’’

‘‘امی جان! آپ بھی نا۔’’ عائشہ مسکرا دی، گو کہ اسے ماں سے اسی قسم کے لیکچر کی توقع تھی مگر پھر بھی ان سے اختلاف کرنے یا بحث کرنے شروع ہو جاتی تھی۔

‘‘کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہی نہیں کہ آپ اسی دنیا کی ہیں۔’’ وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

‘‘ہاں، خلائی مخلوق ہوں میں، کسی دوسرے سیارے سے آئی ہوں۔’’ امی نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

اچھا ناراض تو نہ ہوں، یہ بتائیں فرحانہ آنٹی نے صرف سوٹ دیا ہے، لیس اور پائپن وغیرہ کے لیے پیسے دیے ہیں کہ اپنی مرضی سے خرید کر لگا دو ان کے پچھلے سوٹ میں، میں نے جو ڈیزائننگ کی تھی وہ انہیں بہت پسند آئی تھی، لہٰذا اس بار انہوں نے سب کچھ مجھ پر ہی چھوڑ دیا۔’’

”پھر اب کیا ہوا؟“

”سوٹ میں لگانے کی چیزیں لانی ہیں، اپنی طرف کی مارکیٹ میں تو وہی سستی سستی عام سی لیسیں اور چیزیں ہیں، آگے جانا پڑے گا، سپر مارکیٹ کی طرف۔“

”تو چلی جانا، پہلے بھی تو اکیلے جاتی رہی ہو یا میں ساتھ چلوں؟“ کچھ توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔

”نہیں، جانے کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں تو اکیلی چلی جاؤں گی مگر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، آپ کیسے اکیلے رہیں گی؟“

”ایک آدھ گھنٹے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”پھر بھی۔“

”ارے بھئی...... خالہ کلثوم کو بلا لوں گی۔ وہ بیٹھ جائیں گی میرے پاس۔“ امی نے اسے تسلی دی۔

”اچھا......“ عائشہ نے نیم دلی سے سر ہلایا، دراصل ابھی ان کا موتیا کا آپریشن ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے، اس لیے عائشہ کو ان کی زیادہ فکر تھی، ورنہ عام حالات میں تو عائشہ کے کالج جانے کے بعد وہ آدھا دن اکیلی ہی رہتی تھیں۔

سپر مارکیٹ پہنچنے میں ہی آدھ گھنٹہ لگ گیا پھر چیزوں کا انتخاب، فرحانہ آنٹی، سلائی کا معاوضہ ٹھیک ٹھاک دیتی تھیں، پھر اس اضافی محنت کے لیے بھی عائشہ نے اضافی رقم چارج کی تھی جو وہ بخوشی دینے پر راضی تھیں لہٰذا عائشہ بہتر سے بہترین کی تلاش میں تھی۔

وہ مختلف ڈیزائن کے بٹن نکلوا کر دیکھ رہی تھی، تبھی اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔

دکان کے باہر وہ سامنے ہی کھڑا تھا، دو پرشوق اور والہانہ نظریں اس پر جمی تھیں۔

☆☆☆

وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی یہاں پہنچا تھا اپنے ساتھ لائی ہوئی ڈھیروں چاکلیٹس بچوں میں بانٹ کر اب وہ ان ہی کے درمیان بیٹھا تھا۔

”بھائی جان آپ کہاں رہتے ہیں؟“

”میں اپنے گھر میں۔“

”آپ کا گھر کہاں ہے؟“

”اسی شہر میں۔“

”بتائیں نا، بتائیں نا، بھائی جان؟“ دو، چار بچے اس کے سر ہو گئے۔

”بھئی میرا گھر یہاں سے بہت دور ہے، گاڑی میں آنا پڑتا ہے۔“

”آپ کے گھر میں اور کون کون ہے؟“ ایک نسبتاً بڑے بچے کی طرف سے سوال آیا۔

”میرے چاچا ہیں، میں ان کے ساتھ رہتا ہوں۔“ بڑوں اور ہم عمروں سے لیے دیے رہنے والا، مختصر گفتگو کرنے والا شاہ میر، بچوں کے ہر سوال کا جواب بخوشی دیتا تھا۔

”آپ کے امی، ابو ہیں؟“

”نہیں۔“ اس کے چہرے پہ سختی چھا گئی۔

”مر گئے؟“ بچے کے لہجے میں بے حد مایوسی اور اداسی تھی۔

”ہاں۔“

”آپ کے بہن بھائی ہیں؟“ بچوں کا تجسس ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ہر بار وہ جب بھی آتا اسے اسی طرح کے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا۔

”نہیں۔“

”بھائی جان! آپ جھولا جھولتے ہیں؟“

”جھولا؟“ وہ کچھ سوچتے ہوئے مسکرایا۔

”جھولا تو بچے جھولتے ہیں، جیسے آپ ہیں پیارے پیارے، معصوم سے۔“

”مگر میں تو جھولا جھولتا ہوں، حالانکہ میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں۔“ یہ سات سالہ کاشان تھا جو دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر کے اپنے قد اور عمر دونوں کو لمبا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

”اچھا!“ شاہ میر اس کی معصومانہ حرکت پر مسکرا دیا۔ ”آپ تو اتنے چھوٹے سے ہو، دیکھو میری گود میں آ جاتے ہو۔“ شاہ میر نے اسے اپنی گود میں بٹھایا۔

”مگر شوبی اور فراز سے تو بڑا ہوں نا۔“ وہ جھنجلایا۔

”بالکل بالکل، ان دونوں سے تو آپ بڑے ہیں۔“ شاہ میر نے تائید میں سر ہلایا۔

”بھائی جان، آج مجھے کاپی میں اسٹار ملا تھا اور ٹیچر نے میرے گال پر بھی بنایا تھا۔“ احمر نے بڑی معصومیت سے بولتے ہوئے اپنا گال آگے کیا۔

”ارے واہ، چاند پر ستارا، کتنا پیارا لگ رہا ہے۔“ شاہ میر نے محبت سے اس کے رخسار پہ ہاتھ پھیرا۔

”گڈو اپنے گھر چلا گیا، اس کے پاپا آئے تھے اسے لینے۔“ شاہ میر کو ایک اور اطلاع دی گئی۔

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے، اب وہ اپنے گھر میں اپنے امی پاپا کے ساتھ رہے گا۔“

”میرے پاپا کون ہیں، وہ کب آئیں گے مجھے لینے۔“ احمر نے بھولپن سے اسے دیکھا۔

”آئیں گے بیٹا، آپ کے پاپا بھی آپ کو لینے آئیں گے۔“ شاہ میر نے اسے یونہی تسلی دی۔

احمر کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ کچرے کے ڈھیر پر سے ملا تھا، چاچا نے ہی اس بچے کو یہاں پہنچایا تھا اور تب پہلی بار شاہ میر کا تعارف اس جگہ سے ہوا تھا پہلے وہ کبھی کبھار یہاں آتا تھا، چاچا اپنی آمدنی کا ایک حصہ اس فلاحی ادارے کو دیا کرتے تھے، پھر شاہ میر نے بھی یہی کرنا شروع کر دیا، اب پچھلے دو سالوں سے وہ باقاعدگی سے ہر ماہ یہاں آتا، اپنی اور چاچا کی جمع کردہ مخصوص رقم یہاں دیتا، بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتا اور واپس چلا جاتا۔

”اچھا بھئی بچوں، اب ہم چلتے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”جا رہے ہیں۔“ کچھ بچوں نے مایوسی سے اسے دیکھا۔

”ہاں بیٹا کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ پھر آؤں گا۔“ اس نے باری باری سب کے گال تھپتھپائے۔

واپسی کا سفر اس نے زیادہ تر پیدل طے کیا، ہمیشہ کی طرح ہی یہاں سے واپسی پر اس کا ذہن بوجھل اور مختلف خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

کچرے کے ڈھیر سے ملنے والے بچے تو لاوارث اور بے نام و نشاں ہوتے ہیں مگر کبھی سب رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی بعض بچے لاوارث اور بے نام و نشاں ہو جاتے ہیں، کیا یہ تقدیر ہے یا کچھ اور؟

☆☆☆

فروا اور حمنہ کچن میں ٹرالی سیٹ کر رہی تھیں۔ سب کچھ تیار تھا، چکن رول، کباب، نگٹس، گاجر کا حلوہ، دہی بڑے اور چھولے، بازار سے گلاب جامن اور رس ملائی مانی سے منگوائی تھیں، جنہیں لا کر وہ یہیں کچن میں ان کے سروں پر سوار تھا۔

''یار! کچھ تو چکھا دو، سب کچھ ڈشوں میں پلیٹوں میں انڈیل لیا اور ایسے اپنی حفاظتی تحویل میں لیا ہوا ہے جیسے پولیس خطرناک مجرموں کے گرد پہرہ رکھتی ہے۔'' مانی کی دہائیاں جاری تھیں۔

''اللہ کے رزق کو کیوں خطرناک مجرموں سے تشبیہ دے رہے ہو، اصل خطرناک تو تم ہو تمہارے دست و دہن سے بچا کر رکھی ہیں۔'' ماریہ نے اسے کڑی نظروں سے گھورا۔

''میں بھی اللہ کی بنائی ہوئی ایک معصوم، بے چاری سی مخلوق ہوں کچھ تو رحم کرو مجھ پر دوپہر کو آدھا پیٹ کھانا کھایا تھا اور......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

''آدھا پیٹ؟'' ماریہ کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔

''کچھ تو خوف خدا کرو مانی، ایک ڈش چاول اور ایک ڈونگہ دال تو صرف تم ہی چٹ کر گئے تھے، کباب چار تک تو میں نے گنے تھے اس کے بعد کا نہیں معلوم، چٹنی اچار، سلاد اس کے علاوہ، اور ہاں غالباً تم نے سالن روٹی بھی کھائی تھی، میں تو خیر کھانا کھا کر اٹھ گئی تھی۔'' ماریہ نے اسے لتاڑا۔

''جتنی توجہ تم میرے کھانے پینے پہ رکھتی ہو، اتنی اپنی اسٹڈیز پر دو تو پورے بورڈ میں ٹاپ کرو۔'' مانی نے جوابی وار کیا۔

''میں تو صرف تمہیں یاد دلا رہی ہوں کہ تم نے دوپہر میں کیا کچھ کھایا تھا اور کتنا کھایا تھا تمہاری یادداشت کمزور ہے نا، بھول جاتے ہو۔'' ماریہ نے شان بے نیازی سے جواب دیا۔

''چلو آپی! تم اندر چلنے کی تیاری کرو، یہ لوگ تو ایسے ہی چونچیں لڑاتے رہیں گے۔'' فروا نے حمنہ کو مخاطب کیا۔

''میں کیا کروں گی اندر جا کر، مل تو لی تھی سب سے۔'' حمنہ گڑبڑائی۔

''تو، کیا میں اکیلی یہ ٹرالی لے کر جاؤں، ڈرائنگ روم میں، تم بھی ساتھ چلو، شہروز بھائی سے ہیلو ہائے کر لینا۔'' فروا نے اسے چھیڑا۔

''جی نہیں شکریہ، جب وقت آئے گا تب ہو جائے گی ہیلو ہائے بھی۔'' حمنہ کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

''قسم سے آپی، لگتا ہی نہیں کہ تم نے یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا ہے۔ میٹرک پاس لڑکیوں کی طرح شرما رہی ہو۔''

''لڑکی میٹرک ہو یا ماسٹرز، اپنی شرم وحیا اور رکھ رکھاؤ بھی کوئی چیز ہے۔''

''اچھا جی، آپ یہاں کچن میں بیٹھ کر شرماتی رہیں، میں اور فروا باجی لے جاتے ہیں یہ ٹرالی، اور اگر آپ کا بلاوا آ گیا وہاں سے تو؟'' ماریہ نے دخل اندازی کی۔

''دیکھیں گے۔'' حمنہ مسکرائی۔

''کسے شہروز بھائی کو......؟'' ماریہ کی نظر اک دم مانی پر پڑی۔

''تم باز نہیں آؤ گے؟'' اس نے کباب اٹھانے کی کوشش کرتے مانی کو چمچہ مارا۔

''اف...... میرے کھانے کی دشمن، میری جان کی دشمن، اللہ تجھے سمجھے۔'' مانی بلبلا اٹھا۔

''اب تم لوگ جاؤ بھی۔'' اس بار حمنہ نے ٹوکا۔

''جا رہے ہیں۔'' دونوں جلدی سے ٹرالی دھکیلتی باہر نکل گئیں۔

''آپ ہی کچھ بچا کر رکھ لیتیں میرے لیے، یہ دونوں تو ہٹلر بن جاتی ہیں اسپیشلی ماریہ۔'' مانی نے اپنی غم گسار آپی کے سامنے منہ بسورا۔

''بے فکر رہو، وہ لوگ سب کچھ ختم نہیں کریں گے، کافی کچھ بچ کر آئے گا کھا لینا۔'' حمنہ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے تسلی دی۔

''انتظار...... یہی تو ظالم شے ہے، کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔'' مانی نے ایک آہ بھری۔

''تو تم بھی وہیں بیٹھ جاؤ ڈرائنگ روم میں سب کے ساتھ، وہیں کھا پی لینا۔'' حمنہ نے مشورہ دیا۔

''نہیں بھئی، مہمانوں کے ساتھ ٹھیک سے نہیں کھایا جاتا مجھ سے، وہ بھی پر تکلف، مہمانوں کے سامنے، تھوڑا تھوڑا لو، ذرا ذرا سا کھاؤ، فارمل طریقے سے کھانے میں تو داڑھ بھی گیلی نہیں ہوتی۔'' مانی نے اس کی تجویز یکسر مسترد کر دی۔

''ماریہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔ تم واقعی کھانے کے لیے جیتے ہو۔'' حمنہ ہنس پڑی۔

''خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، جینے کے لیے اور بھی خوب صورت وجوہات ہیں۔''

''وجوہات؟ ایک سے زیادہ ہیں، کیا کیا نام ہیں ان کے؟ حمنہ نے اس کی بات پکڑ لی۔

''سوچ لیں، نام بتا دیا تو اس کے گھر جانا پڑے گا کچھ نہ کچھ فائنل کرنے۔'' مانی نے اپنے دل کی بات اور زندگی کی انتہائی خواہش کو مذاق کا رنگ دیتے ہوئے بیان کیا۔

''چلے جائیں گے، گھر بھی چلے جائیں گے، کچھ نہ کچھ فائنل کر لیں گے، پہلے خود کو کسی قابل تو کر لو میرے چھوٹے سے بھیا جانی!'' حمنہ نے پیار سے اپنے لمبے چوڑے بھائی کو دیکھا جو خود سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ بچہ ہی لگتا تھا۔

''ہائے، قابل ہونے کی بھی خوب کہی آپ نے......

عشق نے غالب نکما کر دیا، ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

''تمہیں تو یہ کہنا چاہیے کہ بھوک نے غالب نکما کر دیا ورنہ......'' حمنہ نے شرارتی انداز میں اسے دیکھا۔

''قسم سے، بالکل ماریہ کی سگی لگ رہی ہیں اس وقت آپ۔'' مانی نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''اچھا چلو تمہاری سگی، بن جاتی ہوں، وہ بھی بالکل سگی والی۔'' حمنہ اٹھی اور فریج سے تین پیالیاں نکال کر اس کے سامنے رکھیں، چھولے، دہی بڑے اور گاجر کا حلوہ۔

''کھا لو، ٹھنڈے نہیں ہیں، دس منٹ بھی نہیں ہوئے فریج میں رکھے ہوئے۔''

''جیو میری آپا!'' مانی کھل اٹھا۔

''چلیں بھئی، آپ کا بلاوا ہے۔'' فروا نے کچن میں آ کر اعلان کیا۔

''اچھا!'' حمنہ نے متذبذب نظروں سے بہن کو دیکھا۔

''چلو نا، اب زیادہ مت شرماؤ، کچھ بعد کے لیے بھی چھوڑ دو۔''

''کون شرما رہا ہے؟'' حمنہ نے اسے گھورا۔

''ہو سکتا ہے مجھے ہی وہم ہو رہا ہو۔'' فروا نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

''ٹھیک لگ رہی ہوں؟'' حمنہ نے لباس کی نادیدہ شکنیں دور کیں اور دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا۔

''ٹھیک؟ ارے تم تو دھلے دھلائے منہ کے ساتھ بھی آفت لگتی ہو۔'' فروا نے اس کے بے داغ، شفاف

اور دلکش نقوش والے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"ویسے لپ، اسٹک لائٹ نہیں ہے، تھوڑی سی ڈارک کر لو۔" فروا نے ساتھ ساتھ مشورہ بھی دے ڈالا۔

"ٹھیک ہے، اب چلو۔" حمنہ چلنے کے لیے تیار تھی۔

"تم بھی آجاؤ، سلام دعا کر کے بھاگ لیے، کچھ دیر تو مہمانوں کے ساتھ بیٹھو، آخر دلہن کے اکلوتے بھائی ہو۔"

"سلام دعا کے علاوہ سب سے گپ شپ کر کے آیا ہوں، پورے پندرہ منٹ بیٹھا تھا۔"

"اچھا!" فروا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"ویسے میں ابھی دوبارہ آ رہا ہوں، تم لوگ چلو۔" مانی نے یقین دلایا۔

"جلدی آجانا، مہمانوں کے جانے سے پہلے۔" فروا نے ایک بار پھر اسے تلقین کی اور حمنہ کے ساتھ باہر نکل گئی۔

"وہ شاپنگ پہ لے جانا چاہ رہے ہیں تمہیں تاکہ تمہاری مرضی اور پسند سے خریداری کر سکیں، اب تم انکار مت کرنا، چپ چاپ شرافت سے چلی جانا اور خوب اچھی اچھی چیزیں لینا۔" کچن سے باہر نکلتے ہی فروا شروع ہو گئی۔

"ہم قناعت پسند لوگ ہیں، ایک اچھی چیز مل رہی ہے، کافی ہے، باقی کپڑے، جوتے، زیور سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اوہو...... تم بھی خاصی چھپی رستم ہو، ہم تو ایویں تمہیں بیبا بی بی سمجھتے رہتے ہیں۔" فروا کی اوہو، کافی لمبی اور معنی خیز تھی۔

دونوں ایک ساتھ ہنس پڑیں۔

☆☆☆

گرم گرم دلیہ سے نکلتی بھاپ کو وہ خاصی دیر سے بڑی ناگواری سے دیکھ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔

"اتنا گرم گرم کھانا دیتی ہیں، کھاؤ اور اپنے منہ کے ساتھ اپنا جی بھی جلاؤ، مجھ سے پانچ منٹ بیٹھنا بھی مشکل ہوتا ہے، اب اس دلیہ کو لے کر ایک گھنٹہ تک بیٹھے رہو۔" بڑی بی کی شکن آلود پیشانی پر مزید دو چار بل پڑ گئے تھے۔

"کہاں مر گئیں سب کی سب؟" کچھ دیر بعد وہ غصے کے عالم میں اتنی زور سے چیخیں کہ کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا، کھانستے کھانستے وہ دوہری ہو گئیں۔

"ارے، کیا ہوا؟" بہری بوا، بھاگی بھاگی آئیں۔

"آ، آ کھوں کھوں......" بڑی بی نے بے بسی سے ہاتھ ہلایا، کھانسی کی وجہ سے آنکھیں باہر ابل آئی تھیں، زور اتنا تھا کہ ان سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

"یہ لو پانی پیو۔" بوا نے جلدی سے پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔ ان کی کمر سہلائی۔

کچھ دیر بعد ان کی جان میں جان آئی، تکیے سے ٹیک لگا کر وہ گہرے گہرے سانس لیتی رہیں۔

"پھندا لگ گیا کھاتے میں؟" بہری بوا نے ہمدردی سے انہیں دیکھتے ہوئے قیاس آرائی کی۔

"کھایا ہی کب تھا جو پھندا لگے۔" وہ بدمزاجی سے گویا ہوئیں۔

"اتنا گرم گرم بھاپ نکلتا کھانا، کھایا جاتا ہے مجھ سے؟" ان کا چڑچڑا پن ہمیشہ کی طرح اپنے عروج پر تھا۔

"لاؤ میں ٹھنڈا کر دوں۔" بوا نے دلیے کا پیالہ اپنے آگے رکھا اور چمچہ چلا چلا کر اس کی بھاپ نکالنے لگیں، جو ویسے بھی اب تقریباً معدوم ہوتی جا رہی تھی۔

"یہ لو کھاؤ۔" کچھ دیر بعد انہوں نے پیالہ واپس بڑی بی کے سامنے رکھا۔

بڑی بی نے دلیے کا چمچہ بھر کر منہ میں رکھا اور خالی چمچہ واپس پیالے میں پٹخ دیا۔ "نہ نمک، نہ مرچ، میں کیا بیمار ہوں جو مجھے ایسے ابال کے راتب دے دیتے ہو۔"

"میں نے ہی پکایا تھا ہلکے نمک مرچ کا، ڈاکٹر نے منع کیا ہے، زیادہ مرچ مسالے نقصان کریں گے تمہیں۔" بوا نے صفائی پیش کی۔

"نہ، میری صحت کو نقصان ہو گا تو کیا ہو گا؟ زیادہ سے زیادہ مر جاؤں گی، اچھا ہے دم نکل جائے جلد سے جلد، سترہ سال سے کون سی زندہ ہوں۔" بڑی بی کا زخم آج بھی ویسے ہی تازہ تھا، درد کی تکلیف تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

جیسے تیسے انہوں نے دلیہ زہر مار کیا مگر اس دوران ان کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ پتا نہیں، کہاں ہو گا کس حال میں ہو گا، بچے بھی اب تو بڑے ہو گئے ہوں گے، ایسا گیا کہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لی، ایک بار آ کر صورت دکھا جاتا موت تو سکون سے آجاتی، نہ جانے کبھی ان سب کو دیکھنا نصیب ہو گا یا اسی انتظار میں ہی دم نکل جائے گا۔"

وہ چپ چاپ ساکت بیٹھی خلا میں گھور رہی تھیں، بوا نے ان کے آگے سے کھانے کی ٹرے اٹھاتے ہوئے تاسف سے دیکھا۔

"بے چاری، دو اولادیں، دونوں ہی ناکارہ نکلیں، کسی سے سکھ نہ ملا۔"

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

میرے خواب لوٹا دو
نگہت عبداللہ
قیمت -/400 روپے

کسی راستے کی تلاش میں
میمونہ خورشید علی
قیمت -/350 روپے

اُجالوں کی بستی
فاخرہ جبیں
قیمت -/400 روپے

ایک میں اور ایک تم
تنزیلہ ریاض
قیمت -/350 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

☆☆☆

”کیا ہوا؟ تم سوئی نہیں اب تک؟“ سرمد اپنی نیند سے بھری آنکھیں مسل کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں...... وہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی تو میں باہر آ گئی، گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی کمرے میں۔ یہاں بھی بے چینی سی ہو رہی تھی تو موبائل پہ گیم کھیلنے لگی۔“ نائلہ نے سوچ سوچ کر بولتے ہوئے اسے چور نظروں سے دیکھا۔

”ا...... اچھا!“ اس نے ایک زوردار جمائی لی۔

”میں کھڑکی کھول دیتا ہوں کمرے کی، گھٹن کچھ دور ہو جائے گی۔“

”رہنے دو، کیا گھٹن دور ہوگی، باہر بھی حبس ہو رہا ہے، ہوا ہوگی تو اندر آئے گی نا، اے سی ہوتا تو اس گرمی اور گھٹن سے کچھ نجات ملتی۔“

نائلہ کو اطمینان ہوا کہ سرمد نے نہ کچھ دیکھا ہے نہ کچھ سنا تو وہ اپنے فطری رنگ میں واپس آ کر چمک کر بولی، رات کے اس پہر اسے ریسٹورنٹ کی ٹھنڈی، مہکتی، خوش گوار فضا یاد آ رہی تھی۔

”کرائے کے گھر میں ایئر کنڈیشن کیسے لگواؤں، سو سو اعتراض کریں گے پھر بجلی کا سارا بل ہمارے متھے مار دیں گے، اپنا گھر ہوگا تو ان شاء اللہ ہر سہولت اور آرام کی چیز آ جائے گی۔“ سرمد نے نرم لہجے میں بولتے ہوئے اسے بہلانے کی کوشش کی۔

”اونہہ! اپنا گھر، بڑھاپا آ جائے گا، یہی خواب دیکھتے دیکھتے، چند ہزار کی نوکری میں گھر چلاؤ گے یا گھر بنانے کے لیے جمع کرو گے، جتنی تمہاری بچت ہے اس میں تو قبر کی جگہ بھی نہیں ملے گی۔“ نائلہ تلخ ہوتی ہوئی اندر چلی گئی۔

اس کی باتیں اور رویہ سرمد کے ساتھ عموماً ایسا ہی رہتا تھا، انتہائی بے زار کن، تلخی آمیز بلکہ کسی حد تک ہتک آمیز، اوپر سے سرمد کی نرم مزاجی اور جی حضوری کی عادت اسے اور مشتعل کر دیتی۔

اس کی جگہ کوئی تیج مرد ہوتا تو اتنی بے عزتی پر کیا سے کیا کر دیتا یہ تو اور پاؤں کے تلوے چاٹنے لگتا ہے آخ تھو، نائلہ کو اب اپنے شوہر سے گھن آنے لگی تھی۔

☆☆☆

چاچا نے آج بازار سے کھانا لانے کے بجائے خود ہی مرغی بھونی تھی۔

”بازار کا کھا کھا کر دل اکتا جاتا ہے، کبھی گھر کا پکا سالن بھی کھانا چاہیے ’ہے نا!“ چاچا شاہ میر سے مخاطب ہوئے۔

”ہوں!“ وہ جانے کن خیالات میں گم دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے پلنگ پر لیٹا تھا۔

”کیا ہوا پتر، خیر تو ہے؟“

”ہاں چاچا، سب خیر ہے۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”ہنسا بولا کر بیٹا، دل کی باتیں دل میں رکھنے سے اندر کی گھٹن بڑھتی ہے۔“ چاچا اپنے پلنگ پر پاؤں سمیٹ کر بیٹھ گئے۔

”ایک بات بتاؤ چاچا؟“ شاہ میر بہت دیر بعد بولا جیسے سوچ رہا ہو کہ کچھ کہے یا نہ کہے۔

”بول پتر۔“

”چاچا، لوگ اپنی اولاد کو خود سے جدا کیسے کر لیتے ہیں، کوئی کیچڑ کے ڈھیر میں ڈال دیتا ہے کوئی سڑکوں پر رلنے چھوڑ دیتا ہے۔“

شاہ میر نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں ورنہ چاچا دیکھتا کہ شدت ضبط سے اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں جیسے دل کے زخم کا کوئی ٹانکا ادھڑ گیا ہو اور بہتا ہوا خون آنکھوں میں جمع ہو رہا ہو۔

”بیٹا جی، میں تو جاہل، کم علم سا بندہ ہوں، بڑی بڑی علمی اور کتابی باتیں نہیں جانتا پر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب بندہ اپنے خالق کے بجائے اپنے جیسی مخلوق سے زیادہ ڈرنے لگتا ہے تو فساد پھیلنے لگ جاتا ہے، آفتیں بھی آنے لگتی ہیں اور قیامتیں بھی۔“ چاچا نے سوچ سوچ کر جواب دیا۔

”لوگ گناہ کرتے وقت اللہ سے نہیں ڈرتے، بعد میں بندوں کے خوف سے مزید گناہ کرتے ہیں دونوں مواقع پر انسان جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔“ شہروز کی آواز بھاری ہونے لگی۔

”یہی دنیا ہے بچے! تو چھوڑ یہ کن باتوں میں پڑ گیا، میں روٹی لے آتا ہوں گرم گرم کھانا کھا لیتے ہیں۔“ چاچا نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

”ابھی بھوک نہیں ہے مجھے، آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی، آپ کھانا کھا لیں۔“

”لے پتر، یہ ہو سکتا ہے کہ تو بھوکا بیٹھا رہے اور میں کھانا کھا لوں!“

”میرا اتنا خیال مت رکھا کریں چاچا!“ شاہ میر کی آنکھوں کی نمی، اس کے لہجے میں بھی آ گئی تھی۔

”بس شروع ہو گئیں تیری فضول باتیں، پتا نہیں کیا کیا سوچتا رہتا ہے ہر وقت، آج کل کے لڑکوں والی کوئی بات ہی نہیں۔“ چاچا نے خفگی سے اسے دیکھا۔

”میں آج کل کا لڑکا ہوں کب، میں تو کوئی بھولی بھٹکی روح ہوں، جو ادھر ادھر چکراتی ہوئی اپنے اصل کو، اپنے مرکز کو کھوجتی پھر رہی ہے مگر، ہنوز ناکام و نامراد بے نام و بے نشان۔“ شاہ میر کے اندر کی تلخی بڑھنے لگی۔

”ملک صاحب کئی بار فون کر چکے ہیں۔“

”ہوں!“ شاہ میر نے ان کی بات پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔

”اچھی خاصی اجرت پر بلا رہے ہیں، تیرا کام ان کے دل کو بھا گیا، اب روزانہ مجھے فون کر کے زور دیتے رہتے ہیں، شاہ میر کو میرے پاس بھیج دیں منہ مانگا معاوضہ دوں گا، تو چلا کیوں نہیں جاتا وہاں، روزانہ بلا بھی نہیں رہے، ہفتے میں تین دن مانگ رہے ہیں بس۔“

”میں یہیں ٹھیک ہوں چاچا تمہارے ساتھ، تمہارے پاس، اور کہیں جانے کو میرا دل نہیں چاہتا۔“

”بیٹا جی! ہر کام دل کے کہنے پر نہیں کرتے، کبھی بڑوں کی بات بھی مان لیتے ہیں اب چاچا کی انگلی چھوڑ کر ادھر ادھر بھی جا، دنیا دیکھ، اس کے رنگ دیکھ، ایک کونے میں منہ دے کر بیٹھ جانے سے کسی مسئلے کا حل نہیں نکلتا، نہ تن کا نہ من کا۔“ چاچا نے اسے ہمیشہ کی طرح سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو کیا دنیا کا سامنا کرنے سے مسائل کا حل نکل آئے گا؟“ شاہ میر نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”دنیا کا سامنا کرنے سے، دنیا کی، لوگوں کی سمجھ آتی ہے جھلے، پتا چلتا ہے، ہم سے بھی زیادہ محروم، بدقسمت اور دکھی لوگ ہیں دنیا میں۔“

”میں کیا کروں گا یہ جان کر، کسی کو مصیبت میں دیکھ کر اپنی اذیت کم تھوڑی ہو جاتی ہے۔“

”اوئے پاگل خانے، اپنی اذیت کم نہیں ہوتی پر بندے کو صبر آ جاتا ہے۔“

”پتا نہیں چاچا! یہ صبر کیا ہے مجبوری، کمزوری یا کچھ اور۔“

”پتر، یہ اللہ کی مرضی ہے، جس پر بندہ بھی راضی ہو جائے تو سمجھو اس کا بیڑا پار۔“

”چاچا، صبر زندگی میں کیا جاتا ہے نہ کہ زندگی پر۔“ شاہ میر نے گہرے لہجے میں گہری بات کی اور پھر خاموش ہو گیا، چاچا بھی خاموش تھے، ان کے پاس بھی کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

"چل پتر! میں روٹیاں لا رہا ہوں، پھر دونوں مل کر کھانا کھاتے ہیں۔" کچھ دیر کی چپ کے بعد چاچا اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

عائشہ نے اس طرف سے رخ موڑ کر اپنی توجہ خریداری پر مرکوز کرنے کی کوشش کی، کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے تھی، فرحانہ آنٹی معاوضے کی ادائیگی میں جتنی فراخ دل تھیں، سوٹ میں کوئی کمی بیشی ہونے پر باتیں بھی اتنی ہی سناتی تھیں۔

خریدی ہوئی اشیاء کا شاپر ہاتھ میں لیے وہ باہر آئی اور چاروں طرف ایک نگاہ دوڑائی، وہ کہیں نظر نہیں آیا، عائشہ کے دھڑکتے دل کو کچھ اطمینان ہوا دھڑکن جو غیر معمولی ہو چلی تھی، کچھ اعتدال میں آگئی۔

سڑک پار کر کے کچھ دور چل کر کھڑی ہو گئی جہاں اس کی مطلوبہ ویگن کو آنا تھا۔ اس کے روٹ کی دو ویگنیں آئیں مگر اتنی بھری ہوئی کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، دونوں بار وہ مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گئی، آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا اسے کھڑے ہوئے ابھی تک تیسری ویگن کے کوئی آثار نہ تھے۔ تب ہی اس کی گاڑی آ کر عائشہ کے سامنے رکی۔

"آیئے میں ڈراپ کر دیتا ہوں آپ کو۔" آج پہلی بار وہ اس سے یوں براہ راست ہم کلام تھا۔

"جی نہیں شکریہ، میں چلی جاؤں گی۔" عائشہ نے کچھ سٹ پٹا کر اور کچھ گھبرا کر اس کو جواب دیا۔

"آپ اتفاقاً مجھے یہاں نظر آ گئیں، میں وہاں کھڑا تھا اپنی گاڑی لیے غالباً پچھلے آدھا گھنٹے سے یہاں کھڑی ہیں، شام کا وقت ہے، گاڑیاں ایک تو بہت دیر سے آئیں گی اور وہ بھی بہت بھری ہوئی، تھوڑی دیر میں مغرب ہو جائے گی، آپ کی امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ آپ جہاں کہیں میں ڈراپ کر دیتا ہوں، جہاں سے آپ آسانی کے ساتھ اپنے گھر پہنچ سکیں۔" مانی کا لہجہ ہموار اور پرخلوص تھا مگر عائشہ نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔

"گاڑی ابھی آ جائے گی، میں چلی جاؤں گی۔"

"پچھلے مین روڈ پر بدترین ٹریفک جام ہے، وہیں سے آپ کی گاڑی بھی آئے گی، دیکھیں کب آتی ہے اور کتنی بھری ہوئی۔" مانی بدستور آہستگی اور نرمی سے بات کر رہا تھا۔

"کیا کروں؟" عائشہ نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے بے بسی سے اسے دیکھا۔

اسے امی کی بھی فکر ہو رہی تھی، ایک تو بازار میں وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا، اور پھر اسٹاپ پہ کھڑے کھڑے آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا، دیر تو واقعی بہت ہو چکی تھی۔

"پتا نہیں امی نے کلثوم خالہ کو بلوایا بھی ہوگا یا یونہی اکیلی بیٹھی ہوں گی۔" ان کا اکثر بی پی اتنا لو ہو جاتا تھا کہ غنودگی کی کیفیت ان پہ طاری ہو جاتی تھی۔

عائشہ پہ اک دم گھبراہٹ طاری ہونے لگی، اس نے اپنی رسٹ واچ پہ نگاہ دوڑائی، اسے گھر سے نکلے تقریباً ڈھائی گھنٹے ہو چکے تھے پھر واپسی کا ابھی تک کچھ پتا نہیں تھا کب ویگن آئے گی اور کب وہ گھر پہنچے گی۔

"آیئے۔" مانی نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

"مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ امی گھر پر اکیلی ہیں ان کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔" عائشہ نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے جانے خود کلامی کی، یا اس کی پیش کش قبول کرنے پر اپنی صفائی پیش کی۔

"آپ کو وضاحتیں دینے کی ضرورت نہیں، کیا میں جانتا نہیں ہوں آپ کو۔"

مانی نے اس کی طرف دیکھے بغیر اگنیشن میں چابی گھمائی اس نے دانستہ عائشہ کی جانب دیکھنے سے گریز کیا، جانتا تھا کہ وہ ویسے ہی بہت کنفیوز ہو رہی ہے، اس کے ایک نظر دیکھنے پر جانے کتنا گھبراتی۔

امی ماریہ کے ساتھ مارکیٹ آئی تھیں، اپنا اور دادی کا جوڑا خریدنا تھا ماریہ کو بھی کچھ چھوٹی موٹی چیزیں چاہیے تھیں، سامنے سڑک پر سے آتے ہوئے ان کی نگاہ اچانک ہی سفید شیراڈ پر پڑی، لڑکی نے کسی حد تک چادر کے پلو سے منہ چھپایا ہوا تھا پھر وہ اپنا چہرہ بھی نیچے کیے بیٹھی تھی مگر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اپنے لاڈلے بیٹے کو انہوں نے دیکھ لیا تھا۔

"یہ مانی کس لڑکی کو گاڑی میں بٹھائے گھوم رہا ہے۔" انہوں نے بے یقینی سے بڑبڑاتے ہوئے دور جاتی گاڑی کو مڑ کر دیکھا۔

☆☆☆

بڑے سے ہال کے ایک سرے پر گول ستون کے ساتھ گاؤ تکیہ لگائے وہ بڑے ٹھسے سے براجمان تھی، جدید فیشن، کا سلا بائل کریم رنگ کا جوڑا، خوب گہرا میک اپ اور بالوں میں گلاب کا پھول۔

قدیمی وضع کے بھاری بھرکم چاندی کے پاندان کا ڈھکن اٹھا کر مہک جان نے تھوڑا سا سونف کھوپرا لے کر پھانکا اور منہ چلاتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"ہاں جناب، کہیے کیا بات ہے؟"

"کہہ تو چکا ہوں اور کیسے کہوں؟" طلال جھنجھلایا۔

"بات سنو جاگیردار صاحب! ابھی تو تم بڑے جوش و جذبے میں ہو — محبت، بہت اچھا لگتا ہے یہ لفظ، شادی کا لفظ اس سے بھی زیادہ اچھا ہے، محبت کر لی اب شادی کر کے لے جاؤ گے، کچھ عرصے بعد جب تمہارا دل بھر جائے گا محبت سے بھی، شادی سے بھی، پھر؟ پھر کیا کرو گے۔"

"فضول باتیں کیوں کر رہی ہے مہک جان، جب شادی کر رہا ہوں اس سے، اپنی عزت بنا رہا ہوں تو چھوڑنے کا کیا سوال؟" طلال نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کی مگر اس کے چہرے اور لہجے سے ناگواری صاف واضح تھی۔

"یہ فضول بات نہیں ہے، عمر بھر کا تجربہ ہے۔" مہک جان نے اپنی تجربہ کار نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کیں۔

"یہاں بہت کہانیاں ہوئی ہیں ایسی، لوگ محبت کے دعوے کرتے ہیں، شادی کے وعدے کرتے ہیں، سچ مچ بیاہ کر لے بھی جاتے ہیں مگر بعد میں اس رشتے کو نہیں نبھاتے، یہاں سے جانے والیاں یہیں واپس آ جاتی ہیں۔"

"اب میں تجھے کیسے یقین دلاؤں کہ یہ سب اس بار نہیں ہوگا۔" طلال کا جاگیردارانہ خون کنپٹیوں پہ ٹھوکریں مار رہا تھا، اس نے کب ایسے دو ٹکے کے لوگوں کے سامنے منتیں کی تھیں، اس عورت کے تو مزاج ہی نہیں مل رہے تھے، طلال نے ہمیشہ اپنے آگے جھکے ہوئے سر دیکھے تھے، جی حضوری والے سر خوشامدی سر یا مجبور گردنیں، یہ عورت تو اس کے صبر و ضبط کا امتحان لے رہی تھی، وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

"کیا گارنٹی چاہیے تجھے، جتنا حق مہر لکھوانا ہے، لکھوا لے، کچھ اور لکھوانا ہے، زمین، جائیداد، سونا تو وہ بھی لکھ دوں گا۔" طلال کوئی دودھ پیتا بچہ یا اس کوچے میں نووارد تو تھا نہیں، گھاگ اور شاطر کھلاڑی تھا، صحیح اور دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا تھا اس نے۔

مہک جان نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ سامنے سے آتے شمسو کو دیکھ کر اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"کیا ہے؟ منع کیا ہے نا تجھے، یہ مصروفیت کا ٹائم ہوتا ہے اس وقت یہاں نہ آیا کر۔" وہ کڑے تیوروں کے

ساتھ اس سے مخاطب ہوئی۔

"کام سے آیا تھا۔" وہ منمنایا۔

"کس کام سے؟" مہک جان غرائی، اسے خوب اندازہ تھا کہ وہ اس وقت یہاں کس کام سے آیا تھا۔

"دو ہزار کی ضرورت پڑ گئی ہے، بہت ارجنٹ ہے۔" وہ ہاتھ ملتا ہوا بول رہا تھا۔

"کیوں، تیرے جواری دوست تیرے پیچھے پیچھے آرہے ہیں تقاضا کرتے ہوئے؟"

"یہ بات نہیں ہے، تو اس وقت دے دے میں شام میں تجھے واپس کر دوں گا۔"

"کہاں سے واپس کرے گا، تیری کوئی اور لگائی بھی ہے جو کما کر تجھے دے گی پھر تو مجھے واپس کرے گا۔" مہک نے استہزائیہ انداز میں بولتے ہوئے اسے جوتا کھینچ مارا تھا مگر وہ بھی بلا کا ڈھیٹ تھا، مہک جان کتنی ہی گالیاں دے دیتی، کیسا ہی جوتا اسے کھینچ مارتی، وہ ایسا چکنا گھڑا تھا کہ ہر گالی، ہر طعنہ، ہر جوتا پانی کی بوند کی طرح اس گھڑے پر سے پھسل جاتا۔

"دے دے نا، تیرا بھی ٹائم خراب ہو رہا ہے بحث بازی میں۔" شمسو نے کن انکھیوں سے طلال کی جانب دیکھا جو ماتھے پہ بل ڈالے بیزاری کے عالم میں بیٹھا تھا۔

"میرا اس وقت دماغ خراب ہو رہا ہے اور اس سے پہلے کہ مزید خراب ہو تو سیدھے سیدھے یہاں سے دفعان ہو جا۔" مہک جان اسے گھورتے ہوئے غرائی۔

"پیسے تو دے دے، قسم اللہ پاک کی رات تک لوٹا دوں گا۔" وہ ڈھیٹ بنا پھر گڑگڑایا۔

"نہ وہ رات کبھی آئے گی نہ دن، جب تو مجھ سے لیے ہوئے پیسے مجھے واپس کرے، میں دو ہزار تو کیا دو روپے نہیں دینے کی۔ شرافت سے شکل گم کرلے اپنی۔"

"جان، میں نے پیسے نہیں دیے تو وہ کمینے مار مار کر میری ہڈی پسلی ایک کر دیں گے، میری مدد کردے خدا کے واسطے۔" شمسو روہانسا ہو گیا، پتلی پتلی کلائیوں والے سوکھے سیاہ استخوانی ہاتھ بھیک منگوں کی طرح مہک جان کے سامنے پھیلے تھے۔

"وہ لوگ تو ہڈی پسلی بعد میں ایک کریں گے ابھی میرا متھا پھر گیا تو پہلے میں تیری ہڈی پسلی ایک کر دوں گی۔" مہک جان اس کی رگ رگ سے واقف تھی وہ اسی طرح جوئے میں رقوم ہار کر آجاتا اور پھر اس کی منت سماجت کرتا۔ شمسو نے کچھ کہنا چاہا مگر اس سے پہلے طلال کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، اس نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ہزار ہزار کے دو نوٹ نکال کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر پٹخے۔

"یہ لو، اور اب ذرا مجھے بات کرنے دو۔"

"مہربانی سائیں، اللہ آپ کے دل کی ہر مراد پوری کرے، ساری خوشیاں دے۔" شمسو کی باچھیں کھل گئیں، نوٹ مٹھی میں دبائے وہ بڑی تیزی سے واپس ہوا تھا، کچھ بعید نہ تھا کہ مہک جان اس سے یہ نوٹ چھین لیتی۔

"ہاں اب کہو؟" طلال اس سے مخاطب ہوا۔

"کچھ نہ کچھ تو لڑکی کے نام کرنا پڑے گا، اس کے بغیر تو بات نہیں بنے گی۔" مہک جان نے سیدھی سیدھی بات کی۔

"کیا نام کرنا ہے؟"

"اگلے ہفتے بتاؤں گی۔"

"کیوں، ایک ہفتہ لگے گا کیا لسٹ بنانے میں؟"

"ایسے فیصلے ایک دو دن میں نہیں ہو جاتے، سوچ سمجھ کر کیے جاتے ہیں۔"

"ایک ہفتے میں جواب دو یا دو ہفتے میں، بس ہاں ہونی چاہیے۔" طلال کے سادہ سے لب و لہجے میں دھمکی پوشیدہ تھی۔

"دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں ہے، کہہ تو دیا کہ اگلے ہفتے جواب مل جائے گا۔" مہک جان نے بمشکل اپنے غصے کو کنٹرول کیا۔

"جدی پشتی جاگیرزادہ ہوں، نہ سننے کی عادت نہیں ہے۔" طلال نے بیٹھے بیٹھے اپنی مونچھیں مروڑیں۔

"یہاں سب جاگیرزادے اور رئیس زادے ہی آتے ہیں، کنگلوں کا یہاں کیا کام۔" مہک جان نے جیسے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

"ویسے تو ہے بڑی چیز، ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتی اب بھی، جوانی میں کیا شے ہوگی؟" طلال نے قہقہہ لگا کر اسے دیکھا۔

"ہا......لاکھ تھی، اب تو خاک ہو گئی، مٹی میں رل مل گئی۔" مہک جان نے ایک آہ بھری۔

"شوہر بھی تو ایسا پالا ہوا ہے چوہے جیسا، تجھے کتر کتر کھا جائے گا کسی دن، کوئی ڈھنگ کا بندہ ہی پکڑ لیتی، تیرے آگے پیچھے تو بہت ہوں گے۔" طلال نے یونہی لطف لیا اس سے۔

"میرا میاں چوہے جیسا ہے یا ببر شیر جیسا، کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔" مہک جان نے ناگواری سے بولتے ہوئے کھٹاک سے پاندان کا ڈھکن اٹھایا۔

"تیرا غصہ بھی جچتا ہے تجھ پر۔" طلال ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"پھر اگلے ہفتے آؤں گا، فائنل کر دینا بس۔"

"ہاں ہاں ہو جائے گا۔" مہک جان نے ہاتھ ہلایا۔

☆☆☆

عشاء کی نماز کے بعد بھی وہ کچھ دیر مسجد میں ہی رکے رہے، کچھ انتظامی اور مالی معاملات دیکھنے تھے، عہدہ اور ذمے داری بڑی بری شے ہے، بندہ فرض شناس اور ایمان دار ہو تو دن کا سکون اور راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ جب سے وہ مسجد کمیٹی کے صدر بنے تھے، پانچوں وقت کی نمازوں کے علاوہ بھی ان کا بیشتر وقت مسجد اور اس کے معاملات میں گزرنے لگا تھا۔

اس وقت ان کے ہمراہ واسطی صاحب تھے، مسجد کمیٹی کے رکن، مالی معاملات انہی کے ذمے تھے، چندے کی رقوم اور اخراجات کا حساب کتاب کر کے وہ دونوں ایک ساتھ ہی مسجد سے باہر نکلے تھے۔

"آجائیں سید صاحب، چائے کا ایک کپ ہو جائے۔" واسطی صاحب کا گھر پہلے پڑتا تھا، اپنا گھر آنے سے پہلے ہی انہوں نے پیش کش کر دی۔

"چائے تو ہم کھانے کے بعد پئیں گے۔" سید صاحب مبہم سا مسکرائے۔

"ارے آپ نے کھانا نہیں کھایا اب تک؟" وہ چونکے۔

"ہاں اب اکثر دیر ہی ہو جاتی ہے، کام والی جس دن چھٹی کر لے اس دن پریشانی ہو جاتی ہے، لڑکا بھی آج کل دیر سے آنے لگا ہے، وہ آتا ہے تو بازار سے کھانے پینے کے لیے کچھ ساتھ لے آتا ہے، پھر ہم دونوں کھاتے ہیں۔"

"صاحب عورت کے بغیر، گھر، گھر نہیں رہتا، سرائے خانہ بن جاتا ہے، ویسے آپ کی بیگم کو گزرے کتنا عرصہ ہو گیا تقریباً۔"

''پانچ سال ہوگئے۔'' سید صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کی صحت بھی ماشاءاللہ اچھی ہے اور کاٹھی بھی، آپ نکاح کیوں نہیں کر لیتے، گھر میں بیوی ہو تو انسان کتنے ہی جھنجھٹوں سے آزاد رہتا ہے۔'' واسطی صاحب نے مشورہ دیا۔

''اب ہماری عمر کہاں شادی کرنے کی، اب تو بچوں کی شادی کا وقت ہے بیٹے کے لیے کوئی مناسب گھرانا مل جائے تو بہو گھر لے آئیں۔''

''عمر کی بھی آپ نے خوب کہی، مرد بھی بھلا کبھی بوڑھا ہوتا ہے، اپنے احتشام صاحب کو نہیں دیکھ رہے آپ، کچھ نہیں تو ستر کے پیٹے میں تو ہوں گے بیگم کے انتقال کو برس بھی نہ گزرا اور دوسرا نکاح کر لیا، ماشاءاللہ خوب گزر رہی ہے۔'' واسطی صاحب نے انہیں قائل کرنے کے لیے مثال دی۔

''اپنے اپنے مزاج کی بات ہے واسطی صاحب، اب تو بس جو رہ گئی ہے خیریت سے گزر جائے۔'' سید صاحب بولتے ہوئے ٹھہر گئے، واسطی صاحب کا گھر آ گیا تھا۔

''اچھا جی، جیسے آپ خوش، چلیں پھر کل ملاقات ہوتی ہے ان شاءاللہ، خدا حافظ۔''

''خدا حافظ......''

☆☆☆

آج جو خوشی اور سرشاری اس پر طاری تھی وہ پہلے شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔

''اف......!'' مانی جانے کیا سوچ سوچ کر مسکرا رہا تھا، مگر اس کی ساری ترنگ خوشی اور سرشاری اڑن چھو ہو گئی، رات میں امی نے عدالت سجائی ہوئی تھی، اس عدالت میں دو ہی افراد تھے، ایک وہ خود اور دوسرا ملزم مانی۔

''تمہارے ساتھ وہ لڑکی کون تھی آج، گاڑی میں؟'' امی کڑے تیوروں کے ساتھ اس سے مخاطب تھیں۔

''لڑکی......کون لڑکی؟'' مانی ایک دم گڑبڑا گیا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پہلی بار ہی وہ یوں پکڑا جائے گا۔

''سپر مارکیٹ میں شام کے وقت۔'' امی نے مختصراً اسے جائے وقوع اور درست وقت بتایا۔

''وہ......وہ......وہ۔'' مانی نے بہت لمبی، وہ کرتے ہوئے سر کھجایا اور پھر سوچ کر جواب دیا۔

''وہ، میرے دوست کی بہن تھی، اتفاقاً وہاں ملاقات ہو گئی، اس کے روٹ کی ویگن ٹریفک جام میں پھنسی ہوئی تھی، وہ بہت لیٹ ہو رہی تھی اس لیے میں نے اسے لفٹ دے دی تھی۔'' مانی نے سوائے پہلے فقرے کے، باقی سب کچھ سچ ہی کہا تھا۔

''کون سے دوست کون سی بہن تھی؟'' امی تفتیش کے موڈ میں تھیں۔

''آپ میرے سارے دوستوں کو کہاں جانتی ہیں؟'' وہ جھنجھلایا۔

''تقریباً سب ہی کو جانتی ہوں البتہ کوئی نیا دوست آج شام میں ہی بنا ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتی۔'' عالیہ بیگم بھی اس کی ماں تھیں، وہ سیر تو وہ سوا سیر۔

''میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟''

''شک تو یہی ہے۔''

''اب کیسے یقین دلاؤں آپ کو؟''

''ماریہ تو کچھ اور کہہ رہی تھی۔''

''کیا؟'' مانی کا ردعمل بے ساختہ تھا۔

''وہ بتا رہی تھی کہ اس لڑکی کو جانتی ہے۔''

''ماریہ کی بچی، ضرور میرے ہاتھوں جان سے جائے گی۔'' مانی نے دانت کچکچائے اور بے بسی سے ماں کو دیکھنے لگا۔

''اب بولو۔'' وہ غور سے مانی کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھیں۔

''میں کچھ نہیں بول رہا۔'' مانی کسی کھسیائے ہوئے بچے کی طرح ڈھیلے پن سے بولا۔

''سڑکوں پہ رکشے، ٹیکسیاں بھی ہوتے ہیں، کوئی بھی اپنے گھر جلدی پہنچنے کے لیے انہیں استعمال کر سکتا ہے، اس کے لیے کسی لڑکے کی گاڑی میں بیٹھنا ضروری نہیں۔''

''وہ خود نہیں بیٹھی تھی، میں نے آفر کی تھی۔''

''تم نے آفر کی اور وہ بیٹھ گئی، حیرت ہے۔''

''مجھ پہ اعتبار کر کے بیٹھی تھی۔''

''کیسا اعتبار......؟''

مانی خاموش ہو گیا وہ اپنے ہی کہے ہوئے لفظوں کے جال میں پھنستا جا رہا تھا عالیہ بیگم کسی ماہر شکاری کی طرح اسے گھیر رہی تھیں۔

''ایک بات صاف صاف اور کان کھول کر سن لو۔'' وہ بہت سخت لہجے میں بیٹے سے مخاطب ہوئیں۔

''یہ جو سڑکوں، گاڑیوں اور پارکوں میں معاملات پروان چڑھتے ہیں مجھے نفرت ہے ایسی باتوں سے، تمہارے لیے کسی اچھے گھرانے کی بہترین لڑکی کا انتخاب میں خود کروں گی، تمہارے دماغ میں کوئی خناس ہو تو اسے نکال۔ باہر کرو۔'' ان کے ایک ایک لفظ سے مانی کا دل جیسے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔

''امی......!'' وہ کراہا۔

''بس، اب جاؤ۔'' ان کے لفظوں میں ہی نہیں چہرے پر بھی سختی رقم تھی، مانی کچھ کہہ ہی نہیں سکا، چپ چاپ سر جھکائے چلا آیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو چپ چاپ دادی کے تخت پر لیٹ گیا۔ وہ بھی وہیں بیٹھی تھیں، اون کا گولا اور سلائیاں سنبھال کر، کھٹا کھٹ سویٹر کی بنائی جا رہی تھی۔

''کیا ہوا بچے؟'' اس کی طویل خاموشی سے دادی بھی گھبرا گئیں۔

''کچھ نہیں۔''

''پھر ادا س بگلا بھگت بنے کیوں لیٹے ہو؟''

''یونہی......''

''یونہی تو انسان خاموش نہیں ہوتا، وہ بھی ایسا بے تحاشا ہنسنے بولنے والا بندہ، کیا بات ہو گئی، کیا کسی بات پر ماں سے ڈانٹ پڑی ہے؟'' دادی اپنی بہو بیگم کے مزاج سے خوب واقف تھیں، جو اپنی ساری اولادوں خصوصاً مانی کو شیر کی نگاہ سے دیکھنے کی قائل تھیں۔

''ہماری امی اتنے سخت اور بے لچک مزاج کی کیوں ہیں؟ کسی بھی معاملے پر اپنی ایک رائے قائم کر لیں گی پھر وہ پتھر کی لکیر بن جاتی ہے۔''

''بس ہر فرد کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے، مگر تمہیں کیا کہہ دیا اس نے؟'' دادی پر اب واضح ہو گیا تھا کہ ماں بیٹے کے درمیان ہی کوئی بات ہوئی ہے جو وہ یوں چپ چاپ ان کے پاس آیا ہے۔

''ایک بات بتایئے دادی، یہ اچھے لوگ، کون ہوتے ہیں؟''

''بھئی ہماری نظر میں تو، اچھے لوگ وہی ہیں جو اعلیٰ اخلاقی صفات کے حامل ہوں، زبان اور کردار دونوں بے داغ ہوں۔'' دادی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"اور خاندان، حسب نسب، امارت؟"

"ہوں...... خاندان اور حسب نسب کا تو یہ ہے یہ سب اللہ نے انسانوں کی شناخت اور پہچان کے لیے بنائے ہیں، تم تو ماشاء اللہ تعلیم حاصل کر رہے ہو، یہ سب پڑھا ہی ہوگا، حسب نسب اور دولت پر فخر و غرور کا اظہار جاہلیت کی علامت ہے، اللہ کے نزدیک عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے، اللہ کا حکم تو یہی ہے۔"

"دادی! یہ سب باتیں ہم سب جانتے ہیں مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو اس کے برعکس عمل کرتے ہیں۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" انہوں نے مانی کی تائید میں سر ہلایا۔

"ویسے خیریت تو ہے نا، آج تمہاری گفتگو کا موضوع خاصا مختلف ہے۔"

"زندگی ہمیشہ ایک سی تو نہیں رہتی نا، کبھی دل و دماغ بدل جاتے ہیں تو انسان کی باتیں بھی بدل جاتی ہیں۔"

"مگر یہ یکا یک بدلاؤ کیسے اور کیونکر آ گیا۔" دادی نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

"بس آ گیا، میں خود نہیں جانتا، کیسے اور کیونکر؟" مانی کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ عائشہ کے تھوڑی دیر کے ساتھ نے اس کی جیسے دنیا بدل دی تھی۔

"زندگی بے کار ہے اگر وہ اس زندگی میں شامل نہ ہوئی تو۔" وہ رہ رہ کر یہی سوچ رہا تھا اور اسے یہ بھی خوب اندازہ تھا کہ امی کا سخت اور بے لچک رویہ اس کے خوابوں کی تکمیل کے لیے بالکل بھی سازگار نہیں ہے، پہلی بار اسے حقائق کی سنگینی کا ادراک ہو رہا تھا۔

☆☆☆

نائلہ کسل مندی سے اٹھ بیٹھی، گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی تو دو بجنے والے تھے، وہ کچھ دیر یونہی خالی ذہن بیڈ پر بیٹھی رہی، پھر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ بغیر منہ دھلے ملگجے سے حلیے میں بھی آئینہ اسے سراہ رہا تھا، اسے بتا رہا تھا کہ وہ کتنی حسین ہے۔

"کیا فائدہ ایسی خوب صورتی کا، ایسی دلکشی کا، جسے سراہنے والا کوئی نہ ہو، چاہنے والا کوئی نہ ہو۔" وہ مایوسی کے عالم میں کچھ دیر آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو گھورتی رہی، پھر اپنا سیل فون اٹھا کر اس نے نمبر پش کرنے شروع کر دیے۔

"مصروف تو نہیں ہیں؟ بات ہو سکتی ہے آپ سے۔" دوسری جانب سے ہیلو کے جواب میں وہ بغیر کسی تمہید کے مخاطب ہوئی۔

"دنیا کی کوئی مصروفیت آپ جناب سے بڑھ کر ہے کیا؟ آپ حکم کریں ہم مصروفیت کیا آپ کے لیے یہ دنیا چھوڑ دیں۔" جمال چہکا۔

"دنیا چھوڑ دیں گے تو مجھے اس قید سے رہائی کون دلائے گا؟" وہ دل شکستگی سے بات کر رہی تھی۔

"رہائی تو کوئی جب دلائے جب قیدی خود بھی متمنی ہو آزادی کا؟ تم نے تو کبھی کچھ کہا ہی نہیں۔"

"اب کہہ تو رہی ہوں۔"

"تمہارا کہا سر آنکھوں پر، بس تم نے کہہ دیا، سمجھو تمہارا کام ہو گیا۔"

"لیکن یہ سب ہوگا کیسے؟ میرا مطلب ہے کہ سرمد مجھے آسانی سے طلاق دینے پر آمادہ ہو جائے گا؟" نائلہ اب ہر زاویے، ہر پہلو پر غور کر رہی تھی۔

"آمادہ نہ بھی ہو تو کیا ہے، اسے راضی کرنا میرا کام ہے، دیکھنا کیسے چٹکی بجاتے معاملہ حل کرتا ہوں۔" جمال کی بے پناہ خوشی اس کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔

"میں سچ کہوں، میرا دماغ بالکل بھی کام نہیں کر رہا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں، کبھی تو مجھے اس گھر سے، اپنے شوہر سے ایسی نفرت محسوس ہوتی ہے کہ دل چاہتا ہے پل بھر میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نکل جاؤں۔" نائلہ الجھے الجھے لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔

"تمہاری نفرت اور بے زاری بجا ہے، تم دراصل اس بوسیدہ گھر اور اس سے بھی پھٹیچر شخص کے لیے بنی ہی نہیں، میں تمہاری تکلیف کا، تمہارے کرب کا اندازہ کر سکتا ہوں اور معاف کرنا، مجھے تو یہ سوچ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ تمہارے والد اور بھائی نے تمہیں اس دوزخ میں دھکیل کیسے دیا؟" جمال نے گرم لوہے پہ چوٹیں مارنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

"جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا اب اس سے باہر نکلنے کی کوئی راہ ہے یا نہیں۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد نائلہ نے سوال کیا۔

"دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں، تم ایک کام کرو، اس وقت مل سکتی ہو مجھ سے، مین روڈ پہ آ جاؤ میں پک کر لوں گا تمہیں۔"

"اس وقت؟" نائلہ نے گھڑی کی طرف دیکھا، ڈھائی بجنے والے تھے۔

"آدھے گھنٹے میں آ جاؤ۔"

"ہاں آدھے گھنٹے میں تو آ سکتی ہوں۔" نائلہ نے ہامی بھری۔

"او کے پھر تھوڑی دیر میں ملتے ہیں۔" جمال نے فون آف کر دیا۔

نائلہ اپنا موبائل رکھ کر اٹھی ہی تھی کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

دوپہر میں کسی بھی وقت عموماً حلیمہ بوا آ جاتی تھیں، نائلہ نے پوچھنے کا تردد کیے بغیر کھٹاک سے دروازہ کھول دیا اور دروازے میں کھڑے شخص کو دیکھ کر وہ حیرت سے بت بنی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

عائشہ گھر پہنچی تو مغرب کا وقت بس ہونے ہی والا تھا اور لوڈ شیڈنگ کا ٹائم بھی، اس نے جلدی جلدی پہلے تو گیس لائٹ جلائی اور پھر گلاس میں پانی بھر کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔ دل کی دھڑکن ابھی تک قابو میں نہ آئی تھی۔

"بہت دیر لگا دی تم نے۔" امی نے عام سے لہجے میں کہا تھا مگر نہ جانے کیوں اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اس نے چور نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"وہ سوٹ میں لگانے کی چیزیں مشکل سے ملی ہیں۔ جہاں میچنگ مل گئی وہاں ڈیزائن اچھے نہیں تھے اور جو ڈیزائن پسند آئے ان میں میچنگ نہیں مل رہی تھی، پھر اسٹاپ پہ بہت دیر لگ گئی، شام کا وقت تھا نا، گاڑیاں بہت بھری ہوئی آ رہی تھیں۔" عائشہ نے اٹکتے اٹکتے وضاحت کی۔

"کلثوم خالہ کو بلا لیا تھا میں نے، بے چاری کافی دیر میرے پاس بیٹھی رہیں، تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھ کر گئی ہیں۔"

"اچھا۔" عائشہ نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

مغرب کی نماز پڑھ کر اس نے اپنی اور امی کی روٹیاں ڈالیں، دال وہ پکا کر گئی تھی ایک کٹوری میں تھوڑا سا اچار بچا ہوا تھا، روٹی اور دال کے ساتھ وہ بھی دسترخوان پر رکھا۔ امی بھی آ گئیں۔

کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد اس نے ماں کو دوائی دی، برتن دھو کر کچن صاف کیا اور صحن میں بیٹھ کر لائٹ کا انتظار کرنے لگی۔ لائٹ آنے پر اسے فرحانہ آنٹی کے سوٹ پر کام کرنا تھا۔ سوٹ تو پرسوں دینا تھا مگر وہ چاہ رہی تھی کہ وقت سے پہلے جوڑا تیار کر کے انہیں دے دے۔ سلائی کے لیے اور سوٹ بھی آئے تھے وہ بھی دینے

تھے۔

مختصر سے صحن میں بچھے پلنگ پر لیٹے لیٹے وہ بلا ارادہ ہی آسمان کو تکتی رہی۔ صاف شفاف آسمان کا آنچل جگمگاتے ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔

ان ستاروں نے ان گنت افراد کی ان گنت داستانیں دیکھی اور سنی ہوں گی۔ یہ وسیع آسمان اپنے دامن میں محبتوں کے کینے کیسے راز چھپائے بیٹھا ہے، عائشہ کو یونہی شاعرانہ سے خیالات سوجھ رہے تھے۔

''کیا ہمارا راز بھی......؟ اس کے دل نے چپکے سے سوال کیا۔

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

''چمکتے ستارے بہت خوب صورت لگتے ہیں مگر ان کی آرزو کرنا؟ خوش فہمی نہیں مگر خود فریبی تو ہے۔''

اس نے خود کو سمجھانے کی سعی کی۔ مگر آنکھوں میں خوابوں کے دھنک رنگ اترنے لگے تھے، محبت کی تتلی اس کے آس پاس رقص کر رہی تھی، اتنے خوب صورت اور دلکش رنگ۔

اس کا دل بے اختیار ہو رہا تھا اس تتلی کو اپنی مٹھیوں میں قید کرلے، اور اگر یہ تتلی چند لمحے بھی میری ہتھیلی پہ ٹھہر جائے تو زندگی کیا سے کیا ہو جائے، خواب و خیال کے طلسم نے اسے اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

جتنی دیر وہ مانی کے ساتھ رہی، اس نے کچھ نہیں کہا مگر پھر بھی عائشہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ دیا ہو، بلکہ سب کچھ کہہ دیا ہو۔

''کیا واقعی محبت خوشبو کی مانند ہوتی ہے؟ نظر نہیں آتی پھر بھی محسوس ہو جاتی ہے۔''

''عائشہ...... عائشہ۔''

''جی......!'' وہ اک دم ہڑبڑائی۔

''مجھے لگا تمہاری آنکھ لگ گئی ہے، کئی بار آوازیں دیں، تم نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔'' امی برآمدے میں بیٹھی اس سے مخاطب تھیں۔

''کیا کہہ رہی تھیں آپ؟'' وہ اٹھ بیٹھی اس کے اردگرد چھایا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔

''پانی چاہیے تھا، پڑھتے پڑھتے حلق خشک ہو گیا۔'' وہ تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ عائشہ نے پانی کا گلاس بھر کر ان کے سامنے رکھا۔

''جزاک اللہ۔'' وہ دھیرے دھیرے گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگیں۔

''تم تھک گئی ہو گی، عشاء کی نماز پڑھ کر سو جانا، کل کرنا اب سلائی کا کام۔'' امی نے اس کا چہرہ فکر مندی سے دیکھا۔

''زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گی مشین پہ۔ بس تھوڑا سا کر لیتی ہوں، باقی کل کرلوں گی میں چاہ رہی ہوں کہ ان کا سوٹ کل مکمل کر کے دے دوں اور جو باقی کپڑے ہیں سلائی کے وہ بھی جلدی جلدی مکمل کرنے ہیں۔ پھر ایگزام شروع ہونے والے ہیں، اس کی تیاری کرنی ہے۔''

''اپنی صحت بھی دیکھو بیٹا، جتنا کام آسانی سے ہو سکتا ہے اتنا ہی لیا کرو، اپنی جان پر زیادہ بوجھ مت ڈالو، جتنی محنت کر سکتی ہو، اتنی ہی کرو، باقی اس رزاق پر چھوڑ دو، جس کے ذمے ہر جاندار کا رزق ہے۔'' امی نے اسے سمجھایا۔

''آپ بلاوجہ فکر مند نہ ہوں، سلائی صرف میرا کام ہی نہیں بلکہ شوق بھی ہے اپنی مرضی کا کام ہے، جب تک دل چاہتا ہے کرتی ہوں، جب تھک جاتی ہوں تو آرام کر لیتی ہوں۔ آپ میری ٹینشن ہرگز نہ لیں، میں بالکل ٹھیک ٹھاک، فٹ فاٹ صحت مند بلکہ ہٹی کٹی ہوں۔''

عائشہ نے ماں کی فکر مندی اور سنجیدگی کو ہلکے پھلکے مذاق میں اڑانے کی کوشش کی اور کامیاب رہی۔ امی ہنس پڑیں۔

''پتا نہیں کہاں سے ہٹی کٹی ہو، اتنی دھان پان سی تو ہو ناک دباؤ تو دم نکلے۔'' امی نے مسکرا کر محبت سے اسے دیکھا۔

''میری نزاکت پر مت جائیں، اندر سے بڑی سالڈ ہوں میں۔'' عائشہ گلاس رکھنے چلی گئی۔

''جو بیٹی، بیٹا بن جائے، اسے تو مضبوط ہونا ہی ہے۔''

امی نے ایک آہ بھری، سال ہونے کو تھا مگر جوان بیٹے کی تصویر نگاہوں سے کسی بھی لمحے اوجھل نہیں ہوتی تھی۔

☆☆☆

ماریہ کو اس نے پچھلے برآمدے میں پکڑا تھا، ستون سے لپٹی بوگن ویلیا کی بیل کے پاس، کرسی ڈالے، ہینڈز فری کانوں میں لگائے محترمہ آنکھیں بند کر کے جھوم رہی تھیں۔

''بدتمیز، میری نیندیں حرام کر کے خود کتنے مزے سے انجوائے، کر رہی ہے۔'' مانی نے گھور کر اسے دیکھا اور ہینڈز فری کے تار کھینچے۔

''کک...... کون؟'' ماریہ نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور سیدھی ہو کر بیٹھی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' سامنے کھڑے مانی کو دیکھ کر اس نے گھورا۔

''یہ ایک طرف کرو اور پہلے میری بات سنو۔'' مانی نے دوسری کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے کی اور بیٹھتے ہوئے بولا۔

''کیا بات ہے؟'' ماریہ نے بے دلی سے موبائل آف کیا۔

''کل شام میں امی کے ساتھ تم تھیں سپر مارکیٹ میں؟''

''ہاں، امی کے ساتھ تو میں تھی مگر تمہارے ساتھ...... کک...... کون۔'' اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی مانی نے اس کی بات کاٹی۔

''تم اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتی تھیں، کیا ضرورت تھی امی کو بتانے کی کہ تم اس لڑکی کو جانتی ہو؟'' وہ غرایا۔

''میں نے کب......''

''تمہیں بہت شوق ہے اپنے نمبر بنانے کا امی کے سامنے، چپ نہیں لگا سکتی تھیں۔ کہہ دیتیں کہ مجھے کیا پتا، کون لڑکی ہے، عائشہ کا نام لینا ضروری تھا۔''

''عائشہ......!'' ماریہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

''تمہارے ساتھ وہ، عائشہ تھی؟''

''بنو مت، امی کے سامنے تو نام لے دیا اور اب میرے سامنے ایکٹنگ کر رہی ہو۔''

''مانی، میرے پیارے اور پیٹو بھائی، تم واقعی ایک نمبر کے احمق اور گھامڑ ہو دماغ کے بجائے سوچتے بھی اپنے معدے یا پیٹ سے ہو۔'' ماریہ نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

''بکواس مت کرو۔'' وہ بھنا گیا۔

''بکواس نہیں کر رہی، حقیقت بیان کر رہی ہوں، دیکھو تمہاری گاڑی ہم نے دور سے دیکھی پھر زن سے گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اتنا تو نظر آیا کہ فرنٹ سیٹ پر تمہارے ساتھ کوئی لڑکی ہے مگر کون ہے؟ کیسی ہے؟ یہ سب بالکل بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ امی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کون لڑکی ہو سکتی ہے، میں بھلا بغیر دیکھے کسی کا نام کیسے

لیتی، میں نے تو صاف منع کر دیا کہ بھئی مجھے بالکل بھی آئیڈیا نہیں ہے کہ کون لڑکی ہے یا کون ہو سکتی ہے اور اب تم کہہ رہے ہو کہ وہ عائشہ تھی، بائے گاڈ، میرے لیے ناقابلِ یقین بات ہے۔"

"تو پھر امی نے مجھ سے یہ کیوں کہا کہ ماریہ نے اس لڑکی کو پہچان لیا ہے۔" مانی نے الجھن بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تم سے اگلوانے کے لیے انہوں نے بلف کیا، تم جھانسے میں آ گئے اور یہاں میرے پاس آ کر عائشہ کا نام لے بیٹھے، امی کے سامنے تو کچھ نہیں کہا تم نے؟" وہ اچانک چونک کر پوچھنے لگی۔

"شکر ہے ان کے سامنے نام نہیں لیا۔" مانی خفت زدہ لہجے میں بولا۔

"لیکن یہ عائشہ اور تم، کہاں تم، کہاں وہ، آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ ویسے وہ ہے بڑی سویٹ، میں نے کئی بار سوچا کہ اگر میرا بھائی کسی قابل ہوتا تو میں ضرور اسے اپنی بھابھی بنانے کا سوچتی۔"

"کیا مطلب، کسی قابل؟ آئندہ چند مہینوں بعد میں ان شاء اللہ ایک قابل انجینئر بننے والا ہوں، ڈگری اور پرسنالٹی دونوں شاندار اور کیا چاہیے۔"

"امی کی رضامندی، جو ہرگز نہیں ملنے والی۔" ماریہ نے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا۔

"امی کی رضامندی؟" مانی نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"ویسے اگر گھر میں سب لوگ راضی ہوں تو کیا تب بھی امی نہیں مانیں گی؟" مانی نے بڑی معصومیت سے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ماریہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"بقول دادی جان، ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں، امی کی ہاں، میں سب کی ہاں ہوگی، یہ یاد رکھنا۔"

"تو کیا تم بھی؟" مانی نے مایوسی کے عالم میں دھیرے سے کہا۔

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں بھائی۔" ماریہ نے یکدم اچھی اور پکی والی بہن بن کر بے حد پرخلوص لہجے میں کہا۔

"ویسے تمہیں ابھی سے اتنی ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی تو اپنا اچھا سا رزلٹ لاؤ، جاب وغیرہ کرو، کیریئر بناؤ، پھر دیکھتے ہیں۔" ماریہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے سمجھایا۔

"اور اگر اس عرصے میں اس کی کہیں اور ہو گئی تو؟"

"یہ تو پھر نصیب کی بات ہے۔"

"اگر میرے نصیب میں تمہارا ساتھ نہیں تو تمہاری محبت میرے دل میں رقم کیوں کر ہو گئی؟" مانی نے خاموشی سے سوچا۔

"پریشان مت ہو، ابھی تو میرے ساتھ کالج میں ہے، ایسی ویسی کوئی بات ہوئی تو میری نالج میں ضرور آئے گی۔"

"اچھا......!" مانی نے بےیقینی سے اسے دیکھا۔

"ایک بات سنو، عائشہ سے کسی بھی بات کا تذکرہ بالکل بھی مت کرنا، خاص طور پہ یہ کہ امی نے تمہیں دیکھا تھا۔" مانی نے پوری بات اسے بتانے کے بعد تاکید کی۔

"بےفکر رہو، مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔"

"ارے......!" مانی کو اچانک کچھ یاد آیا۔ "حسنہ آپی پاستا بنا رہی تھیں، دیکھوں کہاں تک پہنچا، تیار ہوا یا نہیں۔"

"بھائی......!" ماریہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑیں۔

"ہم نے تو سنا ہے کہ اس عالم میں بھوک، پیاس، نیند سب اڑ جاتی ہے، مگر تمہیں تو شاید خواب میں بھی، اس کے بجائے پاستا اور پیزا نظر آتے ہوں گے۔" اس نے چوٹ کی۔

"میں خود حیران ہوں، کیا بتاؤں، اب تو پہلے سے بھی زیادہ بھوک لگنے لگی ہے مجھے۔" مانی نے شرمندہ ہو کر سر کھجایا۔

"بہت خوب!" ماریہ ہنس پڑی اور اس کے ساتھ مانی بھی۔

☆☆☆

"پانچ لاکھ حق مہر، ایک بنگلہ، گاڑی اور بیس تولے سونا۔"

طلال نے بخوشی اس کے نام کر دیا تھا۔

نکاح ہوا، وہ دلہن بنی، ہزار سپنے اپنی آنکھوں میں لیے طلال کے ہمراہ چلی گئی۔ "ماشاءاللہ، چشم بددور، کتنی پیاری لگ رہی تھی، دلہن بن کر کیسا روپ آیا چنبیلی پر، میں نے تو کئی بار نظر اتاری بچی کی۔" چنبیلی رخصت ہو گئی تھی مگر بہری بوا کی باتیں ختم نہیں ہو رہی تھیں۔

"بوا! وہ دلہناپے سے زیادہ محبت کا روپ تھا جس نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔" گوری نے ہال میں لگے قدِ آدم آئینے میں اپنے سجے سنورے وجود کا جائزہ لیا۔

کم تو وہ بھی نہیں تھی، سجا سنورا وجود لشکارے مار رہا تھا۔

"کاش، کوئی چاہنے والا، قدردان، ہمارے لیے بھی ہو، دل میں انہونی خواہشیں سر اٹھاتی ہی تھیں مگر...... مگر۔

مہک جان نے سگریٹ سلگائی ہی تھی کہ تارا آ کر دھم سے اس کے پاس بیٹھ گیا، سستی سی خوشبو کا بھبکا چاروں اطراف پھیل گیا۔

"باجی......!"

"ہوں!" مہک جان نے بےتوجہی سے اسے دیکھا۔

"گلابو کے آدمی تیسرے چوتھے روز سگنل کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں آوازیں کستے ہیں ہم لوگوں پہ۔"

"شبیر چاچے کو بتانا تھا نا، اسی نے ذمہ داری لی ہوئی ہے ان کم بختوں کو بھگانے کی۔"

"اس سے بھی بولا تھا، کمینہ ہنس رہا تھا۔ کہنے لگا، دو چار گالیاں سنا دیا کر ان لوگوں کو۔" تارا نے منہ بسورا۔

"گالیاں تو اب یہ سنے گا میرے منہ سے، ایک مہینے میں انہیں بھگانے کا کہا تھا، ڈیڑھ مہینہ ہو گیا، ابھی بھی اس حرامزادی کے آدمی سگنل کے آس پاس کیوں نظر آ رہے ہیں۔"

"چل تارا، بچی کو تنگ نہ کر، وہ ویسے ہی تھکی ہوئی ہے، تو اور آ جاتا ہے اپنے فضیحتے لے کر، بعد میں کرنا یہ باتیں، ابھی آرام کرنے دے اسے۔" بہری بوا نے اسے گھر کا۔

"اے لو بوا، میں صدقے، میں واری اپنی باجی کے، بھلا میری کیا مجال، باجی کو پریشان کروں، لاؤ میں دباؤں، دیکھنا کیسا سرور ملتا ہے۔" تارا نے مہک جان کے کندھے دبانے شروع کر دیے۔

"چل وے، رہن دے، ان نازک ہاتھوں سے تو کیا کندھے دبائے گا، یہ ہنر تو بس اس کمینے کے پاس ہے، باجی، ایسا دباتا ہے کہ چند منٹوں میں ہی ساری تھکن سارا درد غائب۔" مہک جان، شمسو کو سراہتے ہوئے بھی اس کے لیے گالیوں کا استعمال نہ بھولی۔

''پھر باجی، کیا سوچا؟'' تارا اس کے منع کرنے کے باوجود بھی بدستور اس کے کندھے دبا تا رہا۔

''سوچنا کیا، شبیر چاچا کو فون کروں گی، وہی بھگائے گا ان لوگوں کو ہم نے اپنے آدمی بھیجے تو معاملہ غلط ہو جائے گا۔'' مہک جان نسبتاً نرمی سے بولتے ہوئے بوا سے مخاطب ہوئی۔

''ایک کپ چائے تو بنا دو بوا اور سر درد کی گولی بھی دے دینا، درد سے سر پھٹا جا رہا ہے۔''

''اچھا بیٹا، ابھی لائی۔'' بوا اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''چل تارا، تو بھی اپنے دھندے سے لگ، چل شاباش۔'' مہک جان نے اسے بھی بھگایا۔

''ناس پیٹا، اتنی تیز خوشبو لگاتا ہے کہ متلی ہونے لگتی ہے۔'' اس کے جانے کے بعد مہک جان بڑبڑائی۔

☆☆☆

''ابا آپ، اس وقت یہاں۔'' نائلہ کے حلق سے بدقت آواز نکلی تھی۔

''اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو؟ کیا میں تمہارے گھر نہیں آ سکتا؟'' سید صاحب بیٹی کی حیرانی پر متعجب تھے۔

''نن نہیں، یہ بات نہیں، آپ کم کم آتے ہیں نا اس لیے۔'' نائلہ نے بوکھلاتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

ابا اندر آ کر برآمدے میں ہی بیٹھ گئے۔

''ایک جاننے والے اسی علاقے میں رہتے ہیں، وہ انتقال کر گئے آج، انہی کی تعزیت کے لیے آیا تھا، سوچا تمہاری خیر خیریت بھی معلوم کرتا چلوں۔'' ابا نے گندے سندے صحن بے ترتیب برآمدے اور اس کے ملگجے حلیے کا جائزہ لیا۔

''ابھی سو کر اٹھی ہو کیا؟''

''نہیں، اٹھے ہوئے تو بہت دیر ہو گئی بس طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' نائلہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے بات بنائی۔

''ہوں۔'' وہ کھنکھارے۔ ''سرمد ٹھیک ہے، بڑے دن ہو گئے تم دونوں نے چکر نہیں لگایا گھر کا؟''

''ہاں، بس یہ دیر سے گھر آتے ہیں، چھٹی والے دن بھی اکثر ڈیوٹی لگ جاتی ہے تو موقع ہی نہیں ملتا کہیں آنے جانے کا۔'' نائلہ نے بات بنائی۔

''اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے نا؟'' ابا نے بغور اپنی بیٹی کو دیکھا، کئی دنوں سے وہ سرمد سے لڑ جھگڑ کر یا ناراض ہو کر۔ میکے نہیں آئی تھی۔

''آہستہ آہستہ حالات سے سمجھوتا کرنا سیکھ جائے گی۔'' انہوں نے سوچا تھا۔

''ہاں، ٹھیک ہی ہے۔'' نائلہ نے گول مول انداز میں جواب دیا۔ جو غلط ہونا تھا وہ تو ہو گیا ایسے شخص اور گھر میں میری شادی، ٹھیک ہونے کے لیے اب بچا ہی کیا ہے؟ نائلہ نے تنفر سے سوچا۔)

''کھانا کھا لیں؟'' اس نے اوپری دل سے باپ کو مخاطب کیا، ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ نہ اس نے اب تک کچھ پکایا تھا اور نہ ہی ایسا کچھ بنا ہوا فریج میں رکھا تھا کہ وہ جھٹ پٹ تیار کر کے باپ کو کھلا دیتی۔ اس وقت تو اسے بس جمال کی فکر دامن گیر تھی۔

وہ انتظار کر رہا ہوگا؟ اس نے غیر ارادی طور پر وال کلاک کی طرف نگاہ کی۔

''کھانا کھا کر گھر سے نکلا تھا۔'' سید صاحب نے اپنی جناح کیپ سر پر ٹھیک کی۔

''چائے؟''

''اونہوں، تمہیں معلوم ہی ہے کہ بے وقت کچھ کھانے پینے سے طبیعت گڑبڑ کرنے لگتی ہے۔'' انہوں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

''تم اپنا کام کرو، کھانا وانا کھاؤ۔''

''جی......!'' نائلہ کے دل کو پنکھے لگے ہوئے تھے، (پتا نہیں کتنی دیر کے لیے آئے ہیں، کب جائیں گے؟) اس نے بے حد مضطرب نظروں سے باپ کو دیکھا۔

''سرمد کا فون آیا تھا میرے پاس۔'' وہ دفعتاً بولے۔

نائلہ نے کچھ کہے بغیر سوالیہ نگاہیں ان کی طرف اٹھائیں۔

''کہہ رہا تھا کہ تم اس سے کھنچی کھنچی رہتی ہو، سیدھے منہ بات نہیں کرتیں، گھر میں اور گھر داری میں دلچسپی نہیں لیتیں۔''

''اس الو کے پٹھے کی یہ مجال، اب میری شکایتیں بھی ہونے لگی ہیں۔'' غصے سے نائلہ کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔

''کوئی تکلیف یا پریشانی ہوگی گھر میں تو موڈ تو خراب ہوگا ہی، اسے تو کوئی فکر ہی نہیں ہے مستقبل کی، کولہو کے بیل کی طرح صبح سے شام، شام سے صبح کر رہا ہے۔'' وہ پھٹ پڑی۔

''وقت کے ساتھ ساتھ ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی، تھوڑا صبر و تحمل سے کام لو، سرمد محنتی ہے، بس یہ ہے کہ بے چارہ سیدھا سادا شریف نوجوان ہے، قدر کرو اس کی۔'' باپ نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔

''ہونہہ، یہی ٹٹ پونجیا رہ گیا ہے قدر کروانے کے لیے۔''

''میں ابھی آتی ہوں۔'' اپنے غصے اور کھولن پہ قابو پاتے ہوئے وہ واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

عین اسی لمحے اس کا موبائل بجا۔

یہ جمال کی دوسری سم کا نمبر تھا جس سے سرمد واقف نہیں تھا، پھر بھی احتیاطاً نائلہ نے اس نمبر کو جمیلہ کے نام سے محفوظ کر رکھا تھا۔

اس کا سیل فون، سید صاحب کے قریب ہی پڑا ہوا مسلسل بج رہا تھا۔ نائلہ واش روم سے جلدی جلدی نکلنے کی کوشش کے ساتھ خود کو کوس رہی تھی کہ اس نے وہاں سے موبائل اٹھا کر کیوں نہیں رکھا۔

اونچے سروں میں بجتا بے ہنگم سا گانا، سید صاحب کی طبیعت پہ سخت گراں گزر رہا تھا۔

''سہیلی محترمہ کو بتا دوں کہ کچھ دیر بعد رنگ کر لیں۔''

نائلہ جیسے ہی واش روم سے نکلی، سید صاحب سیل فون آن کر کے کان سے لگا چکے تھے۔

''کہاں ہو تم؟ کب سے گاڑی لیے مین روڈ پہ تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔'' ان کے ہیلو کہنے سے قبل جمال بے چینی سے بول پڑا۔

سید صاحب نے ایک نظر سامنے نائلہ کو دیکھا۔

وہ جہاں کی تہاں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

افشین نعیم

یار دل دار

''صاب! مونا میم بول رہی ہے، آج کا ناشتا آپ لوگ نیچے آ کر کرو۔ امارا ساتھ۔''

سائیکل خان، مونا میم کا پیغام لے کر آیا تھا۔

''اور یہ ناشتا یقیناً ہم لوگ بنا کر ساتھ لائیں گے نیچے۔'' عادل نے سوالیہ نظروں سے مونا میم کے جاسوس طیارے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ گویا، اس کی ہاں کا منتظر ہو۔

تب ہی حیدر واش روم سے برآمد ہوا۔

سائیکل خان کی جگہ وہ بولا۔

''ہاں تو ظاہر ہے بنا کر ہی لے جائیں گے نا۔''

''یہ اسکوٹر تو خالی جاسوسی کے لیے ہے۔ ناشتا واشتا بنانا کہاں آتا ہے اس کو۔''

''نہیں صاب! آج آپ خالی تشریف لے آنا، ناشتا مونا میم کی طرف سے ہوگا۔''

''واقعی؟'' احسن نے بے یقینی سے سائیکل خان کو دیکھا۔

''ہاں صاب! قلزا واپس آ گیا ہے۔''

''کون قلزا؟'' حیدر نے پوچھا۔

''مونا میم کا کک۔''

''اچھا صاب! آپ لوگ جلدی سے آ جاؤ۔ ام چلتا ہے۔''

احسن، حیدر، عادل، انس اور محب اللہ پانچوں نیچے جانے کو تیار کھڑے تھے جب عادل بولا۔

''یار احسن! اس یادگار موقع کی مووی نہ بنالیں۔''

احسن نے اپنے دائیں، بائیں کھڑے محب اللہ اور انس کو دیکھا پھر پیچھے حیدر کو، اس کے بعد عادل کو۔

''یہ یادگار موقع......''

(خود سمیت، سب کی طرف اشارہ کیا) ''یہ تو ہر وقت ہی ہوتا ہے۔''

''اس میں مووی بنانے کی کون سی بات ہے۔''

''اوہو۔ ناشتے کی بات کر رہا ہوں میں۔''

عادل جھنجلایا۔

''عادل جگر! مجھے تیری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' احسن نے عادل کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' عادل نے ابرو چڑھائی۔

''دو ماہ ہو گئے ہیں ہمیں، یہاں آئے ہوئے۔''

''ہر اتوار ناشتا ہم مونا میم کے ساتھ ہی کرتے ہیں۔ اس میں یادگار تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''وہ ناشتا ہمیشہ ہم خود بنا کر لے جاتے رہے ہیں۔ آج کا ناشتا، مونا میم کی طرف سے ہوگا۔''

''اوہ......'' احسن نے ہونٹ گول کر کے سر ہلایا۔

''ایسا ہے لالے! ہم لوگ ناشتا کرتے ہیں تو اتنی دیر مووی بنانا۔'' حیدر مشورہ دے کر سیڑھیاں اتر گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے باقی سب لوگ بھی چلے گئے۔ صرف عادل سر کھجاتا رہ گیا۔

(مطلب مذاق کر کے بندہ سمجھایا بھی کرے کہ یہ مذاق تھا)۔

☆☆☆

مونا میم ڈائننگ ٹیبل کی سربراہی کرسی پر براجمان تھیں۔ دائیں ہاتھ کی پہلی کرسی، سائیکل خان کی تھی۔ یہ ان لوگوں کو اس دو ماہ کے عرصے میں پتا چل چکا تھا۔

مونا میم کے عین سامنے ڈائننگ ٹیبل کے اختتام والی کرسی پر محب اللہ براجمان ہو چکا تھا۔

سائیکل خان کی کرسی کے ساتھ والی دو کرسیوں پر حیدر اور انس بیٹھے ہوئے تھے۔

محب اللہ کے برابر والی کرسی پر احسن بیٹھا تھا۔

اب باقی بچی تھیں دو کرسیاں۔

ایک مونا میم کے برابر والی اور دوسری اس کے برابر والی۔

عادل سلام کر کے مونا میم کے برابر بیٹھنے ہی لگا تھا جب مونا میم کی آواز پر رک گیا۔

''یہ قلزا کی جگہ ہے۔ اگلی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔''

حکم جاری کر کے اب وہ ڈائننگ ٹیبل پر سجے لوازمات کا جائزہ لے رہی تھیں جو سائیکل خان بھاگ بھاگ کر کچن سے لا کر میز پر رکھ رہا تھا۔

عادل برے برے منہ بناتا ہوا احسن کی برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ملازمین کو بھی اتنا سر چڑھایا ہوا ہے۔'' عادل کی بڑبڑاہٹ اتنی واضح ضرور تھی کہ احسن کے کانوں تک بخوبی پہنچ گئی۔

''صرف ملازمین کو نہیں، کرائے داروں کو بھی......'' احسن کی جوابی بڑبڑاہٹ پر عادل محض اس کو گھور کر رہ گیا۔

''مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے مونا میم کے ساتھ بیٹھنے کا۔'' عادل کی سرگوشی احسن تک پہنچی۔

''نہیں بھی......'' احسن نے دانت نکالے۔

''ہم م م......'' محب اللہ کے ہم م م میں ایک تنبیہ چھپی تھی کہ خاموش ہو جاؤ۔

تب ہی مونا میم کی آواز گونجی۔ ''سائیکل، قلزا! آ جاؤ جلدی۔'' سائیکل خان پانی کا جگ ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"شکر ہے، قلزا واپس آ گیا ورنہ امارے تو منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا تھا اتنے برے برے کھانے کھا کر۔" سائیکل خان اطمینان سے بولا۔

"ہوں......" انس نے سر جھٹکا۔

"منافق کہیں کا...... اتنے دن چپ چاپ کھاتا رہا۔ اب اپنا کک واپس آ گیا ہے تو باتیں بنا رہا ہے۔"

انس بے چارے نے سب سے زیادہ کوکنگ کی تھی۔ اس کو دکھ بھی زیادہ ہوا تھا۔

حیدر نے اس کے کندھے پر تسلی آمیز سی تھپکی دی۔

"چلو شکر ہے، قلزا واپس آ گیا۔ اب ہمیں بھی اچھے اچھے کھانے بنا کر کھلائے گا۔" عادل کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

"کھلائے گا......؟" مونا میم نے حیرت سے عادل کو دیکھا۔

"اس کے تو لب و لہجے کا مسئلہ ہے۔" انہوں نے ہاتھ سے سائیکل خان کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہیں کیا مسئلہ ہے؟" اس سے پہلے کہ عادل ان کی بات کا مطلب سمجھتا، کچن کی طرف سے قدموں کی چاپ ابھری۔ مونا میم نے گردن گھما کر دیکھا، ساتھ ہی بولیں۔

"آؤ آؤ قلزا! تمہارا تعارف کروادوں نئے کرائے داروں سے۔"

انیس بیس سال کی دراز قد، دبلی پتلی دوشیزہ۔ سرخ و سفید رنگت، چائنیز سے نین نقش۔ ایک غرور سے چلتی ہوئی آئی اور ناک چڑھا کر عادل اور مونا میم کے درمیان بیٹھ گئی۔

"یہ ہے ان کا کک قلزا......" عادل بمشکل بولا۔

"یہ لوگ یہیں ہیں، ابھی تک گئے نہیں۔" قلزا کی نخوت بھری آواز ان کے کانوں تک پہنچی۔

اس کی آواز پر وہ سب کے سب ہوش میں آئے ورنہ تو رعب حسن نے ہی کام تمام کر دیا تھا۔

"ابھی تو ناشتا شروع بھی نہیں ہوا۔ ناشتے سے پہلے ہی چلے جائیں کیا؟" عادل نے بآواز بلند جوابی وار کیا۔

"میں اس گھر سے جانے کی بات کر رہی ہوں۔" وہ بالکل صاف اردو لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"ہمارے ہاں عام طور پر لوگ دو، تین ماہ میں گھر خالی کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی عجیب و غریب کرائے دار ملتے ہیں ہمیشہ ہمیں۔"

حیدر نے حیران ہو کر اس کی بات سنی۔ وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے ملازمہ نہ ہو بلکہ مکان مالک ہو۔

اور احسن سوچ رہا تھا۔ واقعی مونا میم نے ملازمہ کو بہت سر چڑھایا ہوا ہے۔

"جی، ہمارا بھی کچھ اس سے ملتا جلتا سا مسئلہ ہے۔ ہمیں بھی ہمیشہ کچھ بہت ہی عجیب و غریب سے مالک مکان ملتے رہے ہیں۔" یہ بات عادل نے کی ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا، پر بولنے والا انس تھا۔

(چھ پڑی، چھ پڑی کا شوربہ) عادل بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"اچھا بچو! اب تم لوگ اپنا یہ ہنسی مذاق بند کرو۔" مونا میم بولیں۔

"ہنسی مذاق......؟" احسن اور عادل نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"بھئی قلزا......" مونا میم نے بات شروع کی۔

"یہ جو تمہارے ساتھ بچہ بیٹھا ہے، یہ عادل ہے۔ اس کے برابر میں احسن ہے۔ یہ سامنے محب اللہ (ہاتھ سے اشارے بھی کر رہی تھیں، ساتھ ساتھ سمجھانے کے لیے)۔ "یہ انس اور یہ حیدر......" انہوں نے تعارف مکمل کروایا۔

"یہ پانچوں ہی بہت اچھے بچے ہیں۔ ان دو ماہ میں بالکل اپنوں کی طرح خیال رکھا ہے انہوں نے میرا۔ ورنہ تمہارے جانے سے پریشان ہو گئی تھی میں۔" وہ ان لوگوں کو بالکل نظر انداز کیے قلزا سے مخاطب تھیں۔

قلزا نے بغیر کسی تبصرے کے ان کی بات سنی۔

"چلو بھئی، ناشتا شروع کرو سب لوگ۔" انہوں نے خود سب سے پہلے شروع کیا۔

ناشتا اختتام کے قریب تھا۔ جب مونا میم بولیں۔

"بھئی آج سے تم لوگوں کی چائے کی ڈیوٹی ختم۔ اب شام کی چائے قلزا بنائے گی۔ تم لوگ صرف پیا کرو گے آ کر۔"

مونا میم نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے۔

"کوئی بات نہیں، کبھی کبھی ہم بھی بنا کر لے آیا کریں گے۔" عادل نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔

"نہیں، نہیں۔ جتنی بری چائے تم لوگ بناتے تھے نا، وہ جتنی میں نے پی لی، کافی ہے۔ مزید کی ضرورت نہیں۔"

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا (عادل کا منہ بن گیا۔ شام کی چائے وہی بناتا تھا عموماً)۔

"مونا میم! یہ ان سب کو چائے پر بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ روز کسی ایک کو بلا لیں، کافی ہے۔" قلزا نے مونا میم کو مشورے سے نوازا۔

"ارے نہیں، یہ سب آ جاتے ہیں، رونق ہو جاتی ہے۔ میرا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔" مونا میم قلزا کو مخاطب کر کے بولیں۔

"اب تو لگتا ہے ہمارا وقت بھی اچھا گزر جایا کرے گا۔" عادل نے احسن کے کان میں سرگوشی کی۔

احسن نے زور سے اس کے پاؤں پر پاؤں مارا۔

بے چارہ عادل بلبلا کر رہ گیا۔

ایک محب اللہ تھا غریب، جو قلزا کے آنے کی وجہ سے لقمہ بھی ڈھنگ سے حلق سے نیچے نہیں اتار سکا تھا۔

☆☆☆

"یارو ویسے ناشتا تھا بڑا فٹ۔"

عادل نے کھڑکی سے چھن چھن کر آتی دھوپ میں کھڑے، بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

احسن نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

حیدر آفس پہن کر جانے والے کپڑے استری کرنے کے لیے الگ کر رہا تھا۔

انس جوتے چمکا رہا تھا۔ محب اللہ انتہائی انہماک سے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔

"آج شام میں کوئی میرے ساتھ چلے وقت نکال کر۔" عادل نے بغیر کسی کو مخاطب کیے کہا۔

"کھانا کھلانے لے جا رہا ہے تو میں چلتا ہوں۔" حیدر فوراً بولا۔

"اور اگر پکچر دیکھنے جانا ہے تو مجھے لے جا۔" احسن نے ڈلار سے عادل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور اگر شاپنگ وغیرہ کا ارادہ ہے تو میں چلتا ہوں۔" انس نے بات مکمل کر کے دوبارہ جوتے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سوچ نگر کی رانی

رضیہ جمیل

قیمت -/350 روپے

چمکانے شروع کر دیے۔

”اور اگر سہہ روزے پر جانا ہو تو تجھے ساتھ لے چلوں۔“ عادل نے اخبار میں غرق محب اللہ کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

”ہیں کیا......؟“ محب اللہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ وہ اخبار میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ ان کی باتیں سن ہی نہ پایا۔

”میں کہہ رہا تھا تیرے لیے رشتہ دیکھا ہے میں نے۔ شام کو میرے ساتھ چل تو بات پکی کر آئیں۔“

عادل کی بات پر محب اللہ کے علاوہ تمام لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ رینگی۔

”کیا اول فول بول رہا ہے۔“ محب اللہ برہم ہوا۔

”اول فول والی کیا بات ہے۔ تو اخبار میں ضرورتِ رشتہ کے اشتہار پڑھنے میں اتنا گم تھا کہ تجھے پتا ہی نہیں چلا ہم کیا بات کر رہے ہیں۔“

”میں ضرورتِ رشتہ کے اشتہار نہیں پڑھ رہا تھا۔“ محب اللہ کے برہم تاثرات مزید برہم ہوئے۔

”یہ دیکھو، بھائیو!“ عادل نے محب اللہ کے ہاتھ سے اخبار اُچک کر کھولا اور سب کے سامنے لہرایا۔

”یہ ضرورتِ رشتہ والا صفحہ ہے یا نہیں......؟“

”ہے۔ بالکل ہے۔“ سب نے زور و شور سے تائید کی۔

”اب بتا، یہی صفحہ پڑھ رہا تھا نا؟“ عادل محب اللہ کی جانب گھوما۔ جو خوں خوار نظروں سے اسے ہی گھور رہا تھا۔

”یہ......“ محب اللہ نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر ایک اشتہار پر انگلی رکھی۔

”ابوظہبی میں ہنرمند افراد کی ضرورت ہے۔ نوکری کا اشتہار ہے۔ یہ پڑھ رہا تھا۔“

محب اللہ کا بس نہیں چل رہا تھا، اخبار اٹھا کر اس کے منہ پر مارے۔

”ہنرمند افراد کی ضرورت ہے۔“ عادل نے باآواز بلند دہرایا۔

”تو یہ تو ہنرمندوں کے لیے ہوا نا، تو کیوں پڑھ رہا ہے؟ ایسا کر تو ضرورتِ رشتہ کے اشتہار ہی پڑھ لے۔“

عادل کی بات پر جہاں محب اللہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا۔ وہیں احسن اور حیدر کا بڑا بے ساختہ قہقہہ گونجا۔ محب اللہ غصے سے پیر پٹختا باہر نکل گیا۔

”یار! یہ مولوی کو اتنا غصہ کیوں آتا ہے؟“ عادل معصوم سی شکل بنا کر پوچھ رہا تھا۔

”غصہ نہ آئے تو کیا پیار آئے تیری باتوں پر۔“

احسن نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

”لو، بھلا میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو اتنا بگڑ گیا۔

”ضرورتِ رشتہ کے ہی اشتہار تھے نا، کون سا فلموں کے اشتہار تھے جو اتنا برا مان گیا۔“

”عادل بھائی! آپ محب اللہ بھائی سے بات کرتے ہوئے تھوڑے ادب، آداب ملحوظ رکھا کریں۔“ انس نے مفت مشورے سے نوازا۔

”یہ مشورے تُو دینا، اپنے محب اللہ بھائی کی بیوی کو۔ مجھ سے نہیں اٹھائے جاتے اتنے نخرے۔“ عادل نے کہتے ہوئے اخبار کھولا۔

”پچپن سالہ راجپوت کنوارے کو شادی کے لیے رشتہ درکار ہے۔ جو کاروبار سیٹ کروا کر دے سکیں۔ کنواری، مطلقہ، بیوہ رجوع کریں۔“

عادل نے پڑھ کر، دوستوں کو حیرت سے دیکھا۔

”ایک تو پچپن سال کا بڈھا...... پھر بے روزگار و بے کار...... یار! یہ سنجیدہ اشتہار ہے یا کوئی مذاق ہے۔“

”ایسے ہی اشتہار ملیں گے اس صفحہ پر۔ چھوڑ، پرے کر۔“ احسن نے ہاتھ سے اخبار سائیڈ پر کیا۔

”تُو بتا...... شام کو کہاں جانا ہے؟“

”یار! وہ آفس کے ایک سینئر ذکر کر رہے تھے کہ ان کے محلے میں کچھ گھریلو سامان بک رہا ہے، وہ

دیکھنے جانا ہے۔“

”صرف دیکھنا ہی ہے تو پھر سیکنڈ ہینڈ چیزیں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ شاپ پر جا کر نئی چیزیں دیکھ۔“

حیدر جما جما کر کپڑوں پر استری کرتا ہوا بولا۔

”پسند آ گئیں تو خرید بھی لوں گا ہاتھ کے ہاتھ۔“ عادل نے اپنا ارادہ بتایا۔

”لالے! ایسا کر، سیکنڈ ہینڈ سامان پسند کرنے کے بجائے لڑکی پسند کر لے۔ سامان خود بخود آ جائے گا۔“ احسن نے مشورہ دیا۔

”ہیں......؟“

”صرف لڑکی پسند کرنے سے سامان کیسے آئے گا؟“

”میرا مطلب ہے لڑکی پسند آ گئی تو لڑکی والے تجھے پسند کریں گے۔ پھر دونوں خاندانوں کا آپس میں آنا جانا بڑھے گا۔ دن تاریخ طے ہوں گے۔ سہرا سجے گا۔ ڈولی اٹھے گی۔ دلہن گھر آئے گی۔ ساتھ میں سامان بھی آ جائے گا۔“ خاموش احسن ہوا۔ کھل کر سانس عادل نے لی۔

”یار! تیری بڑی مہربانی۔“ عادل اٹھ کر احسن کے گلے لگ گیا۔

”یہ اپنے فٹے منہ جیسے مشورے اپنے پاس رکھ۔ میں سیکنڈ ہینڈ سامان ہی خرید لوں گا۔“

”اچھا نا......“

”میرا تو پیچھا چھوڑ۔“ بمشکل احسن نے اسے خود سے الگ کیا۔

”ویسے یہ سامان لینا کس خوشی میں ہے؟“ حیدر نے استری شدہ سوٹ ہینگر پر ٹانگتے ہوئے پوچھا۔

”ڈونلڈ ٹرمپ کے صدر بننے کی خوشی میں۔“ ایک سیکنڈ کی تاخیر کے بغیر عادل نے جواب دیا۔

”اوہ......“ حیدر نے مزید کسی بھی سوال سے اجتناب کیا۔

”تو پھر کون چل رہا ہے؟“ عادل نے تینوں کو دیکھ کر سوال کیا۔

”میں......“

”میں......“ حیدر اور انس کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

☆☆☆

لائٹ براؤن کلر کے بڑے سے لکڑی کے دروازے کے سامنے وہ تینوں کھڑے تھے۔ گلی خاصی کشادہ تھی۔ گھر بھی بہت بڑا دکھ رہا تھا، گو ایسا لگتا تھا کہ باوا آدم کے زمانے میں تعمیر کیا گیا ہوگا۔

”یار حیدر! ایک منٹ......“ حیدر اطلاعی گھنٹی بجانے ہی لگا تھا کہ عادل نے روکا۔

”میں ذرا ایک بار اور کنفرم کر لوں، کہیں کسی غلط گھر میں ہی نہ گھس جائیں۔“ حیدر کا گھنٹی کی جانب بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

عادل نے فون پر دوبارہ ایڈریس کنفرم کیا۔ تسلی ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے گھنٹی بجائی۔

کچھ دیر میں دروازہ کھل گیا۔

”جی، ہمیں مستقیم چنہ صاحب نے بھیجا ہے۔ وہ سامان دیکھنا......“

بات عادل کے منہ میں ہی تھی کہ دروازہ کھولنے والا دس، گیارہ سالہ بچہ جس اسپیڈ سے آیا تھا، اسی سے بھاگ کر واپس چلا گیا۔

”وہ تینوں ہونق بنے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

”اب کیا کریں......؟“ انس نے عادل کو دیکھ کر پوچھا۔

عادل نے کندھے اچکائے۔ ”پتا نہیں۔“

تب ہی دروازے پر ایک بزرگ نمودار ہوئے۔

”شکر ہے۔“ انس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”جی، ہمیں مستقیم......“ ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ بزرگ ان کے ساتھ سے ہو کر نکلتے چلے گئے۔ عادل نے پیچھے سے آواز دی۔

”اجی، بڑے صاحب...... بات تو سنیے۔“

ذرا رکیے۔“

”نماز کا وقت نکل رہا ہے۔“ کہہ کر چلتے بنے۔

عادل تو ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ باقی دونوں کے تاثرات بھی کچھ اسی قسم کے تھے۔

”یار! کتنے عجیب لوگ ہیں یہ۔“ حیدر بڑبڑایا۔

”تین اجنبی لوگ دروازے پر کھڑے ہیں اور گھر والوں کو کوئی پرواہ ہی نہیں ہے۔“

انس نے ایک مرتبہ پھر اطلاعی گھنٹی بجائی۔

کم سے کم تین، چار منٹ یوں ہی گزر گئے۔

”میں اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا احمق ترین انسان محسوس کر رہا ہوں۔“ عادل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو تھا۔

”بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہے۔“ حیدر نے سراہا۔

”عادل بھائی! میرا خیال ہے، احسن بھائی والا مشورہ ہی مناسب تھا۔“ انس بھی کھڑے کھڑے بے زار ہو چلا تھا۔

اس سے پہلے کہ عادل کوئی جواب دیتا۔ دروازہ کھلا اور ایک انیس بیس سالہ لڑکا نمودار ہوا۔

وہ بھی رکنے یا ان سے بات کرنے کا روادار نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی نکل کر باہر چلا جاتا عادل نے ہاتھ سے اس کا راستہ روکتے ہوئے ایک ہی سانس میں مدعا بیان کر دیا۔ مبادا وہ بھی سنے بغیر ہی نہ چلا جائے۔

”تو آپ یہ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟“ اس لڑکے نے حیران ہو کر عادل سے سوال کیا۔

”تو پھر کس سے بات کریں بھائی؟“ وہ آخری حد تک زچ ہوا۔

”جنہوں نے سامان بیچنا ہے ان سے۔“ لڑکا کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

”او، اللہ کے بندے۔ گھر سے باہر تم آ رہے ہو، سامان بھی تم لوگوں نے فروخت کرنا ہے۔ تو پھر اور کون رہ جاتا ہے؟“ حیدر نے مداخلت ضروری سمجھی۔

”یہ......“ اس نے ہاتھ سے اپنے پیچھے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ گھر دیکھ رہے ہیں آپ؟“

”کافی دیر سے یہاں کھڑے ہو کر یہی گھر دیکھ رہے ہیں ہم۔“ انس نے جواب دیا۔

”اس گھر میں کم و بیش بارہ خاندان آباد ہیں اور تقریباً نہ کرتے ہوئے بھی ساٹھ سے ستر افراد۔ تو آپ کو جن سے کام ہیں، ان کا نام لے کر ان تک پہنچنے کی کوشش کریں۔“

اس نے پھر رستہ تڑوا کر بھاگنے کی کوشش کی۔

”اچھا تو پھر ان کا نام ہی بتاتا جا بھائی۔“ عادل کے اندر کی بے بسی سے غالباً اس کا دل پسیج گیا۔

”آئیں میرے ساتھ۔“ وہ واپس اندر کی طرف مڑ گیا۔

وہ تینوں شکر کرتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے گھر کے اندر آ گئے۔ گھر کیا تھا، بڑی سی حویلی تھی۔

دس پندرہ قدم چل کر وہ رک گیا اور گہرے سبز رنگ کے لکڑی کے دروازے کو زور زور سے بجانے لگا۔

”کیا ہوا؟ آ رہی ہوں۔“ اندر سے ایک زنانہ آواز سنائی دی۔

دروازہ کھلا۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون دروازے پر نمودار ہوئیں۔

”فاطمہ تائی! یہ آپ کے مہمان آئے ہیں۔“ ادھورا سا تعارف کروا کر وہ لڑکا واپس پلٹ گیا۔

”اچھا، اچھا۔ آؤ...... آ جاؤ اندر۔“ فاطمہ تائی نے ان لوگوں کے لیے راستہ چھوڑا۔ فاطمہ تائی نامی خاتون ان کو لیے ایک چھوٹے سے سجے سجائے کمرے میں آ گئیں۔

پرانا سا صوفہ، ایک طرف سنگھار میز، دیوار کے ساتھ رکھے چار موڑھے اور درمیان میں رکھی گول میز۔ جس پر سفید رنگ کا میز پوش بچھا ہوا تھا۔

”اچھا تو اب بتاؤ۔ تم تینوں میں سے لڑکا کون ہے؟“

تینوں نے بوکھلا کر اپنے اپنے سراپے پر نظر ڈالی۔ مطلب شک کی گنجائش ہے؟ فاطمہ تائی کے اس سوال نے تینوں کو ہی گڑبڑا دیا۔

”جی کیا مطلب؟“ عادل نے ہی ہمت کر کے پوچھا۔

”اس میں اتنا حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟“ فاطمہ تائی برا ہی مان گئیں۔

”تم تینوں میں سے کس کا مقصد اسے یہاں کھینچ کر لایا ہے؟“ انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر الفاظ منتخب کر کے، نئے سرے سے سوال کیا۔

”جی، میں آیا ہوں سامان دیکھنے۔ یہ دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔“ عادل بولا۔

”سامان......؟“ وہ اتنے غصے سے چلائیں کہ تینوں ہی گھبرا گئے۔

”تمیز نہیں سکھائی کسی نے تمہیں۔ سامان کہہ رہے ہو۔“ غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

عادل نے بمشکل تھوک نگل کر حیدر کو دیکھا۔

”یار! یہ سامان کو تمیز سے کیا کہتے ہیں؟“ آواز سرگوشی سے ذرا بلند تھی۔

”پتا نہیں، ہم نے تو کبھی سامان کو اتنی عزت نہیں دی۔“ حیدر نے کندھے اچکائے۔

”چلو خیر......“ وہ تھوڑا دھیما ہوئیں۔

”قد، کاٹھ اچھا ہے تمہارا۔ رنگ بھی صاف ہے۔“ ان کا لہجہ مزید نرم ہوا۔

”کچھ پڑھے لکھے بھی ہو کہ نہیں؟“

”جی، پڑھ لکھ لیتا ہے تھوڑا بہت۔“ جواب حیدر نے دیا۔

اس کو کچھ غلط ہونے کا اندازہ ہو رہا تھا۔

”اچھا، تو تم کون ہو؟“ اب انہوں نے دلچسپی سے حیدر کو دیکھا۔

”میں، اس کا دوست ہوں۔“

”اور میں بھی۔“ انس نے خود ہی اپنا تعارف بھی کروا دیا۔ اپنا آپ کچھ فالتو فالتو سا محسوس ہو رہا تھا۔

”ہوں......“ انہوں نے سر ہلایا۔

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

قیمت۔/150 روپے

سوہنی ہیئر آئل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف۔/150 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آرڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آرڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے .... 350/ روپے
3 بوتلوں کے لئے .... 500/ روپے
6 بوتلوں کے لئے .... 1000/ روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32735021

"اچھا، تو تم دوستوں کو لے کر کیوں آ گئے؟" وہ عادل سے مخاطب تھیں۔

"ہم خود آئے ہیں۔ یہ نہیں لے کر آیا ہمیں۔" حیدر نے عادل پر ترس کھاتے ہوئے اس کی مشکل آسان کی۔

"کچھ کام کی بات ہو جائے؟" سامان کہتے کہتے عادل نے عین وقت پر لفظ سامان کو کام سے بدل دیا۔

"ہاں، ہاں۔ ہوتی رہیں گی باتیں بھی۔ پہلے چائے وائے تو پی لو۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" حیدر جلدی سے بولا۔ اس کو شدت سے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

وہ حیدر کی بات ان سنی کرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ عادل نے سکون کا سانس لیا۔

"یار! یہ سامان کی خرید و فروخت کا میرے قد، کاٹھ، رنگ اور تعلیم سے کیا تعلق ہے؟" عادل نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

انس نے محض کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

حیدر البتہ پرسوچ نظروں سے عادل کو دیکھ رہا تھا۔

کیا ہوا......؟

عادل نے سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گاڑیں۔

"عادل بیٹا! مجھے تو کچھ اور ہی معاملہ لگ رہا ہے یہ۔"

"کیا مطلب؟" عادل کچھ پریشان ہوا۔

اس سے پہلے کہ حیدر مطلب سمجھاتا۔ فاطمہ تائی ایک بڑی سی ٹرے اٹھائے چلی آئیں۔

ٹرے انہوں نے میز پر رکھی، جس میں چائے کی چار پیالیاں اور ایک بسکٹ کی پلیٹ رکھی تھی۔

سستے والے رنگ برنگے بیکری کے بسکٹ۔

"معاف کرنا، زیادہ اہتمام نہیں کر سکی۔" عادل بسکٹوں کا معائنہ کر رہا تھا جب فاطمہ تائی کی آواز کان میں پڑی۔

"اہتمام تو یہ بھی زیادہ ہی ہے، ورنہ خریدار اور چائے......" وہ سوچ کر رہ گیا۔

"اچھا، تم اپنی والدہ کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟" وہ عادل سے پوچھ رہی تھیں۔

عادل کا چائے کی پیالی کی طرف بڑھنے والا ہاتھ درمیان میں ہی رک گیا۔

(چیزوں کی خریداری کے لیے بھی والدہ کا ہونا ضروری ہے کیا؟)

"اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔" جواب حیدر نے دیا۔

(اگر کوئی غلط فہمی ہے بھی تو اس کا ابھی دور ہو جانا بہتر ہے)۔

"انتقال ہو گیا؟"

"کب؟" خاتون کے چہرے پر اتنی بے یقینی تھی کہ حیدر کو صاف صاف بات کرنا پڑی۔

"دیکھیے، مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کچھ غلط سمجھ رہی ہیں۔"

"تم مصفہ آپا کی، نند کی، دیورانی کے، بیٹے کے دوست نہیں ہو؟" وہ کچھ ڈانواڈول سی کیفیت میں پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں تو۔"

اس نے فوراً گردن ہلائی۔ دائیں سے بائیں۔

"تو پھر یہاں کیوں آئے ہو؟" اب ان کے تیور کچھ کچھ خطرناک ہو چلے تھے۔

"میں نے بتایا تو تھا کہ وہ سامان......"

کہتے کہتے دانتوں تلے زبان دبائی (مبادا پھر نہ برا مان جائیں)۔

"مستقیم چٹہ صاحب نے بتایا تھا کہ آپ غالباً کچھ ضروریات زندگی وغیرہ مطلب...... فروخت کرنا چاہتے ہیں۔" بولتے بولتے ہکلا گئے۔

"اچھا، تو تم لوگ اماں کی چیزیں خریدنے آئے ہو اور میں ہونے والا داماد سمجھ کر عزت دیے چلی جا رہی ہوں۔" وہ غصے سے بولتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"چلو، کھڑے ہو جاؤ۔"

تینوں ہی گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔

"اور یہ بسکٹ واپس رکھ دو۔" انہوں نے انس کے ہاتھ میں بسکٹ دیکھ لیا تھا۔

غریب نے پہلا ہی بسکٹ اٹھایا تھا۔ جلدی سے واپس رکھ دیا۔

"یہ برابر والا گھر ہے اماں کا۔ جاؤ دیکھ لو، چیزیں۔" بے مروتی سے کہتی وہ دروازہ بند کر چکی تھیں۔

"کیا اس سے پہلے اتنی بے عزتی ہوئی بھی ہماری؟" عادل نے غمگین لہجے میں یاروں کو دیکھا۔

"ہوتی ہی رہتی ہے عادل بھائی! جانے دیں۔" انس نے تسلی دی۔

☆☆☆

کھچڑی سے بالوں والی، دبلی پتلی کمزور سی اماں جی۔ کم و بیش نوے، پچانوے برس عمر۔

آنکھوں پر موٹے موٹے عدسوں والا چشمہ۔

گھور گھور کر ان تینوں کو دیکھا۔

"ہم سامان خریدنے آئے ہیں۔ مستقیم چٹہ صاحب نے بھیجا ہے ہمیں۔"

حیدر نے اماں جی کو دیکھتے ہی صاف اور واضح الفاظ میں مدعا بیان کیا۔

"اور ہم یہاں کسی رشتے وشتے کے سلسلے میں نہیں آئے ہیں۔" عادل نے مزید وضاحت ضروری سمجھی۔

"بیٹا! اب اس عمر میں، لوگوں کو سامان کے بہانے بلا کر، میں رشتہ طے کروں گی۔ انسان کو تھوڑا بہت تو لحاظ رکھ کر بات کرنی چاہیے۔" انہوں نے کانپتی آواز میں کہا۔

"عادل بے چارہ! بولے تو برا، نہ بولے تو برا۔" حیدر نے ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"چائے پیو گے۔" انہوں نے اخلاقاً ہی پوچھا ہو گا۔

"نہیں، نہیں......"

"چائے نہیں پئیں گے۔"

"چائے تو ہم پیتے ہی نہیں ہیں۔"

تینوں نے اس قدر بے ساختہ ردعمل دیا کہ وہ کچھ چونک کر ان کی شکلیں دیکھنے لگیں۔

"اچھا، چلو آؤ۔ سامان دیکھ لو پھر۔"

"شکر ہے، یہاں سامان کہنے پر ممانعت نہیں ہے۔" انس نے عادل کے کان میں کہا۔

سامان کیا تھا۔ قدیم نوادرات کا ایک ذخیرہ تھا۔

"یہ پلنگ دیکھ رہے ہو۔" انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

لکڑی کے گول گول اونچے پایوں والا پلنگ۔ جو اتنا قدیم محسوس ہو رہا تھا کہ بے ساختہ ہی عادل کے منہ سے نکلا۔

"یہ وہ پلنگ تو نہیں ہے جس پر ہمایوں کو لٹا کر بابر نے اس کے گرد سات چکر کاٹے تھے اور اس کی بیماری اپنے سر لے لی تھی۔"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم...... لیکن اتنا جان لو کہ ملکہ وکٹوریہ تک کے استعمال میں اس طرح کے پلنگ رہے ہیں۔"

انہوں نے کچھ اس فخر سے کہا گویا پلنگ کی نہیں، کوہ نور ہیرے کی بات کر رہی ہوں۔

اور کچھ......؟

"ہاں تو گویا تمہیں بھی تاریخ سے دلچسپی ہے۔"

ابھی وہ مزید پلنگ کے بارے میں کچھ بتانے ہی لگی تھیں کہ عادل نے جلدی سے وضاحت کی۔

"میرا مطلب تھا اور کچھ جو ہم خرید سکیں۔"

"پہلے اس کا تو طے کر لو، لینا ہے یا نہیں۔"

"طے کر لیا۔" عادل جلدی سے بولا۔

"نہیں لینا۔"

بڑی بی نے خفگی سے گھور کر اسے دیکھا۔ ایسی ناقدری......

"یہ تو میں لاکھوں میں بھی نہ بیچتی، جو مجبوری نہ ہوتی۔"

"اور ہم مفت میں بھی نہ لیتے، کیسی ہی مجبوری ہوتی۔" بولا تو اس نے دل میں تھا مگر برا ہوا جو اتنا اونچا بول گیا کہ بخوبی سنائی دے گیا۔

"چلو، نکلو یہاں سے...... کچھ نہیں دکھانا مجھے ایسے بدتمیز لوگوں کو۔"

اور باہر نکل کر وہ تینوں سوچ رہے تھے کہ زیادہ محسوس کون سی بے عزتی ہوئی...... پہلی یا دوسری......

✻

عندلیب زہرا

چھوٹا سا دل

رات کی تنہائی تھی۔

دسمبر...... کی سرد رات...... گردوپیش سے بے خبر، وہ کمبل میں دبکی ڈائری لکھ رہی تھی۔ ناصر کاظمی کی غزل، آتش دان میں بجھی یادیں، تنہائی کا ذکر، اداسی کی باتیں، وہ پوری لگن سے اپنا انتخاب لکھ رہی تھی۔ چمکتے دمکتے سرورق والے، نئے نویلے رسالے پاس ہی دھرے تھے۔

"سارا بیٹا!! ابھی تک جاگ رہی ہو۔" مما نے لائٹ جلتی دیکھی تو اندر آ گئیں۔ اس نے ماتھے سے بال ہٹائے اور سر اٹھا کر مما کو دیکھا، جلدی میں وہ رسالے چھپانا بھول گئی۔ جب تک وہ ایسا کرتی مما کی نظر پڑ چکی تھی۔

"یہ پڑھائی ہو رہی ہے؟" مما نے غصے سے رسالے لہرائے اور جھپٹ کر ڈائری لی۔

"یہ خرافات لکھتی رہتی ہو تم۔" مما چلائیں۔

اس کے بعد وہی ہوا...... جس کا خدشہ تھا۔ رسالے ردی میں دے دیے اور ڈائری چولھے کی نذر ہو گئی۔

سارا روتی رہ گئی۔ مگر مما کی سخت طبیعت کے آگے نہ آنسو کام آئے' نہ کسی قسم کے جذباتی ہتھکنڈے، پیپرز کے بعد اس کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا...... سو ساری ناراضیاں، جذباتی ہتھکنڈے، ڈانٹ ڈپٹ گہما گہمی کی نذر ہو گئے اور وہ دعاؤں کے سائے تلے رخصت ہو گئی۔ شادی کے چند روز بعد مما کو صفائی کے دوران اسٹور سے اس کے رسالے ملے۔ تو بیٹی بہت یاد آئی۔

"کیا تھا جو اسے رسالے پڑھنے...... ڈائری لکھنے کی اجازت دے دیتی۔" مما کو پچھتاوے ستانے لگے۔

"یہی تو عمر ہوتی ہے پھر وہی زندگی کے جھمیلے...... مسائل۔" مما کی سوچیں بھٹک رہی تھیں۔

"بیٹیوں کے چھوٹے سے تو دل ہوتے ہیں۔ جو ذرا سی محبت، بھروسے سے کھل اٹھتے ہیں۔" مما کی آنکھیں جھلملانے لگیں جن میں ماضی کے دیے روشن ہو گئے تھے۔

☆☆☆

نشاط کو وحید مراد، کشور کمار بہت پسند تھے۔ ایک ہیرو دوسرا گلوکار...... جاوید میاں داد، عمران خان، جہانگیر خان آئیڈیل لگتے۔ زوہیب حسن، نازیہ حسن کے گانے ڈیک پر گونجتے۔ سو اس کے کمرے میں ان ہی کے پوسٹرز، کیسٹس اور میگزین ہوتے۔ یہ نہیں تھا کہ وہ بہت آزاد خیال یا شتر بے مہار قسم کی لڑکی تھی بس کالج کی لڑکیوں سے متاثر...... کچھ نوعمری کا جوش، ابال...... وہ متحرک رہتی، کلائی میں رنگین بینڈز...... پلاسٹک کی ڈیجیٹل گھڑی، اونچی پونی ٹیل اور چیونگم چباتے ہوئے اپنا آپ بہت اپ ٹو ڈیٹ لگتا...... لیکن ان ہی مشاغل کو بنیاد بنا کر پھوپھو نے اسے بے نقط سنا ڈالی تھیں۔

"ہمارا ماحول...... ہماری لڑکیاں...... اقدار۔" ان کی نوک زبان پر رہتے۔ انہیں نشاط کی سرگرمیاں "بے راہ روی" سے کم نہ لگتیں۔ حالانکہ یونیورسٹی تک پہنچتے پہنچتے اس کے کمرے سے پوسٹرز غائب ہو چکے تھے۔ کیسٹ کی جگہ کتابیں نظر آتیں...... اونچی پونی ٹیل ڈھیلی سی چٹیا میں بدل چکی تھی۔ کچھ مزاج میں ٹھہراؤ آ گیا اور کچھ ان تمام تبدیلیوں کے پیچھے وہ تبصرے...... ڈانٹ ڈپٹ...... باتیں تھیں جو وقتاً فوقتاً اس کے کانوں میں انڈیلی جاتیں۔ جب وہ خود ماں بنی تو "سخت گیر مما" تھی۔ جسے رسالے خرافات...... ڈائری لکھنا...... بے راہ روی لگتی۔ نشاط نے آنسو پونچھے اور رسالے کے کور سیدھے کیے۔ سارا کے ہاتھوں کا لمس ان پر محسوس کیا۔

"جہاں رہے خوش رہے۔" بے آواز لب دعا گو تھے۔

☆☆☆

سارا ہر روز اپنی ساس کے ماتھے کے بل گننے کی کوشش کرتی۔ جو روز اول سے جوں کے توں تھے۔ نیک فطرت تھی کچھ اچھی تربیت۔ سو ساس کا حتی المقدور خیال رکھتی۔ لیکن ان پر ذرا اثر نہ ہوتا۔ حالانکہ شادی کے بعد گھر میں واضح تبدیلی آ گئی تھی۔ جگ مگ جگ مگ کرتا گھر، ہر کام وقت پر سرانجام دیے جاتے۔ لیکن ساس پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا تھا۔

تناؤ بھری خاموشی...... بارعب انداز......

اس روز بھی ایک ملنے والی خاتون سارا کے حسن سلوک کی تعریف کر رہی تھیں۔ جب سارا نے خود اپنے کانوں سے سنا۔

"دکھاوا کرتی ہے۔ میرے معیز کو ہاتھ میں لینے کے لیے۔ ورنہ ایسی ہے نہیں۔" سارا کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔ اسے بے ساختہ خیال آیا۔

"دل کا حال تو اللہ جانتا ہے، پھر انہوں نے کیسے کہہ دیا دکھاوا کرتی ہے۔ کیا تھا دو بول تعریف کے بول دیتیں۔ خدمتوں کا اعتراف کرنے سے دل کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔" وہ بوجھل دل لیے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

معیز اس کے لیے روایتی شوہر تو نہ تھا۔ مگر غیر روایتی بھی نہ تھا۔ بس کبھی گرم، کبھی سرد...... کبھی مہربان تو کبھی نامہربان...... لیکن دل تو نادان ہے...... کبھی کبھی مچل بھی جاتا ہے۔ سو آج بھی ایسا ہی ہوا۔

ان کی شادی کی پانچویں سالگرہ تھی۔ معیز نے کبھی اہتمام نہ کیا تھا۔ سارا خود ہی یاد رکھتی اور کرواتی۔ اچھا سا کھانا، گفٹ، کچھ نیا...... وہ اس دن کے لیے معمول سے ہٹ کر اہتمام کرتی۔ چاہے پھول کی کلی سے ہی سہی۔

اس دن، چار سالوں میں پہلی بار اس کا جی چاہا کہ معیز اور وہ لانگ ڈرائیو پر جائیں۔ بس وہ دونوں ہوں اور کوئی نہ ہو...... ساحل سمندر پر ہاتھ تھامے، ایک دوسرے کو کیٹس کی شاعری سنائیں...... اچھا سا ڈنر کریں...... ہلکی ہلکی موسیقی کے ساتھ...... اب یہ تخیل کی کارفرمائی تھی جو وہ اپنی خواہش کو الفاظ کا جامہ پہنا بیٹھی۔ پہلے تو معیز کچھ غائب دماغی، کچھ حیرت اور کچھ انجان نظروں سے دیکھتا رہا...... پھر سرد مہری سے

بولا۔

"اماں کو سونے سے پہلے گرم دودھ دے دیا تھا؟ اگلے ہفتے فاران کا ایڈمیشن کروانا ہے اسے ٹیسٹ کی تیاری کرواؤ۔"

اس نے بھی ہمت نہ ہاری۔ سو رومینٹک لہجے میں بولی۔

"معیز! کل ہماری زندگی کا خاص دن ہے۔ اس کے لیے اہتمام ضروری ہے ناں۔"

معیز نے بے زاری سے سر ہلایا۔

"یار! کل میرا آفیشل ڈنر ہے۔ تم بھی ٹین ایجرز والی حرکتیں چھوڑو...... اور لائٹ آف کردو۔"

سارا سن ہوتی کیفیت کے ساتھ سنتی رہی اور پھر پیر پٹخ کر باہر چلی گئی۔ "کیا تھا جو ذرا سا دل رکھ دیتے۔ میں نے کون سا بڑے مطالبے رکھ دیے تھے۔ چھوٹا سا دل ہی تو ہے جسے ذرا سی توجہ اور دو بول محبت کے چاہئیں مگر کوئی سمجھے بھی تو......" آنسو امڈتے آ رہے تھے۔

☆☆☆

دن بے کیف اور بے لطف گزر رہے تھے۔

ایک سا معمول...... ایک سا مزاج...... جیسے وہ کسی گنبد میں قید ہو گئی ہے۔ دل کا غبار اتنا بڑھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

وہ خالی الذہن بیٹھی تھی۔ ذہن میں اسکرین چل رہی تھی۔ جس پر ماضی کے واقعات رواں تھے۔ اس کا ذہن منتشر تھا۔ سارا کو شاہد آفریدی پسند تھا۔ مگر دادی نے نامحرم، توبہ توبہ کہہ کر اس کا پوسٹر اتروا دیا تھا۔ حالانکہ وہ بحیثیت کرکٹر اسے پسند کرتی تھی۔

(کم عمری کا جوش، جنون) جیسا کہ بچپن میں اسے باربی، ڈول ہاؤس اور ٹیڈی پسند تھے۔ وہ ان کے کارٹون، کھلونے اور بیگز لینا پسند کرتی تھی۔ ڈائری پر غزلیں لکھنا پسند تھا۔ ناصر کاظمی، محسن نقوی، کی کتابیں خریدنا پسند تھا۔ اس نے بے دردی سے آنسو رگڑے۔ مما نے ڈائری پھاڑ دی تھی۔ رسالے ردی میں بیچ دیے۔ چمکتے دمکتے ٹائٹل والے رسالے، ابھی تک غم تازہ تھا۔ (اس کے دل میں ٹیس سی ابھری)

"یہ دل تو چھوٹا سا ہوتا ہے۔ ذرا سی محبت اور مان ہی تو مانگتا ہے اور بس...... اگر مادی اشیاء، روپیہ، پیسہ خوشیوں کے ضامن ہوتے تو شہزادیاں کبھی دکھی نہ ہوتیں۔" وہ دکھے دل سے یہی سوچے جا رہی تھی۔

کبھی کسی نے اس کا اعتراف نہ کیا تھا۔ وہ بہو، بیوی، بیٹی، غم گسار، محبوبہ، دوست سب کا کردار نبھاتی تھی۔ معیز نے کبھی دو جملے بھی نہ کہے تھے۔ جس سے معتبر ہونے کا احساس جاگتا۔

اس کی آنکھوں سے سیل رواں تھا۔ مگر وہ بے خبر تھی۔ بس ذہن میں منفی خیالات کی یلغار تھی۔ بس اپنی زندگی، اپنی ذات کے بے مصرف ہونے کا احساس تھا اور کچھ نہیں......

"مما! کیوں رو رہی ہیں۔" فاران کب آیا، اس کی گود میں آ کر بیٹھ گیا، اسے خبر نہ ہو سکی۔ فاران نے اپنی ہتھیلیوں سے اس کے گال صاف کیے۔ وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

"یہ...... چاکلیٹ کھائیں۔" اس کے ہاتھ میں ادھ کھائی چاکلیٹ تھی جو اس نے سارا کے لبوں سے لگا دی۔

سارا کو لگا جیسے ساری کلفت دور ہو گئی ہے۔ جیسے صحرا میں ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں یا کڑکتی دھوپ، برستی بارش میں بدل جائے۔ دل تو ننھا سا ہے، چھوٹا سا ہوتا ہے۔ جو ذرا سی محبت، توجہ سے بہل جاتا ہے۔ ماؤں کے دل تو ویسے بھی ایک دم راضی ہو جاتے ہیں۔ اس نے چاکلیٹ کا ذرا سا ٹکڑا توڑا۔ منہ میں گھلتی چاکلیٹ نے ذہنی تناؤ ختم کر دیا تھا۔

جو کچھ اس کے گھر والے، سسرال والے اور شوہر نہ سمجھ سکے تھے۔ وہ چار سالہ فاران سمجھ گیا تھا۔ وہ اس کے دل کا ٹکڑا تھا جو اس کے شکستہ دل کو کئی گنا بڑھا گیا تھا۔

ماحول یکدم خوش گوار لگنے لگا اور طبیعت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے فاران کو گلے سے لگا لیا تھا۔

☆

راشدہ رفعت

سبین کا سسرال

ناولٹ

برسوں پہلے سسرال کا خوف سبین کے دل و دماغ میں بیٹھ چکا تھا۔ آپی اور بجو کی شادی بھرے پرے سسرالوں میں ہوئی تھیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی دو چار دن میکے گزارنے آتی تو کپڑے لتوں کے بیگ کے علاوہ ایک نادیدہ گٹھڑی سسرال والوں کی برائیوں کی بھی ہوتی۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے، چلتے پھرتے انہیں سسرال والوں کی دل دکھانے والی باتیں یاد آتی رہتیں اور وہ ماں سے دکھڑے روتی رہتیں۔ امی ٹھنڈا سانس بھر کر بیٹیوں کو صبر کی تلقین کرتیں۔

"میرے بچے! سسرال پھولوں کی سیج کا نہیں بلکہ کانٹوں سے بھرے بستر کا نام ہے۔ کانٹوں سے الجھنے سے گریز میں ہی عافیت ہے ورنہ اپنا دامن ہی تار تار ہوتا ہے۔" امی سامعہ آپی کو سمجھاتیں۔ پاس بیٹھ کر اخبار پڑھتے ابو عینک کے شیشوں کے اوپر سے امی کو جھانکتے۔ زباں دانی کے اس مظاہرے پر ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔

عارفہ بجو کی بھاپھے کٹنی ساس اور تیز طرار نندوں کی تیزی طراری کے قصے سن کر امی انہیں بھی کچھ اسی قسم کی نصیحتیں کرتیں۔

"بھرے سسرال میں اچھی زندگی گزارنے کے لیے آنکھیں اور کان کھلے اور زبان بند رکھنی پڑتی ہے عارفہ! صبر سے کچھ برس گزار لو۔ آنے والا وقت تمہارا ہی ہوگا۔" وہ بیٹی کو پیار سے سمجھاتیں۔

"تمہاری امی! بالکل صحیح کہہ رہی ہیں بیٹے۔ ماضی میں اس گھر میں بھی تخت و تاج کے پیچھے بہت برائیاں ہوئی ہیں۔ تمہاری امی نے صبر، حوصلے اور ثابت قدمی سے کام لیا۔ اب دیکھ لو تخت، تاج کے ساتھ ساتھ سرتاج بھی تمہاری امی کی مٹھی میں ہیں۔ تمہیں بھی صبر اور حوصلے سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ چھوٹی بڑی باتیں ہر گھر میں ہوتی ہیں، ان پر کڑھنے کے بجائے نظر انداز کر دیا کرو۔" ابو بھی بیٹی کو محبت بھرے انداز میں سمجھاتے۔

"کہنا آسان ہے ابو جی اور کرنا مشکل۔ آخر

انسان کب تک اور کتنا برداشت کرے۔" عارفہ بجو کی آواز بھرا جاتی۔

سبین بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ عارفہ بجو نے بچپن میں اس کے بہت لاڈ اٹھائے تھے۔ اسے بھی بجو سے بہت محبت تھی، اپنی پیاری بجو کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل کٹ جاتا۔ وہ کتنی کمزور ہو گئی تھیں۔ بھرے پرے کنبے میں بڑی بہو بن کر گئی تھیں، وہاں کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتیں پھر بھی ساس، نندوں کی کڑوی کسیلی باتیں سننے کو ملتیں۔ سبین کڑھتے ہوئے سوچتی کہ سسرال والوں کو بہو کے ساتھ ہر طرح کے ناروا سلوک کا گویا لائسنس ملا ہوتا ہے۔ بہو بے چاری کو تو بس صبر اور برداشت سے کام لینا ہوتا ہے۔

☆☆☆

سبین نے کالج میں قدم رکھا تو سہیلیوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی خواتین کے ڈائجسٹ پڑھنے لگی۔ ہر ڈائجسٹ میں دو چار کہانیاں تو ضرور ہی سسرال والوں کے ظلم و ستم پر مبنی ہوتیں۔ سسرال نامی بلا کا خوف جو پہلے ہی دل و دماغ میں پنجے گاڑے بیٹھا تھا، مزید بڑھ گیا۔ دو چار برس مزید گزرے وہ کالج سے یونیورسٹی میں آ گئی۔ ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق اب باقاعدہ لت بن چکا تھا۔ اب ان رسالوں میں کہانیوں کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے سلسلے بھی شامل تھے جس میں شادی شدہ عورتیں اپنی شادی کے بعد کی زندگی کے تجربات قارئین سے شیئر کرتیں۔ ننانوے فیصد عورتوں کے تجربات بھیانک ہوتے کیونکہ انہیں خوف ناک ترین سسرالیوں سے نمٹنا پڑتا تھا۔

یہ داستانیں پڑھ کر سبین کو جھرجھری آ جاتی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد امی، ابو نے اس کے لیے بر ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ بڑی دونوں بہنوں کے رشتے جتنی آسانی سے مل گئے تھے، سبین کی باری میں جانے کیوں ڈھنگ کا رشتہ ڈھونڈنا اتنا مشکل ہو گیا تھا حالانکہ وہ بڑی دونوں بہنوں سے زیادہ خوب صورت اور پڑھی لکھی تھی لیکن اس کے لیے کوئی معقول رشتہ نہ مل رہا تھا۔ اس تاخیر پر سبین دل ہی دل میں شکر مناتی تھی لیکن جس طرح بکرے کی ماں طویل عرصے تک خیر نہیں منا سکتی اور اسے چھری تلے آنا ہی پڑتا ہے اسی طرح سبین کی آزادی کے دن تمام ہوئے۔ عارفہ بجو نے اپنی چھوٹی لاڈلی بہن کے لیے اپنے سسرالی رشتہ داروں میں سے ایک عدد رشتہ دریافت کر لیا تھا۔

شہریار ان کے چچا سسر کا بیٹا تھا۔ برسر روزگار، تعلیم یافتہ اور ظاہری طور پر بھی خاصا ہینڈسم تھا۔ شہریار کے گھر والوں نے پہلی بار آمد پر ہی سبین کو سند قبولیت بخش دی۔ امی تو خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں کہ اتنی اچھی جگہ سبین کا رشتہ طے پا گیا۔ سبین کا حیرت اور صدمے سے برا حال تھا۔ عارفہ بجو کے تنک چڑھے سسرال والوں کی داستانیں سنتے سنتے اتنے برس بیت چکے تھے اور اب بجو نے اس کے لیے بھی اسی سسرال میں سے رشتہ ڈھونڈ نکالا تھا۔

"ارے میری جان! سسرال کا دم چھلا تو ہر رشتے کے ساتھ لگا ہوتا ہے۔ شہریار بہت اچھا لڑکا ہے۔ ایسے رشتے تو قسمت والوں کو ملتے ہیں، بجائے شکر کرنے کے تم منہ بسور کر بیٹھ گئی۔" سامعہ آپی نے اسے پیار بھرے لہجے میں سمجھایا تھا۔ اتنے میں عارفہ بجو بھی ادھر آ نکلیں۔

"یہ کیوں منہ بنا کر بیٹھی ہے؟" انہوں نے سامعہ آپی سے پوچھا۔

"کہتی ہے شہریار کا تعلق بجو کے سسرال سے ہے۔" سامعہ آپی نے مسکرا کر بتایا۔

"ہاں تو اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ دیکھے بھالے لوگ ہیں، ان کی کوئی چیز ہم سے چھپی نہیں اور شہریار بھی ہماری آنکھوں کے سامنے جوان ہوا ہے۔ سلجھی ہوئی عادات و اطوار کا مالک ہے اور ہمیں کیا چاہیے پگلی۔" انہوں نے بھی پیار سے بہن کو سمجھایا اور پگلی کی موٹی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

"آپ کے سسرال والے کتنے تیز طرار لوگ ہیں بجو! اور آپ کہہ رہی ہیں کہ میں ان میں رشتہ جڑنے پر شکر مناؤں۔"

"ارے چھوڑو، اب ایسے بھی تیز طرار نہیں اور اجنبی انجان لوگوں میں رشتہ جڑ جائے تو کیا گارنٹی ہے کہ وہ تیز طرار نہیں نکلیں گے۔" بجو رسانیت بھرے لہجے میں بولیں اور اس کا دھیان تو پہلے فقرے میں ہی اٹک گیا۔

"کیا کہہ رہی ہیں بجو! وہ اتنے بھی تیز طرار نہیں۔ آپ بھول گئیں آپ کی شادی کے بعد آپ کے سسرال والوں نے آپ کو کتنا ٹف ٹائم دیا تھا۔" اس نے انہیں یاد دلایا۔ بجو مسکرا دیں۔

"میری جان! جب میں بھی کم عمر اور نادان تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پہروں کڑھتی تھی پھر بڑی بہو بن کر گئی تو ذمہ داریاں بھی بہت تھیں۔ آہستہ آہستہ جب اس گھر میں اور بہوویں آئیں تو ذمہ داریاں بٹتی چلی گئیں۔ سسرال والے بھی بہوؤں کے ساتھ ایڈجسٹ ہونا سیکھ گئے۔ میرے تو سونے، جاگنے، کھانے پینے غرض ہر چیز پر ان کی کڑی نظر تھی۔ میں اور تمہارے دولہا بھائی اکٹھے بیٹھ کر کھانا نہ کھا سکتے تھے اور اب میرے چھوٹے دیور اپنی بیویوں کے ساتھ مزے سے ہوٹلنگ کرتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں پھر تم کون سا میرے سسرال میں شادی ہو کر جا رہی ہو۔

ہاں سبین! چچا میرے سسر کے بھائی ہیں اور ان کے گھر کا ماحول ہمارے گھر سے خاصا مختلف ہے، نہ ہی تم بڑی بہو بن کر جا رہی ہو۔ بڑی بہو کے جتنے چاؤ چونچلے اٹھائے جاتے ہیں اس کے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بار بھی اتنا ہوتا ہے جبکہ بعد کی بہوؤں کے نہ تو زیادہ چاؤ چونچلے اٹھائے جاتے نہ ہی وہ ہر وقت سسرال والوں کی کڑی نگاہوں کی زد میں رہتی ہیں۔ بڑی جٹھانیوں کی موجودگی میں گھر کے طور طریقے سیکھنے کے لیے گائیڈ لائن بھی ملتی ہے۔ کوئی بھی کام کرنے کے لیے خود سے دماغ پر زور نہیں ڈالنا پڑتا۔ جیسے بڑی بہوویں کر رہی ہیں، آپ بھی ویسا طرز عمل اپنا لیں، ایڈجسٹ ہونے میں مشکل پیش نہیں آئے گی۔" عارفہ بجو نے اسے لمبا چوڑا لیکچر ہی دے ڈالا تھا۔

"اور ہماری سبین تو بہت سمجھ دار ہے۔ یہ اپنی سمجھ داری سے کام لے کر سسرال میں بہت آسانی سے ایڈجسٹ ہو جائے گی۔" سامعہ آپی نے چھوٹی بہن کو محبت سے دیکھا۔ سبین گہری سانس کھینچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

شادی بخیر و خوبی انجام پائی اور بالآخر سبین نے سسرال میں قدم رنجہ فرما لیا تھا۔ وہاں ہڑبونگ کا عجیب ہی عالم تھا۔ کسی کو دلہن کے استقبال کے لیے نچھاور کیے جانے والی پھولوں کی پتیاں نہیں مل رہی تھیں۔ کوئی چوکھٹ پر ڈالنے کے لیے تیل کی شیشی ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی نند ثمرہ بھائی کا راستہ روکے نیگ کا مطالبہ کر رہی تھی۔

"بس بہت ہو گیا۔ دلہن کو اندر تو آنے دو۔ پھر کرتے رہنا رسمیں وغیرہ۔" یہ دبنگ آواز اس کے سسر محترم کی تھی، فوراً حکم کی تعمیل ہوئی اور اسے اندر آنے کا راستہ دیا گیا۔ سبین نے سکون کا سانس لیا۔ تھکن سے برا حال تھا۔ بھاری بھرکم شرارہ، زیورات کا بوجھ، شرم سے جھکی گردن اور ہائی ہیل کا جوتا۔ اس سے کھڑا ہونا محال ہو رہا تھا۔ سسر کی مداخلت پر اسے ہال کمرے میں جا کر صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ اب رسموں کی کوریج کے لیے مووی میکر کا انتظار تھا جو شادی کے فنکشن کی مووی بنا کر ساتھ ہی واپس آیا تھا۔ پندرہ منٹ انتظار کا کہہ کر وہ گیٹ سے ہی واپس پلٹا تھا اور اب تک واپس نہ لوٹا تھا۔ سبین سر جھکائے صوفے پر بیٹھی تھی۔ ثمرہ نے اسے کولڈ ڈرنک کا گلاس لا تھمایا تھا۔ اس نے دو گھونٹ بھر کر گلاس واپس کر دیا۔ ہال کمرہ رشتہ دار خواتین سے بھرا ہوا تھا، سب تھکے ہارے تھے۔ کارپٹ پر کوئی نیم دراز تھا تو کوئی کشنز کے سہارے بیٹھا تھا۔ چھوٹے بچوں کی ریں ریں بھی جاری تھیں لیکن سب باتوں میں مشغول تھے۔

"اور سناؤ فاخرہ بہن! تمہاری نند کی بیٹی روبی

واپس سسرال گئی یا ابھی تک میکے بیٹھی ہے۔“ ایک خاتون نے دوسری کو مخاطب کیا۔

”ارے نہیں جاتی بھئی، ضد کی پکی ہے۔ کہتی ہے میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور اس دھوکے میں گھر والے بھی برابر کے شریک ہیں۔ اب تو گھر بیٹھ کر گھر والوں کے سینوں پر ہی مونگ دلوں گی۔“ خاتون جن کا نام فاخرہ تھا انہوں نے ٹھٹھا لگاتے ہوئے دوسری خاتون کو جواب دیا۔

”ارے ہائے کیسا دھوکا بھئی، کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے۔“ کسی اور باریک سی آواز والی آنٹی نے پوچھا۔

”بس شاہدہ! کیا پوچھتی ہو۔ بچی کو شادی سے پہلے کہہ دیا تمہارا دولہا بالکل فواد جیسا ہے۔ بے چاری کو تصویر دکھائی نہیں، شادی کے بعد جب اس نے دولہا دیکھا تو غش کھا گئی۔ کہنے لگی میں تو فواد خان جیسا بندہ سوچے بیٹھی تھی یہ تو فواد چوہدری جیسا شخص نکل آیا۔“ فاخرہ آنٹی نے قہقہہ لگاتے ہوئے بتایا تھا۔ سب ہی ہنس پڑے تھے۔ سبین نے بھی بہت مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی۔

”اور کچھ پتا چلا اکرام بھائی کے ساتھ کیسا ہاتھ ہوا؟“ ایک اور خاتون نے بھی ہنستے ہوئے دوسرا موضوع چھیڑا۔

”ارے اکرام کے ساتھ کون ہاتھ کر سکتا ہے۔ ایک نمبر کا کنجوس اور کائیاں شخص ہے پھر بلا کا ہوشیار۔ اس کے ساتھ کس نے کیا کر دیا۔“ سبین کی ساس رخسانہ نے اچنبھے سے پوچھا۔

”کیا بتاؤں رخسانہ بھابھی! اکلوتی بیٹی کی شادی کی لیکن جہیز دینے میں بخل سے کام لیا۔ بچی نے ضد کی کہ فریج تو لازمی لے کر جاؤں گی تو فریج پسند کروانے داماد کو اپنے ساتھ الیکٹرانکس کی دکان پر لے گئے۔ سوچا تھا ٹی وی کے اشتہار کی طرح داماد صاحب مسکراتے ہوئے فرمائیں گے۔ میرے گھر کی چیز کے پیسے آپ کیوں دیں۔ لیکن ہوا یہ کہ داماد نے فریج کے ساتھ اے سی اور پچپن انچ کی ایل ای ڈی کی فرمائش بھی کر دی۔“ خاتون نے لطف لیتے ہوئے بتایا۔ کمرے میں ایک اور قہقہہ گونجا۔ سبین خاموشی سے اپنے سسرالی رشتہ داروں کی گفتگو سننے پر مجبور تھی۔ سب اپنی گپ شپ میں مشغول تھے، انہیں نئی نویلی تھکی ہاری دلہن سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔

”آخر یہ مووی والا کب آئے گا۔ رسمیں ہو جائیں تو سبین کو اس کے بیڈ روم میں پہنچاتے ہیں۔“ آخر اس کی بڑی جٹھانی نزہت کو ہی خیال آیا۔

”مووی بنوا بنوا کر پیٹ نہیں بھرا تم لوگوں کا۔ جب سے شادی کی تقریبات شروع ہوئی ہیں، تمہاری موویاں ہی بن رہی ہیں۔ جو رسم کرنی ہے کرو اور پھر سونے کا بندوبست کرو۔ کل ولیمے کا فنکشن ہے، صبح سے اس کی مصروفیت شروع ہو جائے گی۔ چند گھنٹوں کا تو آرام کرنے دو۔ گھر میں عجیب ہڑ بونگ مچی ہے، سکون کا ایک پل میسر نہیں۔“ یہ غصیلی سی آواز سبین کے سسر کی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہے ہیں یٰسین بھائی! اتنی رات ہو گئی ہے۔ جلدی سے رسمیں نمٹاؤ اور سونے کا انتظام کرو۔ بھابھی جان! بتائیں مجھے آج بستر کیسے لگاؤں۔ کل تو شاکرہ ممانی اور ان کی بچیاں سبین کے بیڈ پر سو گئی تھیں، آج کیسے سونا ہے؟“ شہریار کی چھوٹی پھوپھو بھاوج سے استفسار کر رہی تھی۔ سبین جی ہی جی میں کلس کر رہ گئی یعنی کہ کل اس کے نئے بیڈ پر مہمان خواتین کو سلایا گیا تھا۔ اس کی نفاست پسند طبیعت پر یہ بات بہت گراں گزری تھی لیکن کلسنے کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

”مووی نہیں بن رہی تو رسمیں کرنے کا فائدہ۔ میں تو پھر سونے جا رہی ہوں۔“ اس کی چھوٹی نند ثمرہ نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

”اے بٹیا! اتنی نویلی دلہن کے بھی تو کچھ ارمان ہیں۔ یٰسین بھائی سچ کہہ رہے تھے، تمہیں تو بس اپنی مووی سے غرض ہے۔“ ایک رشتہ دار بزرگ خاتون نے ثمرہ کو ٹوکا۔ سبین کے بس میں ہوتا تو وہ اس خاتون کی غلط فہمی دور کر دیتی۔ ان فضول سی رسموں کے حوالے سے اس کے دل میں کوئی ارمان نہ تھا، وہ تو جلد از جلد اپنے بیڈ روم میں جانا چاہ رہی تھی۔ اس جھگڑے سے اس کا سر چکرانے لگا تھا۔

”نزہت، فرحین! کہاں ہو بھئی تم۔ فٹافٹ رسمیں نمٹاؤ اور دلہن کو اس کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔“ اس کی ساس نے دونوں بڑی بہوؤں کو پکارا۔

”یہ شادی تو بہت تھکا دینے والا کام ہے یار! میری توبہ جو میں آئندہ کوئی شادی کروں۔“ شہریار نے بیڈ روم میں پہنچ کر دوستانہ سے انداز میں اس سے پہلی بات یہ کی تھی۔ سبین کے لبوں پر حیا آلود مسکراہٹ بکھر گئی۔ ایک رات کی رفاقت میں ہی وہ جان گئی تھی کہ اس کے والدین نے اس کے لیے بہترین شخص کا انتخاب کیا ہے۔ جیون ساتھی کے حوالے سے جو خدشات اور واہمے دل میں پنپ رہے تھے، وہ آپ ہی آپ دم توڑ گئے۔ ولیمے کے فنکشن میں جب ماں، بہنیں بے تابی سے سبین سے ملیں تو سبین کی مطمئن اور مسرور مسکراہٹ دیکھ کر ان کے دل بھی شانت ہو گئے تھے۔

☆☆☆

آہستہ آہستہ مہمان گھر سے رخصت ہوئے۔ سب سے آخر میں سبین کے بڑے جیٹھ اور جٹھانی واپس ہوئے تھے۔ اویس بھائی فوج میں تھے، آج کل ان کی پوسٹنگ پشاور میں تھی۔ ان کی بیگم نزہت اچھے مزاج کی تھیں، ان چار، پانچ دنوں میں انہوں نے سبین کا ہر ممکن خیال رکھا تھا۔ ان کے بچے بھی تمیز دار اور سلجھے ہوئے تھے۔ اویس بھائی سے چھوٹے نبیل بھائی تھے۔ ان کی بیوی فرحین کا نام تو سبین سے ملتا جلتا ہی تھا لیکن ابھی تک سبین کو ان کے مزاج کا ٹھیک سے اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ کاموں کی زیادتی کی وجہ سے جھنجلائی ہوئی پھرتی رہتیں۔ ان کے اوپر تلے کے دو بیٹے تھے۔ چار سالہ شاہ میر اور ڈھائی سالہ شاہ زر۔ دونوں بچے بلا کے شرارتی تھے، جب بھی سبین کے کمرے میں گھستے ڈریسنگ ٹیبل پر سجے سامان کو تہس نہس کر دیتے۔ سبین صبر کے گھونٹ بھرنے کے سوا کچھ نہ کر سکتی۔

نبیل بھائی سے چھوٹی آصفہ باجی اس کی بڑی نند فیملی سمیت ملائیشیا میں بستی تھیں اور باوجود شدید خواہش کے شہریار کی شادی میں پاکستان نہ آسکی تھیں۔ آصفہ کے بعد شہریار کا نمبر تھا۔ پھر ثمرہ تھی جو تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ سب سے چھوٹا آزر ایف ایس سی کر رہا تھا۔ وہ پڑھاکو سا لڑکا تھا جس کی زندگی کا واحد مقصد میڈیکل کا میرٹ بنانا تھا۔ بارات اور ولیمے کا فنکشن بھی اس نے مارے باندھے بھگتایا تھا ورنہ وہ کتابوں سمیت اپنے دوستوں کے پاس کمبائن اسٹڈی کرنے چلا جاتا اور رات کو سب کے سونے کے بعد گھر لوٹتا تھا۔

رخسانہ آنٹی اس کی ساس محترمہ (جنہیں وہ جٹھانیوں کی دیکھا دیکھی امی کہنے لگی تھی) بھاری بھر کم خاتون تھیں۔ اپنے بے تحاشا بڑھے ہوئے وزن کی وجہ سے ان کا چلنا پھرنا محال تھا۔ وہ عموماً ہال کمرے کے مخصوص گوشے میں بچھے تخت پر نیم دراز رہتیں اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے زبانی احکامات جاری کرتے ہوئے گھر کا انتظام و انصرام سنبھالتی تھی۔ یٰسین انکل یعنی موجودہ ابو اس کے سسر محترم غصے کے خاصے تیز تھے۔ سبین نے عارفہ بجو کی زبانی ان کے غصے کی داستانیں سن رکھی تھیں اور وہ شادی سے پہلے بھی ان کے غصے سے خائف ہوتی تھی تب بجو نے اسے تسلی دی تھی۔

”گھر کا سربراہ زور آور ہو تو گھر کی عورتیں اپنی حد میں رہتی ہیں۔ مسکین اور دبو سا سسر ہو تو ساس، نندیں فتنہ گر ثابت ہوتی ہیں۔ میرے سسرال کی مثال تمہارے سامنے ہے اس لیے یٰسین چچا کے غصے کی وجہ سے پریشان مت ہو اور ان کا غصہ زیادہ تر اپنے بیوی بچوں پر نکلتا ہے۔ بہوؤں سے تو لحاظ سے ہی بات کرتے ہیں۔“ عارفہ بجو نے اسے تسلی دی تھی اور ابھی تک تو ان کا کہا درست ثابت ہو رہا تھا۔

سبین ڈرتے جھجکتے سسر کو سلام کرتی۔ وہ وعلیکم السلام کہہ کر سر پر ہاتھ پھیر دیتے۔ کبھی

کبھی جیتی رہو بھی کہہ دیتے۔ اس سے زیادہ سسر، بہو کا کوئی مکالمہ نہ ہوتا تھا۔ ہاں اپنی بیوی اور بچوں پر وہ کسی نہ کسی بات پر برستے ہی رہتے لیکن شاید وہ سب بھی اس گھن گرج کے عادی ہو چکے تھے، سو سکون سے اپنے معمولات نمٹاتے رہتے۔

سبین بھی آہستہ آہستہ اس اجنبی ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سسرال کی اجنبی سرزمین پر صرف ایک شخص اپنا لگنے لگا تھا لیکن شہریار کے مزاج سے مکمل آشنائی حاصل کرنے میں کچھ وقت لگنا تھا۔

سبین کی خواہش اور کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد شہریار کے دل میں جگہ بنانے کے ساتھ اس کے گھر میں بھی اپنا مقام بنالے۔ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی اس نے گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔

"بہو! پہلے کھیر میں ہاتھ ڈالنا پھر جو مرضی کام کرنا چاہو کرلینا۔" رخسانہ بیگم اسے رسانیت بھرے انداز میں ٹوکتیں۔

"ارے کرنے دیں نا امی! یہ سب شروع شروع کا شوق ہوتا ہے۔ یاد نہیں فرحین بھابھی بھی اپنی شادی کے فوراً بعد کیسی ایفی شنسی جھاڑتی تھیں اور اب گھر کے کام کرتے ہوئے ان کے ماتھے کے بل ہی کم نہیں ہوتے۔" ثمرہ نے آہستہ آواز میں ماں کو مخاطب کیا۔ دسترخوان پر سے برتن سمیٹ کر باہر جاتی سبین کی سماعتوں تک یہ سرگوشی پہنچ گئی تھی۔ اسے ثمرہ کا لب ولہجہ بالکل پسند نہ آیا تھا لیکن وہ رک کر اسے ٹوکنے کی مجاز نہ تھی سو چپ چاپ برتن لیے کچن میں آ گئی۔ سنک میں پہلے ہی گندے برتنوں کا ڈھیر جمع تھا۔ اس نے پہلے تو کچن کا پھیلاوا سمیٹا پھر برتن دھونا شروع کر دیے۔

"ارے تم کیوں برتن دھونے لگیں۔ شام کے برتن دھونے کی ذمہ داری ثمرہ کی ہے۔" اتنے میں ہی فرحین بھابھی ادھر آ نکلی تھیں۔

"کیا فرق پڑتا ہے بھابھی! برتن میں دھو لیتی ہوں۔" اس نے جٹھانی کو مسکرا کر مخاطب کیا۔

"ابھی تو تمہیں واقعی کوئی فرق نہیں پڑ رہا کیونکہ سارا دن تقریباً فارغ ہی ہوتی ہو لیکن جب گھر کی ذمہ داریاں سر پر پڑیں گی تو پھر اپنے حصے کا کام بھگتانے کے بعد جسم میں اتنی ہمت ہی نہیں بچے گی کہ دوسروں کے چھوڑے کام بھی نمٹاؤ اور یہ ثمرہ بہت کام چور اور ڈھیٹ ہے۔ صرف ایک وقت کے برتن دھونا اس کی ڈیوٹی ہے، اس میں بھی ڈنڈی مارتی ہے۔" فرحین بھابھی نے چھوٹی نند کی دھڑلے سے برائی کی۔ ان کا خیال تھا کہ جواب میں سبین بھی کچھ بولے گی لیکن سبین نے اپنی بہنوں کی شادی شدہ زندگی سے بہت سے سبق سیکھ رکھے تھے۔

سسرالی رشتہ داروں کے ساتھ محتاط طرز عمل اپنانا ہی دانش مندی ہے۔ کم از کم اس وقت تک جب تک کسی کے مزاج سے مکمل آشنائی حاصل نہ ہو جائے، اس کے بعد ہی باہمی اعتماد کا رشتہ استوار ہو سکتا تھا۔

"چلو خیر تم برتن دھو ہی رہی ہو تو ساتھ ہی چائے کا پانی بھی چڑھا لو۔ میں ذرا شاہ میر کو ہوم ورک کروا رہی ہوں، کل اس کا ویکلی ٹیسٹ ہے۔" فرحین بھابھی جو اسے ثمرہ کے حصے کا کام کرنے سے روک رہی تھیں، اب اپنے حصے کا کام بھی اس کے سپرد کر کے چلتی بنیں۔ سبین نے گھر بھر کی چائے بنائی تھی۔

اگلی صبح جب ناشتے کے وقت چائے بنانے کا موقع آیا تو فرحین بھابھی فریج میں سے دودھ کا جگ لے کر ساس کے پاس پہنچیں۔

"ذرا سا دودھ بچا ہے امی! گھر بھر کی چائے کیسے بناؤں۔ آزر سے کہہ کر دودھ کا پیکٹ منگوا دیں۔"

"ارے جب رات کو دودھ پتی کے دور چلیں گے تو صبح کے لیے دودھ کہاں سے بچے گا۔ کتنی بار کہا ہے قہوہ بنا کر چائے بنایا کرو پر میری سنتا کون ہے۔" رخسانہ بیگم بڑبڑانا شروع ہو گئی تھیں۔

"مجھ سے کیا کہہ رہی ہیں۔ رات کو چائے سبین نے بنائی تھی۔" فرحین بھابھی نے فوراً جواب دیا تھا۔

قریب بیٹھی سبین خائف سی ہو گئی، اس نے تو اپنے میکے والے حساب سے رات کے کھانے کے بعد زیادہ دودھ والی چائے بنائی تھی۔ شہریار نے تو چائے پی کر باقاعدہ تعریف بھی کی تھی۔

"اسے کہتے ہیں چائے۔ فرحین بھابھی تو جانے کیسا جوشاندہ بنا کر پلا دیتی ہیں۔"

"چائے اچھی لگی ہے تو روزانہ رات کی چائے میں ہی بنا لیا کروں گی جناب!" اس نے مسکرا کر شوہر کو مخاطب کیا۔ کیا خبر تھی اگلی صبح اسی چائے بنانے پر وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی ہو گی۔ خیر رہی کہ رخسانہ بیگم نے اسے کچھ نہ کہا تھا، خاموشی سے بٹوے سے پیسے نکالے اور آزر کو آواز دی تھی۔

اس دن کے اختتام پر بھی برتن دھونے کے بعد چائے سبین کو ہی بنانی پڑی تھی لیکن آج وہ چائے نہیں بلکہ جوشاندہ سے ملتی جلتی ہی کوئی چیز تھی۔

☆☆☆

شہریار کے ماموں کے ہاں نئے شادی شدہ جوڑے کے اعزاز میں ضیافت تھی، انہوں نے سب گھر والوں کو مدعو کیا تھا۔

"آج کوئی اچھا سا جوڑا پہن لینا دلہن! یہ جو ہماری بھابھی ہیں، ایسی چیزوں کو بہت نوٹ کرتی ہیں۔ اچھا سا تیار ہو جانا۔" رخسانہ بیگم نے اسے خاص تاکید کی تھی۔

سبین نے اپنے جہیز کا سب سے مہنگا اور اسٹائلش جوڑا نکالا تھا۔ مہنگی بوتیک سے لیا گیا نفیس سے کام والا آسمانی رنگ کا یہ سوٹ اس کی سہیلیوں نے دیکھا تو بے تحاشا تعریف کی تھی۔ سبین نے اپنی دانست میں آج کی دعوت کے لیے سب سے بہترین جوڑا منتخب کیا تھا۔ تیار ہونے کے بعد شہریار نے بھی والہانہ انداز میں سراہا تھا جب وہ رخسانہ بیگم کے پاس گئی تو انہوں نے فوراً ٹوک دیا۔

"دلہن میں نے تم سے کہا بھی تھا آج کوئی بھاری کام والا، اچھا سا جوڑا پہن لینا۔ تم نے یہ سادہ سوٹ پہن لیا۔"

"اچھا تو لگ رہا ہے بھابھی کا سوٹ، اسٹائلش سا۔" ثمرہ کی بات سے سبین کو کچھ ڈھارس ملی تھی۔ اس نے خاموشی سے نگاہیں اٹھا کر ساس کو دیکھا۔

"خاک اسٹائلش ہے۔ جہیز کے سارے سوٹ اتنے ہلکے رنگوں اور ہلکے کام والے ہیں۔ ہم نے جو اتنی شان دار بری چڑھائی وہ تو بکسوں میں بند کرنے کے لیے ہے نا۔" رخسانہ بیگم کا موڈ شدید خراب ہو چکا تھا۔ سبین خفیف ہو گئی۔

"جاؤ یہ کپڑے بدل کر ہماری طرف والا میرون جوڑا پہنو اور ذرا لپ اسٹک بھی تیز کر لو۔ بیاہتا اور کنواری میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔" انہوں نے مزید ہدایات جاری کیں۔ سبین "جی امی" کہہ کر پلٹ گئی۔

بری کے سب ہی جوڑے اسے خاص پسند نہ آئے تھے لیکن یہ میرون جوڑا تو اسے سب سے برا لگا تھا۔ آج کی دعوت میں اسے تیز میک اپ کے ساتھ وہ ہی جوڑا زیب تن کرنا پڑا تھا۔

"ہاں اب لگ رہی ہو نا نئی نویلی دلہن۔ آئندہ کسی بھی دعوت پر تیار ہونے سے پہلے کپڑوں کے متعلق مجھ سے پوچھ لیا کرو۔" رخسانہ بیگم نے تاکید کی تھی۔ سبین کو صبر کے گھونٹ بھرنے کے ساتھ آنسو بھی پینے پڑے لیکن جی امی کہنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

☆☆☆

کھیر پکوائی کی رسم کے بعد رخسانہ بیگم نے دونوں بہوؤں میں کام بانٹ دیے تھے۔ ایک دن ناشتا فرحین بھابھی بناتیں تو کچن سمیٹ کر برتن سبین دھوتی۔ اگلے دن روٹین بدل جاتی۔ اسی طرح ایک دن دوپہر کی ہانڈی، روٹی فرحین کرتی تو شام کا آٹا گوندھ کر سبین روٹیاں بنا لیتی۔ سالن صرف دوپہر کو بنتا تھا، جب سبین دوپہر کا کھانا بناتی تو شام کی روٹی بنانے کی ذمہ داری فرحین کی ہوتی۔ ثمرہ کے ذمے رات کے کھانے کے بعد کے برتن دھونا تھے۔ صفائی

کے لیے جزوقتی ملازمہ آتی تھیں۔ تین چار دن بعد کپڑے دھلتے، ایک دفعہ واشنگ مشین فرحین لگاتی تو اگلی باری سبین کی ہوتی۔

یہ کاموں کی بظاہر بڑی منصفانہ تقسیم تھی۔ کام بظاہر بہت زیادہ بھی نہ تھے لیکن سبین کو پتا بھی نہ چلتا کہ کب دن شروع ہوا اور کب ختم۔ فرحین بھابھی اپنے ذمے کا کام کرتی تھیں لیکن ان میں نفاست اور سلیقہ مفقود تھا۔ جس دن انہوں نے ناشتا بنانا ہوتا تو کچن میں ہر طرف ابتری پھیل جاتی۔ سبین کو کچن سمیٹنے میں ہی بہت وقت لگ جاتا۔ اگلے دن جب سبین ناشتا بناتی تو فرحین بھابھی جلدی جلدی برتن دھو کر اپنے تئیں، اپنے حصے کا کام بھگتا دیتیں۔

کچن سمیٹنے کی ذمہ داری اب بھی سبین کے حصے میں آتی۔ ہر دوسرے دن دوپہر کا کھانا سبین کے ذمے ہوتا تو ہر چوتھے دن کپڑوں کی باری آجاتی۔ میکے میں اس نے کبھی کپڑے نہ دھوئے تھے۔ کپڑے دھونے کے لیے برسوں سے ایک ہی ماسی ان کے گھر آرہی تھی۔ وہ بہت صاف کپڑے دھوتی تھی۔ کپڑے دھونے کے بعد استری کرنا بھی اسی کی ذمہ داری تھی اور امی اسے ٹھیک ٹھاک معاوضہ دیتی تھیں، یہاں صرف صفائی کے لیے ملازمہ تھی اور وہ بھی مارے باندھے صفائی کر کے رفوچکر ہوجاتی۔

سبین نے پہلی بار کپڑوں کا ڈھیر دھویا تو اس کے بازو اور کمر بری طرح اکڑ گئے۔ ایک بڑی گٹھڑی تو فرحین بھابھی نے ہی لاتھمائی تھی۔ ان کے بچوں کے بے تحاشا میلے کپڑے، شرٹس کے کالر اور کہنیاں مشین سے نکلنے کے بعد بھی سبین کو برش مار کر رگڑ کر صاف کرنے پڑے۔ تولیے، بیڈ شیٹس، ثمرہ، آذر اور رخسانہ بیگم کے کپڑے دھونے کے علاوہ نبیل بھائی اور یٰسین صاحب کے کاٹن کے قمیص شلوار کو کلف بھی لگانا پڑتا۔

شہریار کے کپڑے سب سے کم میلے ہوتے۔ وہ اپنے اور شہریار کے کپڑے ٹب میں سرف ڈال کر ہاتھ سے دھولی۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کی نفاست پسند طبیعت کو یہ گوارا ہی نہ تھا کہ گھر بھر کے میلے کپڑوں کے ساتھ واشنگ مشین میں اپنے کپڑے بھی ڈال دے۔

اس دن شہریار کی چھٹی تھی۔ سرف ختم ہوگیا تو سبین نے شہریار سے ہی سرف کے پیکٹ لانے کو کہا۔ رخسانہ بیگم کی تیز سماعتوں تک اس کی آواز پہنچ گئی۔

"ابھی دس بارہ دن پہلے ہی مہینے بھر کے سودا سلف میں سرف آیا تھا۔ اتنی جلدی ختم ہوگیا؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی امی! آج آخری پیکٹ کھولا تھا۔ ابھی ہاتھ سے دھلنے والے مزید کپڑے باقی ہیں۔ سرف ختم ہوگیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"ایسے کتنے ہاتھ سے دھلنے والے ہوگئے بہو!" رخسانہ بیگم کی حیرت ختم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔

"سبین اپنے اور شہریار کے کپڑے ہاتھ سے دھوتی ہے امی۔" قریب بیٹھی فرحین نے ساس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ سبین نے کسی مجرم کی طرح سر جھکالیا تھا۔

"اُفوہ کیا ہوگیا ہے یار! گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہوا ہے۔ دھلنے والے کپڑوں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے۔ صابن، سرف تو زیادہ لگے گا نا۔ تم دو منٹ ویٹ کرو سبین! میں ابھی ساتھ والی دکان سے سرف لادیتا ہوں۔" شہریار اسے نرمی سے مخاطب کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ سبین سر ہلاتے ہوئے چپ چاپ پلٹ گئی۔

"صاحب زادے کی پھرتیاں دیکھیں تم نے۔" سبین کی سماعت سے رخسانہ بیگم کی آواز ٹکرائی۔ غم اور غصے سے سبین کا برا حال تھا، اسے کیا خبر تھی سسرال میں اتنی معمولی چیزوں کا بھی آڈٹ ہوتا ہے اور وقت سے پہلے چیز ختم ہوجائے تو اس کا حساب دینا پڑتا ہے۔

رات کو اس نے جھجکتے ہوئے شہریار سے بات کی تھی۔

"آپ مجھے چپکے سے سرف کے پیکٹ لادیجیے گا۔ میں کمرے میں چھپا کر رکھ لوں گی۔ اپنے کپڑے دھوتے ہوئے اپنا سرف استعمال کرلوں گی۔" شہریار اس کے معصومانہ مطالبے پر ہنس پڑا۔

"اتنی معمولی معمولی باتوں پر پریشان مت ہوا کرو سبین! میں کتنی بار نوٹ کرچکا ہوں کہ امی کے ذرا سے تیکھے تیور دیکھ کر تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ خود کو تھوڑا سا مضبوط اور تھوڑا سا ڈھیٹ بناؤ۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرو جبکہ تم ایک بات کو لے کر دیر تک کڑھتی رہتی ہو۔" شہریار نے کیا درست تجزیہ کیا تھا۔

"میں ہر پل اسی کوشش میں رہتی ہوں شہریار! کہ مجھ سے کوئی چھوٹی بڑی غلطی سرزد نہ ہوجائے، کوئی کام نہ بگڑ جائے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ سننے کو مل ہی جاتا ہے۔" سبین کی آواز بھرا گئی تھی۔ شادی کے بعد اس نے شہریار کے سامنے پہلا شکوہ کیا تھا۔

"وہ ہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں جان! کہ اتنا ٹینس کیوں رہتی ہو۔ ریلیکس رہا کرو۔ اگر کوئی بات ہوتی ہے تو مجھ سے شیئر کرلیا کرو۔ دل میں چھوٹی چھوٹی باتیں اور شکایتیں جمع مت کیا کرو۔" اس نے پیار سے سمجھایا۔

"میری امی کہتی ہیں کہ شوہر کے سامنے اس کے گھر والوں کی برائیاں نہیں کرنی چاہئیں۔ وہ اگر بیوی کی حمایت میں گھر والوں سے بازپرس کرنے چل پڑے تو بہت مسئلے جنم لیتے ہیں۔" سبین نے سادگی سے ماں کا مقولہ دہرایا تھا۔

"آنٹی کی بات غلط نہیں لیکن یہ شوہروں کی قسم پر بھی منحصر ہے۔ تم مجھے ان بے وقوف مردوں کی کیٹگری میں مت کھڑا کرو، مجھ پر اعتبار کرو۔ اگر مجھ سے اپنی فیلنگز شیئر کرنے سے تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے تو ایسا ضرور کیا کرو۔ یہ خدشہ ذہن سے نکال دو کہ میں اپنے گھر والوں سے کسی قسم کی بازپرس کروں گا۔" شہریار اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

"آپ بہت اچھے ہیں شہریار!" اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے اعتراف کیا۔

"کیا یہ آئی لو یو کا ترجمہ ہے۔" وہ شرارت سے پوچھنے لگا۔ سبین جھینپ کر ہنس پڑی تھی۔

☆☆☆

عارفہ بجو کہتی تھیں کہ گھر میں جٹھانی کی موجودگی آسانی پیدا کرتی ہے۔ عارفہ بجو کا تجربہ یہ ہی کہتا تھا لیکن یہ ضروری نہیں کہ شادی کے بعد ہر لڑکی کا تجربہ یکساں ہو۔ اس کے معاملے میں تو جٹھانی سسرال والوں سے بڑھ کر ٹف ٹائم دے رہی تھی۔ فرحین بھابھی اپنے بہت سے کام غیر محسوس طریقے سے اس کے ذمے لگادیتیں۔ رخسانہ بیگم کے سامنے سبین کی کسی چھوٹی بڑی کوتاہی کو ہائی لائٹ کرنے والی بھی یہ ہی فرحین بھابھی تھیں۔ سبین کو اب ان کی چالاکیوں پر غصہ آنے لگا تھا۔

پہلے تو اس نے کبھی غور ہی نہ کیا تھا کہ جس دن کپڑے دھونے کی باری فرحین بھابھی کی ہوتی ہے اس دن ان کے کمرے سے نکلنے والی کپڑوں کی گٹھڑی کا سائز بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ سبین کی دفعہ وہ کپڑے نکال نکال کر ڈھیر لگادیتیں۔ بیڈ شیٹس، تولیے حتیٰ کہ کمرے کے پردے بھی انہیں جب ہی دھلوانے یاد آتے۔ سبین شہریار سے پوچھے بنا نہ رہ پائی۔

"میری شادی سے پہلے فرحین بھابھی گھر بھر کے کام کیسے نمٹاتی تھیں۔ اب تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر کام میرے ذمے ہی لگادیں۔"

"یار! پہلے ہماری بہت بھروسے والی ملازمہ کام کرتی تھی۔ ماں، بیٹی آتی تھیں اور کتنے ہی کام نمٹا دیتی تھیں پھر بیٹی کی شادی ہوگئی۔ ماسی صغریٰ نے بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے کام چھوڑ دیا، ان کے بعد کوئی ڈھنگ کی ملازمہ ہی نہ ملی۔ ایک، دو ماسیوں کو تو چوری کے شبے میں نکالنا بھی پڑا۔ بس پھر امی نے فیصلہ کیا کہ ماسی صرف صفائی کے لیے رکھیں

گی۔ ہماری شادی سے پہلے تک دو، دو ماسیاں آتی تھیں۔ فرحین بھابھی پر کام کا اتنا برڈن تب بھی نہیں تھا۔" شہریار نے تفصیلی جواب دیا۔

"خیر تم فکر نہ کرو۔ میں تمہارے مسئلے کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گا۔" اس نے اسے تسلی دی۔

"آپ کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے لگے کہ میں نے آپ کے سامنے کوئی دکھڑا رو دیا ہے۔" سبین کو فکر دامن گیر ہوئی۔

"نہیں کروں گا بابا! کیوں پریشان ہوتی ہو۔" شہریار ہنس پڑا تھا۔

اگلی دفعہ جب فرحین بھابھی کی کپڑے دھونے کی باری آئی تو انہوں نے سبین سے دھلنے والے کپڑے مانگے تھے۔ اتفاق سے اس وقت شہریار بھی وہاں موجود تھا۔

"ہمارے کپڑے بھابھی دھوئیں گی، حد ہو گئی سبین! اپنے کام تو خود کیا کرو۔" اس نے خفگی سے سبین کو مخاطب کیا۔

"ایک دفعہ مشین سبین لگاتی ہے ایک دفعہ فرحین۔ میں نے دونوں میں کام بانٹا ہے۔" رخسانہ بیگم بول اٹھی تھیں۔

"نہیں امی! یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اب میری شادی ہو گئی ہے اب بھی میرے موزے اور بنیان فرحین بھابھی کو دھونے پڑیں۔ شادی سے پہلے کی بات اور تھی، اب میرے کاموں کی تمام تر ذمہ داری سبین پر عائد ہوتی ہے اور اسے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنا آنی چاہئیں۔ میں نہ سنوں سبین کہ آئندہ تم نے میرے کپڑے بھابھی سے دھلوائے بلکہ امی، ابو کے کپڑے بھی تم ہی دھویا کرو۔" وہ سخت گیر شوہر کا روپ دھارے قطعی انداز میں سبین سے مخاطب تھا۔

سبین نے سوالیہ نگاہوں سے ساس کو دیکھا۔

"ٹھیک ہی کہہ رہا ہے شہریار! تم دونوں اپنے اپنے کپڑے خود دھوؤ۔ ہمارے کپڑے بھی فرحین دھوئے گی ورنہ تمہیں موقع ملے تو تم دھو لینا۔"

جب بیٹا ہی بیوی سے دھونس بھرے لہجے میں بات کر رہا تھا تو رخسانہ بیگم کاہے کو اختلاف کرتیں۔ انہوں نے بھی شہریار کی بات سے اتفاق کر لیا۔ سبین نے فرماں برداری سے جی امی کہتے ہوئے گردن ہلا دی تھی۔

☆☆☆

وہ کچن میں آٹا گوندھ رہی تھی جب آذر نے کچن میں جھانکا۔

"بھابھی اگر زحمت نہ ہو تو دو کپ چائے بنا دیں گی۔ میرا دوست آیا ہے۔" اس نے سبین کو مخاطب کیا۔

"کیسی زحمت آذر! میں ابھی بنا دیتی ہوں۔" اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔ اپنے اس کم گو اور شرمیلے سے دیور سے سبین کو خاصی ہمدردی تھی۔ وہ بہت سلجھا ہوا پیارا سا لڑکا تھا۔ زیادہ تر اپنی پڑھائی میں مصروف رہتا اس کے باوجود گھر کا سودا سلف لانا، اسی کی ذمہ داری تھی۔ اکثر تو یوں ہوتا کہ وہ ایک دفعہ چیزیں لے کر گھر لوٹتا تو گھر والوں کو کوئی دوسری چیز یاد آ جاتی۔ بلا چوں چرا کیے وہ پھر سے بازار کا رخ کرتا، حالانکہ اس کے امتحان سر پر تھے پھر بھی گھر کا کوئی فرد اسے کوئی رعایت نہ دیتا اسے بازار دوڑاتے ہی رہتے شاید اسی لیے وہ اپنے دوست کے ہاں جا کر کمبائن اسٹڈی کرنے کو ترجیح دیتا۔ آج اس کا وہی دوست کسی کام سے اس کے گھر چلا آیا تھا۔

"بھابھی! اگر ممکن ہو تو چائے کے ساتھ بسکٹ، نمکو جیسی کوئی چیز رکھ دیجیے گا۔ اسفند اپنے گھر میری بھی بہت خاطر کرتا ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے مزید فرمائش کی۔

"ٹھیک ہے آذر! میں بندوبست کرتی ہوں۔ تم دس، بارہ منٹ بعد آ کر ٹرے لے جانا۔" اس نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔ وہ ممنون ہو کر واپس پلٹا۔

سبین نے آٹا گوندھ لیا تھا۔ ہاتھ دھو کر فٹا فٹ چائے چڑھائی پھر فریج کا جائزہ لیا۔ کل رات کے کھانے میں پلاؤ کے ساتھ شامی کباب تلے گئے تھے جن میں سے چار شامی کباب ابھی بھی بچے ہوئے تھے۔ اس نے اوون میں کباب گرم کر کے پلیٹ میں رکھے۔ فریج میں سے ایک مٹھائی کا ڈبہ بھی برآمد ہوا۔ مٹھائی کے دو چار پیس ہی بچے تھے اس نے چھوٹی پلیٹ میں وہ بھی سجا دیے۔ نمکو کا جار کھول کر نمکو نکالی اور چند بسکٹس بھی ایک پلیٹ میں رکھ دیے۔ اپنی دانست میں اس نے آذر کے دوست کی خاطر کا مناسب بندوبست کر دیا تھا۔ آذر چائے لینے آیا تو چائے کے ساتھ تواضع کا سامان دیکھ کر کچھ حیران رہ گیا۔ گھر میں سب سے چھوٹا بچہ ہونے کی وجہ سے اس کے دوستوں کو کبھی بھی اہمیت سے نہ نوازا گیا تھا۔

"تھینک یو سو مچ بھابھی! آپ نے تو اتنی جلدی اتنا اہتمام کر دیا۔" وہ از حد ممنون ہوا لیکن جس وقت وہ یہ ٹرے لے کر چیک پوسٹ یعنی رخسانہ بیگم کے سامنے سے گزرا تو انہوں نے اسے فوراً روک لیا۔

"یہ اتنا اہتمام کس لیے بھئی؟" انہوں نے پوچھا۔

"اسفند آیا ہے امی۔" اس نے منمنا کر بتایا۔

"مجھے بھی پتا ہے اسفند آیا ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ کس کے لیے، میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ اسفند کے لیے اتنی ٹرے سجانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کوئی پہلی بار آیا ہے تم سے ملنے۔"

"اچھا آج تو بھابھی نے اہتمام کر دیا۔ آئندہ اسے چائے پلانے کی غلطی بھی نہیں کروں گا۔" آذر ماں کی باز پرس پر جھنجلا گیا تھا۔ رخسانہ بیگم نے بیٹے کو تو صرف گھورنے پر اکتفا کیا تھا لیکن جب سبین وہاں سے گزری تو اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"بہو! اب اس گھر کے طور طریقے کچھ تم بھی سیکھ لو۔ ہر بات سمجھانا ضروری تو نہیں۔" ان کا موڈ شدید آف لگتا تھا۔

"کیا ہوا امی؟" سبین واقعی کچھ نہ سمجھی بلکہ باقاعدہ گھبرا گئی تھی۔

"آذر کے دوست کے لیے اتنے اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔ ہم سفید پوش لوگ ہیں بی بی! مہینے بھر کا راشن دنوں میں نہیں مکا (ختم) سکتے۔ پرسوں ساجدہ بھابھی آئیں، میں نے تم سے صرف چائے بنانے کو کہا۔ تب تم ٹرے میں الم غلم سجا کر لے آئیں۔ ٹھیک ہے کبھی کبھی کسی خاص مہمان کی بھرپور خاطر مدارت بھی کرنی پڑتی ہے لیکن بندہ یہ تو دیکھ لے کہ آنے والا مہمان اتنا خاص ہے بھی یا نہیں۔" وہ بگڑے موڈ کے ساتھ بولی تھیں۔

"آئندہ احتیاط کروں گی امی!" وہ منمنا کر یہ ہی کہہ سکی۔ اتنے میں فرحین بھی آ نکلی تھی۔

"اور یہ ہماری بڑی بہو ہیں۔ تم تو چلو نئی ہو، گھر کے طور طریقوں سے اتنی واقفیت نہیں۔ ان کا فرض ہے یا نہیں کہ کسی معاملے میں تمہاری رہنمائی کر دیں لیکن جب بھی کوئی مہمان آتا ہے اگر ان کے کانوں میں آواز پڑ جائے، اول تو اپنے کمرے سے باہر قدم رنجہ نہیں فرماتیں اور باہر آ جائیں تو مہمان کے ساتھ چپک کر بیٹھ جاتی ہیں۔ مہمان کی خاطر تو جیسے کوئی پڑوس سے آ کر کرے گا۔" انہوں نے اس بار فرحین کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"سبین کو تو اس گھر میں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے امی! پہلے مہمان داری کون بھگتاتا تھا، میں ہی ناں۔ اب بچے ہی اتنا عاجز کیے رکھتے ہیں۔ اب اس چھوٹے کو دیکھیے، میں شاہ میر کو ہوم ورک کروا رہی ہوں اور یہ اس کی کتابیں، کاپیاں پھاڑنے کے درپے ہے۔" فرحین بھابھی نے اپنی گود میں چڑھے شاہ زر کو گھورتے ہوئے بتایا تھا۔

"اس کی شرارتیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ ادھر دو اسے، میں اس کے کان کھینچوں۔" رخسانہ بیگم نے مسکراتے ہوئے پوتے کو اپنی گود میں لیا۔ دادی کا لاڈلا دادی کے پاس آ کر کھلکھلانے لگا تھا۔ فرحین بھابھی مسکراتے ہوئے پلٹ گئیں۔ سبین بھی منظر میں خود کو غیر ضروری جان کر چلی گئی۔

یہ نہیں تھا کہ رخسانہ بیگم صرف سبین کے کاموں پر ہی نکتہ چینی کرتی تھیں۔ بخشتی وہ فرحین بھابھی کو بھی نہ تھیں لیکن فرحین بھابھی چکنا گھڑا تھیں یا ہو سکتا ہے شادی کے اتنے برس گزرنے کے بعد وہ ڈھٹائی کی

حد تک پراعتماد ہو گئی تھیں۔ ساس کی خفگی کو بھی خاطر میں نہ لاتیں۔ رخسانہ بیگم کا فوری دھیان بٹانے کے لیے ان کے پاس شاہ میر اور شاہ زر بھی تھے۔ اصل مسئلہ سبین کا ہوتا، وہ اس گھر میں نئی تھی۔ گھر کے طور طریقوں سے ناآشنا۔ رخسانہ بیگم کی کنجوس فطرت کا اندازہ ہونے کے باوجود وہ کوئی نہ کوئی غلطی کر بیٹھتی تھی۔

شومئی قسمت اسی شام کو رخسانہ بیگم کی ایک اور واقف کار خاتون ملنے آ گئیں۔ باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ پہلے پڑوس میں بستی تھیں اور رخسانہ بیگم سے ان کا خوب بہناپا تھا اب دوسرے علاقے میں ذاتی گھر لے کر وہاں رہائش اختیار کر لی تھی۔

"شہریار کی شادی میں بھی تم نہیں آئیں فریدہ! میں نے تمہاری کتنی راہ دیکھی۔" رخسانہ بیگم سہیلی سے شکوہ کر رہی تھیں۔

"بس کیا بتاؤں، مہوش کا بچہ ہونے والا تھا۔ دو مہینے اس کے پاس پنڈی رہ کر آئی ہوں۔ تم تو جانتی ہو اس کا کیس کتنا پیچیدہ ہوتا ہے۔ خیر سے اللہ نے بیٹے سے نوازا۔"

"اچھا، اچھا۔ ماشاء اللہ۔ بیٹا ہوا ہے مہوش کے۔" رخسانہ بیگم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا پھر سبین کو دیکھا۔

"بہو چائے وائے کا بندوبست کرو بھئی۔ اتنے عرصے بعد آئی ہیں تمہاری فریدہ خالہ۔" انہوں نے سبین کو مخاطب کیا۔ وہ "جی امی" کہہ کر کچن میں چلی آئی۔ اس وقت فرحین بھابھی بھی موجود نہ تھیں، وہ ثمرہ کے ساتھ بچوں کو لے کر قریبی پارک گئی تھیں۔ سبین کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ مہمان خاتون کی خاطر کا کیا بندوبست کرے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے شہریار کو فون ملا لیا۔ وہ آفس سے واپس آ رہا تھا، سبین کا سوال سن کر ہنس پڑا۔

"کیا مطلب ہے بھئی کہ فریدہ خالہ آئی ہیں تو ان کی کیسی خاطر مدارت کی جائے؟"

"جو میں نے پوچھا ہے، وہی مطلب ہے۔ جلدی سے جواب دیں کہ یہ عام سی مہمان ہیں، خاص یا پھر خاص الخاص۔" اس نے جھنجلا کر پھر پوچھا۔

"او کے او کے، بتاتا ہوں بھئی۔ فریدہ خالہ امی کی پکی سہیلی ہیں۔ ان کی اچھی سی خاطر کرو۔ چائے کے ساتھ بسکٹ، نمکو رکھ دینا۔ فروٹ، کیک موجود ہو تو وہ بھی رکھ دو اور ہاں فریج میں کل کے کچھ شامی کباب بھی تو بچے ہوں گے، انہیں گرم کر دو۔"

"توبہ ہے بھئی۔ اب مجھے ان چار بچے ہوئے شامی کباب کا آپ کو بھی حساب دینا پڑے گا۔" اس نے اپنی جھنجلاہٹ شہریار پر ہی اتار دی۔

"اچھا سنو تو، آذر گھر پر ہو تو اس سے سموسے وغیرہ منگوا لو۔" شہریار کچھ کچھ اس کا مسئلہ سمجھ گیا تھا۔ سبین نے "او کے" کہہ کر فون بند کر دیا۔

شکر ہے آذر گھر پر ہی تھا۔ سبین نے اس سے سموسے اور چکن رول منگوا لیے تھے۔ فریدہ خالہ نے جاتے سمے اسے خوب دعاؤں سے بھی نوازا تھا اور ہزار روپے بھی اس کی مٹھی میں تھما دیے تھے۔

سبین نے شکر کیا کہ رخسانہ بیگم کا موڈ بھی خاصا خوش گوار تھا۔

لیکن رات کو وہ آذر کے دوست کی تواضع کا قصہ سنانے کے بعد شہریار سے پوچھ بیٹھی۔

"پلیز شہریار! آپ مجھے اپنے گھر آنے والے مہمانوں کے مقام اور مرتبے سے آگاہ کر دیں۔ میری بہت بڑی مشکل حل ہو جائے گی۔" شہریار کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"خیر یہ تو کوئی اتنا پریشان کن مسئلہ نہیں ہے، میں پھر بھی بتائے دیتا ہوں۔ پڑوس سے نسرین آنٹی آئیں تو ان سے چائے کا پوچھنے تک کی ضرورت نہیں کہ وہ اکثر ایک دن میں تین چکر بھی لگا لیتی ہیں۔ مرزا صاحب کی بیگم آئیں تو چائے کا پوچھ لو، وہ منع کر دیں تو اصرار مت کرو، نہ منع کریں تو صرف چائے بنا لو۔ شگفتہ ممانی آئیں تو بصد اصرار چائے پلاؤ، ساتھ خاطر کے کچھ اور آئٹمز بھی ہوں۔ ندرت خالہ کے آنے پر بھی پرتکلف چائے کا اہتمام کرو اور زاہدہ مامی آئیں تو چائے پر اہتمام کے ساتھ چپ چاپ کھانے کی تیاری بھی شروع کرو کہ امی انہیں ضرور کھانے پر روکیں گی اور وہ اکثر رک بھی جاتی ہیں۔" شہریار نے اسے تفصیلاً آگاہ کیا۔

"میں تو سب کچھ گڈمڈ کر دوں گی، آپ پلیز بولتے جائیں۔ میں نوٹ کر لیتی ہوں۔" سبین کے کہنے پر شہریار باقاعدہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"فار گاڈ سیک سبین! چھوٹی چھوٹی باتوں کی اتنی ٹینشن مت لیا کرو۔ ریلیکس رہنے کی کوشش کرو۔"

"آپ مرد ہیں شہریار! سسرال جاتے ہیں تو وی آئی پی پروٹوکول ملتا ہے۔ بہوؤں کو سسرال میں الرٹ رہنا پڑتا ہے۔" وہ جتائے بغیر نہ رہ پائی۔

"مانا ہم مردوں کو سسرال کی کوئی ٹینشن نہیں ہوتی لیکن یار! جس جگہ ہم نوکری کرتے ہیں، وہ کسی سسرال سے کم نہیں۔ آفس میں باس لڑکیوں کی ساس سے زیادہ ٹف ٹائم دیتا ہے۔ میں تمہیں اپنی مثال دیتا ہوں۔ میں اپنا ہر کام بہت دلجمعی اور نیک نیتی سے کرتا ہوں پھر بھی جب بھی باس کسی اور پر آیا غصہ کسی دوسرے پر نکالنے کے موڈ میں ہوں تو مجھے بھی بلاوجہ باس کی کڑوی کسیلی بات سننی پڑ جاتی ہے۔

ایک، دو منٹ کے لیے میرا بھی دماغ گھومتا ہے لیکن پھر یہ سوچ کر خود کو ریلیکس کرتا ہوں کہ یہ سب روٹین کی کارروائی ہے۔ بلاوجہ دماغ پر سوار کرنے کا فائدہ۔ دفتر میں ملازم اور سسرال میں بہو کو تھوڑا سا جی دار اور تھوڑا سا ڈھیٹ ہونا پڑتا ہے یار! اور میں مانتا ہوں کہ تم بہت حساس طبیعت کی مالک ہو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی محسوس کرتی ہو، میں اپنے گھر والوں کی حمایت نہیں کر رہا لیکن سسرال اس سے بھی اوکھے (مشکل) ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کو پتا نہیں کیا کچھ فیس کرنا پڑتا ہے۔ تم چند فقروں کی تاب ہی نہیں لا پاتیں، میں بار بار سمجھاتا ہوں کہ ایک کان سے سنو اور دوسرے سے نکال دیا کرو۔ بلاوجہ کی ٹینشن مت لیا کرو۔" شہریار نے لمبا چوڑا لیکچر دے ڈالا تھا۔

اس کی باتیں غلط نہ تھیں، سبین خاموشی سے سنتی رہی۔

"آئندہ کوشش کروں گی۔" سبین نے فرماں برداری سے تسلیم کر لیا۔ شہریار نے بھی مسکرا کر سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

ثمرہ کی سالگرہ آنے والی تھی۔ شہریار اسے سیل فون گفٹ کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے سبین کی بھی رائے چاہی۔

"کیا خیال ہے چھوٹی کو موبائل کا سرپرائز دے دوں۔ کتنے عرصے سے نئے موبائل کی ضد کر رہی ہے۔"

"ہاں تو لے دیں نا بے چاری کو۔ اتنے دنوں سے اس کا موبائل خراب ہوا پڑا ہے۔ کتنی بار ٹھیک کروا لیا مگر ٹھیک نہیں ہو پاتا۔ گھر والا لیپ ٹاپ پہلے ہی خراب پڑا ہے۔ اسے اپنی پڑھائی کے لیے نیٹ کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ بے چاری کبھی آذر کا موبائل مانگتی ہے، کبھی میرا تو کبھی آپ کا۔" سبین نے فوراً شہریار کی تجویز کی حمایت کی تھی۔

"میں اسے اتنا مہنگا گفٹ دوں گا، تمہیں برا تو نہیں لگے گا۔" شہریار اسے جانچنا چاہ رہا تھا۔

"میں آپ کو ایسی لگتی ہوں؟" سبین نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"خیر لگتی تو تم مجھے بہت پیاری ہو۔ میں تو بس ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔" شہریار نے اسے ہنس کر دیکھا۔

"ثمرہ آپ کی چھوٹی بہن ہے شہریار! وہ آپ سے فرمائش نہیں کرے گی تو کس سے کرے گی۔ شادی شدہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کے گھر والوں کا آپ پر سے حق ختم ہو گیا۔ مجھے اچھا لگتا ہے جب آپ ثمرہ کی چھوٹی موٹی فرمائشیں پوری کرتے ہیں۔ آذر بے چارے کو امی کے علاوہ خود سے بھی پاکٹ منی دیتے ہیں۔ اپنے شرارتی بھتیجوں کو چیزیں دلوا کر لاتے ہیں۔ مجھے ان میں سے کچھ بھی برا نہیں

لگتا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں شکر مناتی ہوں کہ آپ اپنی امی کی طرح کنجوس نہیں ہیں۔" سبین نے بھی ہنستے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

جب شہریار اس کی ہر ضرورت، ہر خواہش بنا اس کے کہے پوری کرنے کی کوشش میں رہتا ہے تو وہ بھلا اسے اس کے گھر والوں پر پیسہ خرچ کرنے سے کیوں روکتی۔

"تم بہت اچھی ہو سبین!" اس نے بیوی کو محبت سے دیکھا۔

"کیا یہ آئی لو یو کا ترجمہ ہے۔" وہ شریر ہوئی۔

"یہ آئی لو یو ٹو۔ تھری۔ فور سب کا ترجمہ ہے۔" شہریار نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کیا۔ وہ محجوب ہو کر مسکرا دی تھی۔

☆☆☆

عارفہ بجو کے سسرال میں قرآن خوانی کی محفل منعقد ہو رہی تھی۔ بجو کی ساس اور رخسانہ بیگم ویسے تو دیورانی، جٹھانی تھیں لیکن تعلقات اتنے مثالی نہ تھے۔ کسی خاص موقعے تہوار پر ہی ایک دوسرے کے ہاں جانا ہوتا۔ سبین بھی شادی کی دعوت کے بعد آج ان کے ہاں جا رہی تھی۔

قران خوانی کے بعد رخسانہ بیگم اور فرحین تو دوسری رشتہ دار خواتین کے ساتھ گپ شپ لگانے لگیں۔ وہ بھانجے، بھانجیوں کے ساتھ ان کے بیڈ روم میں آ گئی۔ عارفہ بجو ابھی کام نمٹا رہی تھیں، ذرا دیر کی فراغت ملی تو وہ بھی وہیں آ گئیں۔

"باہر سب عورتوں میں بیٹھ کر رخسانہ چچی تمہاری بہت تعریف کر رہی ہیں۔" عارفہ بجو نے مسکرا کر آگاہ کیا۔

"واقعی؟" وہ حیران ہوئی۔

"ہاں تو جھوٹ تھوڑی بول رہی ہوں لیکن سسرال والوں کی تعریف پر زیادہ خوش نہیں ہونا چاہیے۔ آج تعریف کر رہے ہیں تو اگلے ہی دن کسی بات پر تنقید یا برائی کر رہے ہوں گے۔ شاباشی کا میڈل پہنانے کے ساتھ ہی اتار لیتے ہی یہ لوگ۔" بجو نے تو گویا سسرالیات میں پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔

"جانتی ہوں بجو۔" وہ ان کی بات سن کر مسکرا دی تھی۔ بجو کا کہا درست ثابت ہوا۔ دو روز بعد کی بات تھی۔ رخسانہ بیگم کے پاس پڑوس والی نسرین آنٹی آئی بیٹھی تھیں۔ وہ دبی دبی آواز میں ان کے سامنے سبین کی بدسلیقگی کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ کس طرح ایک دن اس نے دودھ ابال دیا اور کیسے اس کے ہاتھ سے برتن پھسل پھسل کر ٹوٹتے ہیں۔ سبین نے اب یہ وتیرہ بنا لیا تھا کہ وہ اپنے بارے میں کسی کی بھی بات کان لگا کر نہ سنتی تھی (خواہ مخواہ جی جلانے کا فائدہ) اور کبھی اتفاق سے اس کی ذات کے متعلق کوئی تبصرہ اس کے کان میں پڑ بھی جاتا تو وہ اس بات کو زیادہ دیر دماغ پر سوار نہ ہونے دیتی۔ کام مشکل تھا مگر ناممکن نہیں اور جب سے اس نے یہ عادت اپنائی، زندگی خود بخود پرسکون ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ دو دن کے لیے امی کے ہاں رہنے آئی تھی۔ ابو چھوٹی پھوپھو کے پاس کراچی گئے تھے۔ امی کی تنہائی کا خیال کر کے وہ ان کے پاس رہنے آ گئی۔

چھوٹی پھوپھو بہت پریشان تھیں۔ علیزے آپی کے سسرال والوں نے ان سے بچے چھین کر انہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ اکلوتی بیٹی کی ٹینشن لے کر پھوپھو کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ ابو بہن کو تسلی دلاسا دینے ہی کراچی گئے تھے۔ علیزے آپی کے متعلق سوچ سوچ کر سبین کا دل بھی بہت خراب ہو رہا تھا۔ اس نے بہت دل سے اللہ کے حضور علیزے آپی کی خوشیوں اور پرسکون زندگی کی دعا کی تھی۔

دماغ میں شہریار کی باتیں بھی گونجتیں، بعض سسرال والے واقعی بہت ظالم ہوتے ہیں۔ اللہ ہر لڑکی کو ایسے سسرالیوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ باقی چھوٹی موٹی باتیں تو ہر گھر میں ہی ہوتی ہیں۔ سبین نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب وہ معمولی باتوں پر زود رنج ہونے کے بجائے انہیں نظر انداز کرنے کی پالیسی بنائے گی۔ اللہ نے اسے شہریار جیسا جیون ساتھی دیا تھا۔ اب اس نے شکوے کے بجائے شکر کو اپنا شعار بنانا تھا۔

☆☆☆

شہریار دیکھ رہا تھا کہ وہ صبح سے پھرکی کی طرح گھوم گھوم کر گھر کے کام نمٹا رہی تھی۔ ماسی نے چھٹی کر لی تھی۔ سبین کو صفائی کرنی پڑی۔ فرحین بھابھی کے میکے میں کوئی تقریب تھی، وہ کل شام سے میکے گئی ہوئی تھیں۔ کچن کی ذمہ داری کے ساتھ چھوٹے بڑے تمام کام اسے نمٹانے پڑے تھے۔ آج اتفاق سے لائٹ بھی نہ گئی تو سبین نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے واشنگ مشین بھی لگا لی ورنہ کئی دنوں سے بجلی کی آنکھ مچولی نے سب کو زچ کر رکھا تھا۔ شہریار نے موسمی فلو کی وجہ سے آج آفس سے چھٹی کی تھی لیکن سبین کو اس کے پاس بیٹھنے کا موقع ہی نہ مل رہا تھا۔ شام کو وہ دھلے کپڑے اتارنے چھت پر گئی تو شہریار بھی پیچھے چلا آیا۔

"موسم اچھا ہو رہا ہے نا، کچھ دیر یہیں بیٹھتے ہیں۔"

"ابھی بالکل فرصت نہیں شہریار! ابھی مجھے ان کپڑوں کی تہ لگانی ہے۔ امی، ابو کا ایک ایک سوٹ پریس کر کے رکھنا ہے۔ پھر شام کے کھانے کی تیاری...... اور آپ بھی کمرے میں جا کر لیٹیں، ابھی چھینکیں آنا شروع ہو جائیں گی۔" وہ شہریار کو مفت مشورے سے نواز کر کپڑے لے کر فوراً نیچے چلی گئی۔ شہریار بھی ٹھنڈا سانس بھر کر نیچے چلا آیا۔

رات کے کھانے کے بعد سبین نے سب کو چائے بنا کر دی۔ شہریار کا خیال تھا کہ وہ اب کمرے کا رخ کرے گی لیکن ثمرہ نے عادت کے مطابق آج بھی اپنی واحد ڈیوٹی یعنی کھانے کے برتن دھونے سے جان چھڑانا چاہی۔ وہ ٹی وی کے سامنے کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔ ڈرامہ دیکھتے ہوئے پڑھنے کا فن بھی صرف اسے آتا تھا۔ سبین کو برتن بھی دھونے پڑ رہے تھے۔ شہریار کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"سبین کہاں ہو تم۔ کتنی دیر پہلے تم سے کہا تھا کہ آ کر میرا سر دبا دو۔ تمہیں سر دبانے کی فرصت ملے تب نا۔" وہ کمرے سے باہر آ کر دھاڑا۔ ایک لمحے کو سب خاموش ہو گئے۔

"بھابھی تو شاید کچن میں ہیں۔" آذر نے جواب دیا۔

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اب کچن میں کیا کر رہی ہے۔ سب نے کھانا کھا لیا، چائے پی لی۔ محترمہ کو فکر ہی نہیں کہ شوہر کی طبیعت خراب ہے، اس نے سر دبانے کا کہا ہوا ہے، آلتو فالتو کے سب کام کر لیں گی جب میری ذرا سی خدمت کرنی پڑ جائے تو رفو چکر ہو جاتی ہیں۔"

"بھابھی برتن دھو رہی ہیں بھائی! فارغ ہو کر ابھی آ جائیں گی۔" اس بار بھی آذر ہی بولا تھا۔

"پتا نہیں بھابھی برتن دھونے کیوں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ میں ان سے کہتی بھی ہوں کہ ڈراما ختم ہو جائے، برتن میں خود دھو لوں گی۔ بھائی میں ابھی بھیجتی ہوں بھابھی کو۔" ثمرہ فوراً اٹھی تھی۔

"شہریار کی بات مت ٹالا کرو بہو! غصے میں یہ بالکل اپنے ابو پر گیا ہے۔" سبین آئی تو رخسانہ بیگم نے اسے نصیحت کی۔ سبین کے کانوں تک شہریار کی اونچی آواز پہنچ چکی تھی اس نے خود پہلی بار شہریار کا اتنا غصیلا لہجہ سنا تھا۔ اس کے غصے سے خائف ہوتی وہ کمرے میں گئی تھی۔ کوتاہی واقعی اس کی تھی، آج شہریار کی طبیعت خراب تھی اسے اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔

"میں بس آ ہی رہی تھی شہریار! سوری، کچھ دیر ہو گئی۔" وہ شرمندہ ہو کر بولی۔ شہریار نے اسے تیکھے تیوروں سے دیکھا۔ بغیر کسی قصور کے وہ کیسے شرمندہ، شرمندہ سی لگ رہی تھی۔

"انسان اور مشین میں کچھ فرق ہونا چاہیے سبین! اگر تم خود اپنا خیال نہیں کرو گی تو دوسرا بھی نہیں کرے گا۔ کوئی کام ثمرہ کے لیے بھی چھوڑ دیا کرو۔ اتنی اپنی شفتی جھاڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر کام آگے بڑھ بڑھ کر کرنے سے تمہیں اضافی نمبر نہیں ملیں گے۔ ٹھیک ہے اس گھر کو اپنا گھر سمجھتے ہوئے اپنے فرائض دل لگا کر ادا کرو لیکن دوسروں کو بھی ان کا فرض پورا کرنے کا موقع دو۔ ورنہ سب تمہارے بڑھ چڑھ کر کام کرنے کی عادت سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور پھر تم کسی کام سے ہاتھ

کھینچنا بھی چاہو گی تو نہیں کھینچ پاؤ گی۔" شہریار اسے سنجیدگی بھرے لہجے میں سمجھا رہا تھا۔

"کہاں آپ کے سر میں درد ہو رہا تھا، اب آپ نے اتنا لمبا لیکچر دے ڈالا۔ بول، بول کر سر میں درد بڑھ نہیں جائے گا۔" اس نے محبت بھری نگاہ شہریار پر ڈالی۔

"عشاء کی نماز پڑھنے گیا تھا تو تمہارے لیے زنگر برگر چھپا کر لایا تھا۔ مجھے پتا ہے آلو گوبھی سے تم برائے نام روٹی کھاتی ہو۔ تم نے آنے میں اتنی دیر کر دی، برگر ٹھنڈا ہو گیا۔" شہریار نے پلیٹ میں برگر نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"ایک برگر ثمرہ کے لیے بھی لے آتے۔ زنگر تو اسے بھی بہت پسند ہے، پھر چھپا کر لانے کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔" سبین نے رائے کا اظہار کیا۔

"ثمرہ اپنی ہر فرمائش ڈنکے کی چوٹ پر پوری کرواتی ہے پھر اس کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے ابو ہیں۔ میں ہوں، نبیل بھائی اور آذر ہیں۔ تمہاری فرمائشیں میرے علاوہ اور کون پوری کرے گا۔ اس لیے دماغ پر زیادہ زور مت دو اور یہ برگر کھاؤ۔ تم بہت کمزور ہو گئی ہو، اب تمہاری ڈائٹ کا میں خود خیال رکھوں گا۔"

"ویسے شہریار! اگر اللہ نے ہمیں بیٹے سے نوازا اور شادی کے بعد ہمارا بیٹا اپنی بیوی کے لیے چھپ چھپ کر چیزیں لائے گا تو ہمیں علم ہونے پر کیسا لگے گا۔" سبین کے ذہن میں ویسے ہی ایک سوچ آئی تو مسکراتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔

"اگر تم بہو کے کھانے پینے پر نظر رکھنے والی نکتہ چیں قسم کی ساس بنیں تو میں اپنے بیٹے کو خود طریقے بتاؤں گا کیسے بیوی کے لیے کوٹ، جیکٹ کی جیبوں اور لیپ ٹاپ کے بیگ میں چیزیں چھپا کر لاتے ہیں۔" شہریار بولا، وہ ہنس پڑی۔

"یار یہ ہی تو شادی شدہ زندگی کے ایڈونچر ہیں اور یقین کرو ہم جو وقت اب گزار رہے ہیں، یہ ہماری زندگی کا سب سے سنہرا دور ہے۔ وقت اپنی چال چلے گا، آنے والے برسوں میں ہم آج کی نسبت زیادہ آزاد اور خود مختار زندگی جئیں گے۔ تمہیں اس گھر میں اٹھنے، بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے سمیت ہر چیز کی آزادی ہو گی۔ ہمارے بچے بڑے ہو جائیں گے پھر یہ گھر تمہیں سسرال نہیں بلکہ اپنا گھر لگنے لگے گا۔" شہریار نے مستقبل کی منظر کشی کی تھی۔

"میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین بندی گردانتی ہوں شہریار! جو مجھے آپ جیسا جیون ساتھی ملا۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ ہر سبین کو شہریار جیسا شوہر ملے پھر وہ سسرال کے سرد و گرم کو بھی با آسانی جھیل لے گی۔" سبین نے چاہت لٹاتی نگاہوں سے شریک سفر کو دیکھا۔

"بڑی ناممکن سی دعا مانگ لی تم نے۔ اب ہر سبین کو تو شہریار نہیں مل سکتا ناں۔ کسی سبین کے حصے میں عبدالغفور آئے گا، کوئی محمد ساجد کے پلے بندھے گی۔ کوئی اصغر علی کے نکاح میں آئے گی۔ شہریار کی زندگی میں تو زیادہ سے زیادہ تین سبینیں اور آ سکتی ہیں۔" شہریار مسکراہٹ دبا کر بولا تھا۔ سبین کو اس کی بات ذرا دیر سے سمجھ میں آئی مگر جب سمجھ میں آئی تو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میرے علاوہ کسی دوسری سبین کو تو چھوڑیے، دوسری لڑکی پر بھی دوسری نگاہ ڈالی تو میں تیسری نگاہ ڈالنے کا موقعہ نہیں دوں گی۔" اس نے وارننگ دی تھی۔

"میرے ساتھ رہتے رہتے فقرے بنانے بھی آ گئے ہیں جناب کو۔ اسے کہتے ہیں صحبت کا اثر۔" شہریار نے شرارت سے اس کی ناک دبائی۔ سبین نے مسکرا کر اس کے کندھے سے سر ٹکا لیا۔

"آپ بہت، بہت زیادہ اچھے ہیں شہریار۔"

"یہ تم آئی لو یو کا ترجمہ سنانے کے بجائے سیدھا سیدھا آئی لو یو کیوں نہیں کہہ دیتیں۔" وہ شرارت کے موڈ میں تھا۔ سبین ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔ سسرال میں گزارے ایک پُر مشقت دن کا اختتام نہایت خوش گوار تھا۔ شہریار جیسے شخص کا ساتھ ملنے پر اس کا رواں رواں اپنے رب کا شکر گزار تھا۔

* * *

یہ سارا کھڑاگ پیدا کب ہوا، کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ یہ نیا معرکہ تو بلاوجہ ہی شروع ہوا۔ یوں ہی باتیں کرتے فاخرہ بیگم نے دبے دبے انداز میں اپنی بڑی آپا سے لاڈ بھرا شکوہ کر دیا۔

عائشہ تنویر

اسٹیٹس دا لوٹا

"آپ کا تو سسرال نہیں آپا، مجھے تو دس لوگوں کو جواب دینا ہوتا ہے۔ ابھی پیپرز ہو جائیں گے تو مصباح کا ماسٹرز بھی ہو جائے گا۔ شادی کی تاریخ تو دور کی بات آپ نے ابھی باقاعدہ منگنی کا اعلان بھی نہیں کیا۔"

فاخرہ کی آپا روبینہ بیگم نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"تم تو سدا کی جلد باز ہو۔ جب کہہ دیا کہ مصباح میرے طلال کی دلہن بنے گی تو اور منگنی کیا ہوتی ہے۔ چلو تمہاری خوشی کے لیے منگنی بھی کر لیتی ہوں۔ اب ان شاء اللہ جلد شادی کی تاریخ رکھنے ہی آؤں گی۔"

خالہ نے پلیٹ سے مٹھائی کا ٹکڑا اٹھا کر پاس بیٹھی مصباح کے منہ میں ڈال دیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

دونوں بہنیں شادی کی تاریخ اور دیگر تیاریوں پر بات کرنے لگی اور مصباح جلدی جلدی چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔ اس کی مصروفیت کو سلیقہ و حیا جان کر مسکراتی خواتین کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ پس پردہ وجہ کیا ہے۔

مصباح نے کچن کی سیاہ ماربل ٹاپ پر چینی کی سفید پلیٹ میں بچی مٹھائی رکھی۔ ساتھ نازک سی دھانی انگوٹھی اور گلدان سے نکال کر ایک مصنوعی گلاب کا پھول جو دیکھنے میں بالکل اصلی لگتا۔ جگمگاتی روشنیوں میں ایک پرفیکٹ کلک لیا اور got engaged کے اسٹیٹس کے ساتھ تصویر فیس بک پر اپلوڈ کر دی۔

تھوڑی دیر بعد کمنٹس آنے لگے اور کمنٹس کے جواب دینے کے لیے فرصت درکار تھی سو وہ جلدی جلدی برتن دھونے لگی۔

امی کے پاس سے اٹھ کر جاتے ہوئے خالہ نے اسے اچھی طرح پیار کیا اور دل میں اپنے فیصلے پر مطمئن ہو گئیں۔

جبکہ مصباح کا سارا دھیان موبائل پر آتے نوٹیفکیشن کی بجتی گھنٹیوں پر تھا۔ باورچی خانے سے نکلی تو سیفی اپنی شرٹ استری کروانے کے لیے کھڑا تھا۔ چھوٹے، اکلوتے بھائی سے اس کی بنتی بھی خوب تھی۔ باتوں میں کافی وقت بیت گیا۔ درمیان میں اس نے کمنٹس پر نظر ڈالی مگر جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔

☆☆☆

روبینہ بیگم کو گھر آ کر اس بات کا تذکرہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ دراصل بات اتنی ضروری بھی نہیں تھی۔ گھر والوں سے لے کر رشتے دار، محلے دار، ملنے جلنے والے سب ہی واقف تھے کہ وہ اپنے بڑے بیٹے طلال کی شادی اپنی اکلوتی بھانجی مصباح سے کریں گی۔ سسرال میں ان کے کوئی تھا نہیں کیونکہ میاں صاحب اپنے والدین کی واحد اولاد تھے۔ میکے میں مصباح واحد لڑکی تھی کہ بھائی کے ماشاء اللہ —— چار بیٹے تھے اور بہن کے بس ایک بیٹا، ایک بیٹی ہی تھے۔ بہن کا سسرال وسیع تھا، کبھی نند سوال کرتیں کہ مصباح کی شادی کا کیا سوچا تو کبھی جٹھانی۔ سو آج اسے بھی اطمینان دلا دیا۔ یوں بھی اب طلال اچھا کما رہا تھا تو آج کل وہ اس کی شادی کا ہی سوچ رہی تھیں۔

اس اطمینان میں خلل اس وقت پڑا، جب نجمہ بھابھی کا فون آیا۔

"آپا طلال کی منگنی کر لی اور مجھے بتایا بھی نہیں۔ اکلوتی بھابھی ہوں آپ کی۔ ساتھ لے جانا بنتا ہے لیکن نہ بھی لے جاتیں تو اتنی غیریت تو نہ برتتیں۔"

نجمہ بھابھی نے سلام دعا کے ساتھ ہی ان پر حملہ کر دیا۔

"ارے، کون سی منگنی، کہاں لے کر جاتی تمہیں۔"

روبینہ بیگم کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"بس اب بنیں نہیں آپ۔ مٹھائی لے کر فاخرہ کے ہاں نہیں گئیں کیا آپ۔ مصباح کو انگوٹھی نہیں پہنائی آپ نے۔ میں نے خود تصویر دیکھی ہے فیس بک پر۔"

وہ مزید بیچ پا ہوئیں۔ وہ بھابھی تھیں۔ پھر ان کا پورا ارادہ آپا کی روشی کو بہو بنانے کا تھا۔ اس رشتے سے وہ اپنا حق سمجھتی تھیں کہ انہیں ہر معاملے میں آگے آگے رکھا جاتا۔ یہاں تو انہیں ہوا بھی نہیں لگنے دی اور پوری تقریب ہو گئی۔

"ارے نجمہ! بولے جا رہی ہو۔ سنتی نہیں ہو میری۔ میں نے کوئی انگوٹھی نہیں پہنائی مصباح کو، آج ایسے ہی گئی تو فاخرہ کہنے لگی کہ مصباح کے ددھیالی بہت سوال کرتے ہیں تو اس لیے منہ میٹھا کرا دیا کہ تسلی ہو جائے سب کی۔ اپنی بات سے نہیں پھری ہوں میں۔ مٹھائی لے کر جاتی تو تمہارے بھائی کو یا اپنے بھائی کو نہیں لے جاتی۔ ابھی تو گھر میں بھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔"

انہوں نے بڑے ہونے کا حق استعمال کرتے انہیں ڈپٹا اور پوری تفصیل بتائی۔ تو وہ دھیمی پڑیں۔

"اچھا! میں نے بھی ایسے ہی نہیں کہہ دیا۔ آپ تو فیس بک استعمال کرتی نہیں۔ بولیں روشی دکھائے گی آپ کو تصویر۔"

ان کی بات پر روبینہ بیگم نے منہ کھولے ساری باتیں سنتی بیٹی کو کمپیوٹر چلانے کا کہا اور خود الوداعی کلمات ادا کر کے فون بند کیا۔ روشی نے کمپیوٹر چلایا اور بے چینی سے پوچھا۔

"کیا ہوا۔ کس کی منگنی، کون سی مٹھائی۔"

انہوں نے مختصر لفظوں میں سارا قصہ سنایا اور تصویر دیکھ کر سر پیٹ لیا۔

مصباح کی تصویر سے سب نے از خود فرض کر لیا تھا کہ وہ یار، پھول اور مٹھائی کے ٹکڑوں کے ساتھ اس کے گھر گئی تھیں۔

روشی اور مصباح ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں تھیں۔ مصباح کا فائنل ایئر تھا تو روشی کا پہلا سال تھا۔ یونیورسٹی میں سب ان کے درمیان موجود رشتہ جانتے تھے۔ مصباح کی پوسٹ پر روشی کو بھی کئی لوگ مینشن کر چکے تھے۔ مامی کا کمنٹ بھی موجود تھا۔ ویسے چاہے وہ اس سب کو انجوائے کرتی، مصباح کو چھیڑتی مگر ابھی ممانی کی ناراضی دور کرنے کے لیے اس نے جواب دینے کے لیے مناسب لفظوں کا انتخاب کیا اور تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں۔ دوسری طرف امی خالہ کو فون کر رہی تھیں۔

☆☆☆

"مصباح! کیا لکھا ہے تم نے فیس بک پر۔ آپا کا فون آیا ہے۔ بھابھی اتنا خفا ہو رہی ہیں۔"

فاخرہ گھبرائی سی کمرے میں داخل ہوئیں۔ مصباح نے کپڑے استری کرتے کرتے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

"میں نے کیا لکھنا ہے امی۔ میں تو ممانی کی پوسٹ پر جاتی بھی نہیں ہوں۔"

"منگنی وغیرہ کا کچھ ڈالا ہے کیا؟"

اب انہوں نے کھل کر بات کی تو استری بند کرتے وہ مسکرائی۔

"جی ڈالا تو تھا۔"

موبائل اٹھا کر فیس بک چیک کی تھی۔ پوسٹ پر کافی سارے کمنٹس موجود تھے۔

"مبارک ہو۔"

"کب، کس سے۔"

"طلال بھائی کا کیا ہوا؟"

"روشی نے تو نہیں بتایا......"

"تمہارا رشتہ تو طے تھا نا۔"

ساتھ ہی ممانی کا بھی کمنٹ تھا۔

"اکیلے اکیلے، ہمیں تو نہیں بلایا۔"

ممانی کے کمنٹ پر ریپلائی میں روشی نے زبان چڑائی ہوئی تھی۔

"بالکل اکیلے ممانی۔ مجھے بھی نہیں بلایا۔"

مین پوسٹ پر بھی روشی نے شرارت سے کمنٹ کیا تھا۔

"بھابھی بھی اپنے منگیتر اور اس کے بہن بھائیوں کو بھی بلا لیتیں انگیجمنٹ میں۔"

روشی کے کمنٹ کے جواب میں اس کی کلاس فیلو کے سوال، روشی کے جواب اور پھر منگنی کی تفصیل موجود تھی۔ مصباح بدمزہ ہوئی۔

"حد ہو گئی ہے۔ اسی لیے لوگ رشتے داروں کو بلاک رکھتے ہیں۔ اچھے بھلے اسٹیٹس کا کیا حشر کر دیا۔ جیسے میں نے جھوٹا اسٹیٹس ڈالا ہو۔ اب کل سب میرا مذاق اڑائیں گے۔"

غم و غصے سے اس کا برا حال تھا۔

"کیا کر دیا؟" امی فکرمندی سے آگے ہوئیں۔

ان کے پوچھنے پر مصباح نے تصویر و تفصیل سے آگاہ کرتے اپنا مصمم ارادہ ظاہر کیا۔

"ابھی بلاک کرتی ہوں میں ان سب کو۔"

"کوئی ضرورت نہیں ابھی ایسا کچھ کرنے کی، بھابھی نے آسمان سر پر اٹھا لینا ہے۔ پہلے ہی سوچ سمجھ کر کام کیا کرو۔"

انہوں نے اسے جھڑک دیا۔ والدین کے بعد بھائی کے دم سے میکہ آباد تھا۔ بلاوجہ بھابھی کو ناراض کرنا دانش مندی نہ تھی۔

☆☆☆

اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں چند دن قصہ اڑتی دھول کی طرح بیزار کرتا رہا اور پھر خود ہی بیٹھ گیا۔ روبینہ بیگم اپنے میاں اور بھائی، بھابھی کو ساتھ لے کر اہتمام سے شادی کی تاریخ رکھنے آئی تھیں۔ روشی نے مصباح اور طلال کی تصاویر کے کولاج کے ساتھ "ویر میرا گھوڑی چڑھیا" کا اسٹیٹس مصباح کو ٹیگ کر کے دیا تھا۔ طلال بھائی کو ٹیگ کرنا اس لیے ممکن نہیں ہوا کہ انہیں اس سب میں کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی۔ خوشی سے سرشار بلاک کرنے کی سوچ بھی مصباح کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ بلاک کر دیتی تو سب اس کی شاپنگ کیسے دیکھتے۔ جہیز اور شادی کی تیاری کے ساتھ فیس بک پر اسٹیٹس لگانے کا کام بھی انہوں نے دلجمعی سے کیا تھا۔ خوب دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی۔ ممانی نے روشی کا باقاعدہ طور پر رشتہ مانگ لیا تھا۔ مونس ابھی پڑھ رہا تھا اور کم عمر ہی تھا۔ مگر ماموں کا اچھا کاروبار تھا۔ بیٹی نہیں تھی، سو گھر میں رونق کے لیے وہ بیٹے کی جلدی شادی کرنا چاہتے تھے۔

مصباح کے ولیمے والے دن روشی کی منگنی تھی۔ ممانی نے اپنے سب ارمان پورے کیے تھے۔ بے شمار تحائف کے ساتھ وہ اس کے لیے انگوٹھی بھی لائی تھیں۔ سب تصویریں فیس بک پر ڈالتے ہوئے روشی نے رئیل انگیجمنٹ کا کیپشن دیا تو ایک لمحے کو مصباح کا دل جل گیا۔

☆☆☆

خالہ کا گھر تھا۔ سب خیال رکھتے تھے۔ کزنز میں مقابلے بازی یا چھیڑ چھاڑ تو ہو ہی جاتی ہے مگر وہ سب مصباح کو بہت عزت دیتے۔ طلال کی صورت چاہنے والا شوہر تھا۔ جس نے بچپن سے مصباح کو ہی اپنی شریک حیات کے روپ میں دیکھا۔ مصباح بھی ان سب کی محبتوں کا جواب محبت سے دیتی تھی۔ یوں زندگی سہل گزر رہی تھی۔

روشی اور مصباح بدستور سوشل میڈیا کی ایڈکشن کا شکار تھیں۔ واٹس ایپ کے اسٹیٹس، فیس بک کے اسٹیٹس، ٹوئٹر کے ٹرینڈز اور انسٹا پر کلک شیئر کرنا فرصت کا مشغلہ تھا۔

مصباح ضد کر کے طلال کے فیس بک فرینڈ میں شامل ہوئی اور اپنا اور اس کا میریٹل اسٹیٹس تبدیل کیا۔ طلال اپنے دوستوں اور کولیگز کی وجہ سے اس سب پر راضی نہ تھا مگر مصباح نے اس کے اعتراض پر یہی کہا کہ میں کون سا تصویریں ڈالتی ہوں جو آپ کے دوست دیکھیں۔ پروفائل پر پرائیویسی لگی ہے۔ بس ذرا آپ کے ساتھ گھومتے پھرتے چیک ان کروں گی۔ آفس کی لڑکیوں کو بھی پتا چلے کہ یہ ہینڈسم اب دستیاب نہیں۔۔۔ اس کے شرارت بھرے لہجے پر طلال کو ہنسی آ گئی تھی۔

☆☆☆

"بھائی! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی شادی کی خوشی میں مجھے نیا موبائل دلائیں گے۔"

جیسے ہی طلال اور مصباح لاؤنج میں آ کر بیٹھے، روشی نے ٹھنک کر یاد دلایا تھا۔

سب کے چہروں کے تاثرات مختلف تھے۔ بھائی نے پیار سے اسے دیکھا تو نئی نویلی دلہن بھابھی چونک گئی تھیں۔ موسیٰ اپنے موبائل میں مگن رہا جبکہ ابو نے حیرت سے دیکھا تو امی نے ناگواری سے ٹوکا۔

"موبائل تو ہے تمہارے پاس، لینی ہے تو کوئی سونے کی چیز لے لو۔"

روشی نے سر جھٹکا۔

"چھوڑیں امی، آپ بھی پرانے زمانے کی بات کرتی ہیں، سونا چاندی کون پوچھتا ہے اب، اچھا سیل فون، لیپ ٹاپ، برانڈڈ کپڑے، جوتے ہونے چاہیے۔ پوری کلاس میں سب سے گھٹیا موبائل فون میرا ہے۔ مجھے نئے ماڈل کا لینا ہے، اس میں تو سوشل ایپس بھی ٹھیک سے نہیں چلتیں۔"

"اتنا پرانا موبائل بھی نہیں تمہارا، پھر گھر آ کر کمپیوٹر بھی استعمال کرتی ہو تو نئے موبائل کا کیا کرنا۔"

اس کی بتائی تفصیل پر ابو نے نقطہ اعتراض اٹھایا تھا، بھائی ان سب کی بحث سے الگ بھابھی سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔

روشی نے دل ہی دل میں اپنا سر پیٹا کہ اس وقت فرمائش لے کر آ گئی۔

"ابو جی، پروفیسرز کام دیتے ہیں تو یونیورسٹی میں ہی گوگل کر کے نوٹس بنانے میں آسانی رہتی ہے۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا اپنا آفیشل گروپ ہے، کلاس ملتوی ہو جائے یا کوئی اور اعلان ہو، سب کی پوسٹ لگتی ہے۔ کوئی مسئلہ ہو، مدد چاہیے ہو تو بھی کام آتا ہے۔ اب سیل فون سے فیس بک استعمال کروں گی تو صبح گروپ میں نظر ڈال لوں گی کہ آج کا کیا شیڈول ہے۔ اب فجر کے بعد تلاوت کے بجائے کمپیوٹر تو کھول کر نہیں بیٹھ سکتی نا۔"

روشی نے اتنے پیار سے سمجھایا تھا کہ اس کے دلائل پر اب تک اپنے موبائل میں سر دیے بیٹھا موسیٰ بھی مسکرا کر شوخی سے دیکھنے لگا۔ ابو سے نظر بچا کر آنکھ مار کر، باقاعدہ انگوٹھا اٹھا کر داد دی۔ روشی نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی جبکہ ابو جی تائیدی انداز میں گردن ہلاتے طلال سے بولے۔

"دلا دو بہن کو نیا فون، ایسے ہی بچی کے کام کا حرج بھی ہو رہا ہے تو احساس کمتری الگ پیدا ہو رہا ہے۔"

"جی ابو جی۔"

بھائی نے فرماں برداری سے کہا۔

بھابھی مسکرا کر خاموشی سے سب کی باتیں سنتی رہیں لیکن کمرے میں جاتے ہی فوراً روٹھے انداز میں مخاطب ہوئیں۔

"سنیے، مجھے بھی نیا سیل فون لینا ہے۔ سب دوستیں پوچھ رہی تھیں کہ شادی کے بعد بھی وہی پرانا موبائل ہے۔"

بھائی چونک گئے۔

"تمہارا تو اچھا بھلا فون ہے۔ میں نے تمہاری پچھلی سالگرہ پر دیا تھا۔ اب اس سے اچھا کیا لو گی۔"

"اچھا، اب آپ تحفے بھی جتلائیں گے؟ مرضی ہے آپ کی، ہنی مون پر لے کر نہیں گئے تو موبائل بھی نہ دلائیں۔ میں نے تو اس لیے کہا کہ لوگ کیا کہیں گے طلال سے بیوی کو ایک موبائل نہیں دلوایا گیا۔"

مصباح بھابھی خفا انداز میں ڈریسنگ ٹیبل کی چیزیں پٹخنے لگیں تو طلال بھائی نے جلدی سے معاملہ ختم کیا۔

"ناراض کیوں ہوتی ہو، لے لینا۔ تم سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔"

"آپ کتنے اچھے ہیں۔ چلیں نیٹ پر موبائل کے فیچرز چیک کرتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر لیں گے۔"

بھابھی نے فوراً مسکرا کر ناراضی ختم کی اور لیپ ٹاپ لے کر بیڈ پر آ بیٹھیں۔

طلال بھائی کی حالت قابل رحم تھی۔

جانے کون سے زمانے تھے جب بیویاں شاپنگ پر جاتیں تو خرچا ہوتا۔ اب تو گھر بیٹھے آن لائن شاپنگ ہی بجٹ ہلا دیتی تھی۔ نئی نئی شادی میں بار بار منع کرنا بھی اچھا نہیں لگتا مگر شکر ہی ہوا کہ مصباح نے بہت دیر کی سرفنگ کے بعد بھی صرف موبائل کا ماڈل ہی فائنل کیا۔ آن لائن کچھ آرڈر نہیں کیا۔

☆☆☆

موبائل تو طلال نے لے لیے مگر گھر پہنچ کر گاڑی سے نکالنا یاد نہیں رہا۔ آج اسے مصباح کو میکے چھوڑنے جانا تھا۔ جانے سے پہلے ان کا آؤٹنگ کا ارادہ تھا۔ اسے آفس سے آتے آتے کافی وقت لگ گیا۔ فریش ہوتے ہی وہ مصباح کو لے کر چلا گیا۔ روایتی سسرال نہیں تھی سو ساس نندوں نے خوشدلی سے خدا حافظ کیا۔

وہ رات گئے مصباح کو میکے چھوڑ کر اپنے گھر واپس آیا تھا۔

"یہ دیکھو روشی، تمہارا فون آ گیا۔"

طلال نے آتے ہی خوشی سے آواز لگائی۔

"سچ بھائی، دکھائیں۔"

روشی کمرے سے بھاگی آئی تھی۔

"صبر سے بیٹا، پہلے بھائی سے کھانا پانی پوچھو۔ چائے بنا کر لاؤ۔"

امی نے ٹوکا۔

"نہیں، کسی چیز کا موڈ نہیں۔ مصباح کو خالہ کے گھر چھوڑا تو کھانا کھا لیا تھا بلکہ چائے بھی پی چکا ہوں۔"

طلال نے مسکرا کر کہا۔

"سسرال کے مزے اڑا رہے ہیں بھائی۔"

موسیٰ نے لقمہ دیا۔

"تم بھی اڑا لینا۔"

طلال نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

روشی ان کی باتوں سے بے نیاز شدت سے موبائل کی منتظر تھی۔

"موبائل تو دکھائیں۔"

"یہ کمپنی تو میں نے نہیں کہی تھی۔"

موبائل دیکھ کر اس نے قدرے حیرت سے کہا

"پیسوں کا مسئلہ تھا گڑیا، فیچرز تو سب وہی ہیں۔"

بھائی نے تسلی دی تو وہ سر ہلاتی موبائل کا ڈبہ کھولنے لگی۔

بھائی اور ابو سونے چلے گئے تھے، موسیٰ دوستوں کے ساتھ کمبائن اسٹڈی کا کہہ کر چلا گیا۔ امی ٹی وی پر ڈراما دیکھ رہی تھیں جبکہ روشی نئے موبائل کو ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ سم ڈال کر اس کے آپشنز چیک کرتے وہ فیس بک کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

"یہ دیکھ رہی ہیں امی آپ۔"

روشی نے اسکرول کرتے نیچے دیکھا اور روہانسی ہو کر بولی۔

"کیا ہو گیا، آہستہ بولو، سب سو رہے ہیں۔"

انہوں نے ریموٹ سے آواز کم کرتے ڈپٹا تھا۔

"مجھے بھائی پیسوں کے مسئلے بیان کر رہے ہیں۔ بھابھی کو کیسے برانڈڈ سوٹ دلاتے پھر رہے ہیں۔ شاپنگ، ڈنر اور تو اور نیا سیل فون بھی، میرے والے سے زیادہ اچھا۔"

غصے سے کہتے روشی نے موبائل کی اسکرین سامنے کی، جہاں مصباح طلال کا اسٹیٹس بمعہ تصاویر کے جگمگا رہا تھا۔

"میرے اسٹیٹس پر تو رمشا بدتمیز نے بول بھی دیا کہ شکر ہے، بھابھی کی وجہ سے تمہیں بھی مل گیا۔"

آنسو روشی کی آنکھوں سے بہنے کو تیار تھے۔

امی بھی تاسف بھرے غصے سے تمام تصاویر دیکھ رہی تھیں۔

"یہ موسیٰ کا اسٹیٹس دیکھیں، میں یونیورسٹی ے دوستوں کے ساتھ برگر کھانے چلی گئی تو اتنا لمبا لیکچر، خود اس وقت دوستوں کے ساتھ جھینگا کڑاہی کھانے کتنی دور گیا ہے۔"

غصہ اس قدر تھا کہ موبائل ہاتھ میں لیتے ہی روشی نے بھائی کو بھی نہ چھوڑا اور اس کی تصویریں امی کو کھول کر دکھائیں۔

دوستوں کے ساتھ ہنستے مسکراتے موسیٰ کو ایک نظر دیکھ کر انہوں نے وقت دیکھا تھا۔ موسیٰ بیچارہ بلاوجہ پھنس گیا تھا۔ جس دوست کے گھر وہ پڑھنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ یہ مشہور ریستوران اس کے گھر کے پاس ہی تھا۔ کھانا کھانے کے بعد پوری رات انہوں نے لگ کر پڑھائی کی تھی مگر اب اس کی سنتی کس نے تھی۔

تھوڑی دیر بعد غصہ ٹھنڈا ہوا تو روشی نے بھی پہلے سے رکھا پیزا اور آئس کریم کی تصویریں "شکریہ بھائی" کے کیپشن کے ساتھ فیس بک پر ڈال دیں۔

اگلا دن کافی ہنگامہ خیز تھا۔ صبح، صبح ابو طلال پر برس رہے تھے۔

"تمہیں کریڈٹ کارڈ پر اتنی شاپنگ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی شادی کے قرضے نہیں اترے ہیں۔ اوپر سے سارے خرچوں کی تفصیل بھی فیس بک پر ڈال دی ہے۔ قریشی صاحب کا فون آ گیا ہے، ان سے جو ادھار لیا تھا، واپس مانگ رہے ہیں۔"

"میں کیا کرتا، روشی اور مصباح کو موبائل کی پڑی تھی۔ لے کر سب کو بتانا تو فرض تھا ان پر، فیس بک پر اسٹیٹس ڈالنے کے لیے تو خرچا کروایا تھا انہوں نے۔"

طلال بھی غصے سے روشی کو دیکھ کر بولے، مصباح بھابھی موجود نہیں تھیں سو امی نے چمک کر جواب دیا۔

"میری بیٹی کو کیوں گھور رہے ہو۔ اپنی بیوی کو ہی ہزاروں کا سوٹ نہ دلاتے۔ دیکھ لیے ہیں تمہارے سارے چیک ان۔ اتنے مہنگے ریسٹورنٹ میں جانے کی ضرورت کیا تھی۔"

"ارے امی، وہاں مال میں تو صرف چیک ان کیا تھا سب دوست، رشتہ داروں میں شو مارنے کے لیے۔ سوٹ تو ریپلیکا لیا ہے مصباح نے اور اس چائنیز ریسٹورنٹ سے ہم نے صرف سوپ پیا تھا۔ خالہ نے ساگ بنایا تھا اور آپ کو تو پتا ہے مجھے سرسوں کا ساگ کتنا پسند ہے تو کھانا خالہ کے گھر ہی کھایا۔"

ان کے انکشاف پر روشی کا منہ کھلا تھا جبکہ امی نے سر تھام لیا تھا۔

ابو نے افسوس سے سر ہلایا۔

"اپنی آمدنی سے زیادہ تعیشات پر خرچ کرنا وہ بھی صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نئی نسل جا کہاں رہی ہے۔ سو رہے ہیں، رو رہے ہیں، ہر چیز دنیا کو بتانا ضروری ہے۔"

"وہ بھی سب جھوٹ، اب اتنا تم نے خرچا نہیں کیا جتنا سب کی نظر میں آ گئے۔ ایک تو آج کل خدا جانے کون سا احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے تم سب میں جو یہ چھچھوری حرکتیں کرتے ہو۔"

امی نے مزید کہا۔

امی، ابو کی نصیحتیں جاری تھیں جبکہ بھائی سر تھامے اپنے موبائل پر چمکنے والے میسج کو دیکھ رہے تھے۔

"مجھے اچھا سا ڈنر کرواتے جان نکلتی ہے۔ بہن کے لیے آدھی رات کو پیزا، آئس کریم لے جاتے ہیں۔ کیا ہو جاتا اگر میرے واپس آنے کا انتظار کر لیتے۔"

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
بساطِ دل
افشاں آفریدی
بھی عجیب تھے
قیمت -/400 روپے
منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37- اردو بازار، کراچی- فون نمبر: 32735021

حیا بخاری

آسمان کا چاند

اوائل اپریل کے دن تھے۔ بہاروں کی مہکتی ٹھنڈک ابھی تک فضا کو معطر کیے ہوئے تھی۔ لیکن اتنے پیارے موسم کے باوجود وہ پسینے سے شرابور تھی۔ کچن میں ابتری کا عالم تھا۔ شلف پہ سارے برتن ادھر سے ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ سنک کا نل مکمل طور پہ بند نہ ہونے کے سبب مسلسل پانی ٹپک رہا تھا۔ اور ان دھلے برتنوں کے ڈھیر کی وجہ سے سنک نے مزید پانی بہانے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ نتیجتاً "پانی ادھر ادھر نکل کر اپنا راستہ بنانے لگا۔

آٹے میں خوب سارا پانی ڈال کر اس میں گول گول ہاتھ گھما کر اس نے مطمئن انداز میں اپنی انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنا کر جیسے خود کو داد دی اور اپنے آٹے سے بھرے ہاتھوں سے اچھی طرح اسی اطمینان سے پہلے پیشانی سے پسینہ صاف کیا' دھیان ہر طرف بہتے پانی پہ گیا تو جلدی سے نل بند کیا اور ہاتھ دھوئے بنا ہی سالن میں چمچ چلانے لگی۔ ساتھ میں اپنے اردگرد پھیلے سامان پہ بھی نگاہ کی۔

"ٹھیک ہے۔ کافی پھیلاوا ہو گیا مجھ سے۔ مگر آج تو بابا کو شکست دے ہی دی۔ کھانا بنا ہی لیا میں نے۔" اس نے کچن میں پھیلتی سوندھی خوشبو اپنی سانسوں میں لیتے ہوئے فخریہ لہجے میں خود کلامی کی۔

"اب بس روٹی ڈال لوں۔ پھر دیکھنا۔ بابا تو آج سچ میں اپنی انگلیاں چبا ہی ڈالیں گے۔" مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ سجی تھی۔

آنچ بند کر کے اس نے گنگناتے ہوئے ہاتھ دھوئے اور کمرے میں آ گئی۔ اس کی سلیقے سے سجی وارڈ روب اس کے سامنے تھی اور گہری سبز آنکھیں مسکرانے لگی تھیں۔ اس نے ایک ایک کر کے کپڑے نکال کر بیڈ پر اچھالنا شروع کر دیے۔ تقریباً "پندرہ منٹ کی خواری کے بعد اس کے پچھلے سال کے لان کے سوٹ اس کے سامنے تھے۔

"خواہ مخواہ ہی اتنا تھکا لیا خود کو۔ سب سے پہلے یہی نچلی دراز چیک کرنی تھی۔" اسے خود پہ غصہ آیا۔ جو سر جھٹک کر فوراً "بھگایا گیا۔ تیزی سے لان کے دو دوپٹے اٹھائے اور واپس کچن میں چلی آئی۔ اور پھر ذرا سی دیر میں وہ کافی حد تک ادھر ادھر پھیلا پانی خشک کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ دونوں گیلے کپڑوں کی پوٹلی اٹھائے اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ نظر پائیں باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی پہ پڑی۔

"اس طرف پھینک دوں۔ بابا تو ویسے بھی بہت کم جاتے ہیں وہاں۔" سوچ پہ فوراً "عمل بھی کیا گیا۔ اور دونوں دوپٹے کھڑکی سے اچھال دیے۔ جو سیدھے نیچے

مکمل ناول

پڑی ٹیبل پہ جاگرے۔ اردگرد بیٹھے تینوں نفوس چونک پڑے۔

"یہ تو سارے گھر کا ستیاناس کردے گی۔" بوا بیگم پل بھر میں ساری صورت حال سمجھ گئی تھیں۔ دہل کے رہ گئیں۔

"اطمینان رکھیے۔ چاہے ایک اینٹ نہ بچے اس گھر کی۔ مگر کھانا آج عینا ہی بنائے گی۔" شہریار خان نے ہاتھ میں پکڑی آبائی چھڑی سے دونوں کپڑوں کو باری باری دور اچھالا تھا۔

"تم لوگوں کو گھر کی پڑی ہے۔ مجھے تو اپنی عینا کی فکر ہے۔ کیسا باپ ہے تو شیری' میں نے تو تجھے کتنے پیار سے پالا اور تو اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک کرے گا۔" بتول دادی وہیل چیئر پہ بیٹھی بے چینی سے پہلو بدل گئیں۔ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اوپر کچن کی کھلی کھڑکی کی طرف دم کیا گیا۔

"جی' جی بتول اماں' آپ نے تو مجھے بے حد پیار سے مارا تھا۔ اور یہ آبائی چھڑی مجھے اس لیے تو اس قدر نہیں پیاری کہ آج تک سنبھال کے رکھی ہوئی ہے۔ آخر کو کتنی بار میرے شدید ترین بوسے لے چکی ہے۔" وہ جیسے انہیں کچھ یاد دلا رہے تھے۔

"ہاں تو تو تھا ہی اتنا شیطان۔ سارا محلہ تجھ سے پناہ مانگتا تھا۔ چلو مانا کہ کبھی کبھی آم (ہم) تجھ پہ ہاتھ اٹھا لیتا تھا۔ مگر وہ سب تیرے اچھے مستقبل کے لیے تھا اور یہ بات تو خود بھی مانتا ہے۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولیں۔ مطلب ان کو سب کچھ یاد تھا۔ شہریار ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

"خیر جو بھی ہے۔ میں نے آج تک عینا پہ سختی نہیں کی۔ اب بھی مجبوراً" کر رہا ہوں۔ صرف اور صرف اس کی بھلائی ہے اس میں۔ ورنہ آپ جانتی ہیں۔ لیلیٰ کے مزاج کو۔ کل کو اسے اگر عینا کے پھوہڑپن کا ذرا سا بھی علم ہوا تو آپ جانتی ہیں کیا نہیں کر سکتی ہیں لیلیٰ آپا۔" سنجیدہ لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے سگار سلگایا۔

"کیا کرلے گی وہ۔ زیادہ سے زیادہ نکاح ختم کردے گی۔" بتول اماں بے ساختگی میں کہتے ہوئے منہ پہ ہاتھ رکھ گئیں۔

"دیکھا بتول اماں! یہی غلطی ہے ہماری۔" انہیں پشیمان دیکھ کر وہ ان کی طرف جھکے۔

"اولاد کے پیار میں بھی ایک حد رکھنی چاہیے۔ ورنہ وہ ساری زندگی ہمارے غلط پیار کا تاوان ادا کرتے رہتے ہیں۔ عافین بہت اچھا لڑکا ہے۔ ایسا لڑکا چراغ لے کر بھی ڈھونڈنے نکلیں تو نہیں ملے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری محبت عینا کی زندگی تاریک کردے۔ پھر ویسے بھی اب وہ چھوٹی نہیں رہی' اسے اپنی ہر ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔" ان کی بات صحیح تھی۔ تب ہی بتول اماں خاموش رہیں۔ جب کہ بوا بیگم نے پریشان سی نگاہ اوپر کھڑکی پہ ڈالی تھی۔ جہاں خیالوں ہی خیالوں میں ہر چیز کا بیڑا غرق کرتی عینا انہیں صاف نظر آرہی تھی۔

دوپٹوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ توا چولہے پہ رکھ کر آٹے کے پیڑے بنانے لگی۔ مگر یہ کیا۔ آٹا مٹھی بند کرنے سے پہلے ہی ہاتھ سے بہہ نکلا تھا۔

"یہ کون سا آٹا دے دیا مجھے گوندھنے کے لیے بوا اماں نے؟" وہ پہلی بار پریشان ہوئی۔

"خود تو اتنا سخت گندھنے والا آٹا استعمال کرتی ہیں اور مجھے یہ آٹا دے دیا۔ اب اس کی روٹی کس طرح پکاؤں؟" اسے رونا آنے لگا۔

"نہیں' میں میجر شہریار خان کی بیٹی ہوں۔ اگر وہ کھانا بنا سکتے ہیں۔ کپڑے دھو سکتے ہیں۔ صفائی کر سکتے ہیں تو میں بھی ہر کام کر سکتی ہوں۔" اس نے جیسے خود کو ہمت دلائی اور پھر کیبنٹ سے ایک پیالہ نکال کر اس کی مدد سے آٹا نکال کر توے پہ ڈالا' چمچ سے اسے پھیلا کر روٹی کی شکل دی۔ لبوں پہ پھر وہی مطمئن سی مسکراہٹ پھیل چکی تھی۔

* * *

وہ بے دلی سے کچن کا سارا پھیلاوا سمیٹ رہی تھی۔ کچن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اور ٹھیک اس سے چند قدم دور رکھی ٹیبل پہ مسلسل ہوتی ٹک ٹک اسے بابا کی موجودگی اور ان کی گھورتی نظروں کا بخوبی احساس دلا رہی تھیں کہ وہ اس وقت کسی قسم کی رعایت دینے کے موڈ میں نہیں تھے۔

"میں نے پورے دل سے کھانا بنایا تھا۔" اس نے ہی پلیٹ کو سنک میں پٹختے ہوئے خاموشی کا دم توڑا تھا۔

"کھانا دل سے نہیں' توجہ اور ہاتھوں سے بنایا جاتا ہے۔ جب بنیاد ہی غلط تھی تو کھانا ٹھیک کس طرح بن سکتا تھا۔" چھڑی کی ٹک ٹک بلند ہوئی' وہ بڑبڑانے لگی۔

"مجھے پھر بھی پوری امید تھی کہ ایسا لذیذ کھانا آپ نے ساری عمر نہ کھایا ہوگا۔" اسے رونا آرہا تھا۔ مگر وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ آخر کو میجر شہریار خان کی بیٹی تھی وہ۔

"واقعی میں نے ایسا لذیذ کھانا کبھی نہیں کھایا۔ خدا کی پناہ' سالن میں ٹوماٹو پیسٹ کی جگہ ایک تو ٹوماٹو کیچپ ڈال دیا اور اوپر سے نمک اور مرچ کی بھی دگنی مقدار۔"

"ہاں تو دونوں کی شکل تقریباً" ایک جیسی ہوتی ہے۔ تو میں کیا کروں؟" وہ روہانسی ہوئی۔

"تم صرف یہ کرتیں کہ کھانا پکاتے وقت کم از کم کیچپ نہ کھاتیں۔"

"آپ کو پتا ہے میں نہیں رہ پاتی۔"

"یہی تو میں تمہیں سکھا رہا ہوں کہ بعض اوقات انسان کو' خاص کر عورت کو اپنے من کو مارنا پڑتا ہے۔" انہوں نے ایک تلخ سچائی بیان کی۔

"بس آپ کی یہی کڑوی باتیں مجھے نہیں سیکھنے دیتیں۔" اس نے سارا الزام ان کے سر ڈال دیا تھا۔

"جی' جی کچھ عقل ہو تو کچھ سیکھو بھی۔" انہوں نے بھی لحاظ نہ کیا۔

"ایم اے اردو میں گولڈ میڈلسٹ ہوں بابا۔" وہ تڑپی۔

"تعلیم عمل مانگتی ہے اور عمل میں تم صفر ہو بیٹا جانی۔ آٹے تک میں تو تم نے نمک کی جگہ چینی ملا دی۔" انہوں نے طنز کیا۔

"ہاں تو آج کل ان دونوں کی شکل بھی تقریباً" ایک جیسی ہو گئی ہے۔ تو میں کیا کروں۔" اس نے چینی اور آیوڈائزڈ سالٹ کو نشانہ بنایا۔

"تو یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ خالی خولی دیکھ کر سب کچھ نہیں ڈال دیتے۔ دماغ استعمال کرتے ہیں۔" ان کے لہجے میں آج نرمی بالکل مفقود تھی۔

"بس بابا! اب مجھ سے اور نہیں ہو رہا۔" تھوڑی ہی دیر میں پسینہ دوپٹے سے پونچھتے ہوئے وہ ان کے سامنے کرسی پہ ڈھے گئی۔ میجر شہریار بس اسے دیکھ کر رہ گئے۔

"یہ سب کام چوری کی علامت ہے۔ اتنے ٹھنڈے موسم میں بھی تمہیں پسینے چھوٹ رہے ہیں۔" وہ سخت خفا تھے۔

"ٹھنڈا موسم؟ میں تو آپ پہ حیران ہوں۔ اس قدر گرم موسم میں یہ تھری پیس سوٹ اور پھر اس پہ یہ کس کے بندھی ٹائی۔ توبہ۔" وہ اب ان کی توجہ خود سے ہٹا رہی تھی۔

"ہم آرمی والے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ سردی میں جب تم سب لوگ سکون سے یہ موٹے موٹے لحاف ڈال کر سوتے ہو۔ اس کے باوجود بھی کہ بند کمرے میں ہیٹر بھی حرارت دے رہے ہوں۔ انہی سرد راتوں میں ہم آرمی والے سیاچن' اسکردو' گلگت جیسے برف زاروں پہ ساری ساری رات برف پہ بیٹھ کر پلک تک نہیں جھپکتے۔

اور گرمی میں جب تم سب لوگ اے سی کی کولنگ میں دن کو بھی خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ہو۔ ہم وہاں پہاڑوں' میدانوں' سڑکوں پہ بنا کسی سائے کے تپتی دھوپ میں فل یونیفارم میں اپنے فرائض سر انجام دیتے ہیں۔" حسب توقع ان کی جذباتی تقریر

شروع ہو چکی تھی۔ عینا کامیاب رہی تھی۔

"ویسے تم یہ نہ سمجھو کہ میں بے وقوف بن گیا ہوں۔" اچانک ہی وہ آٹے کی طرف جھکے۔ عینا کے مسکراتے لب یک دم ہی سکڑے تھے۔

"وہ کیا ہے، ہم آرمی والے عوام کو پریشان نہیں دیکھ سکتے۔"

"بس تم پہ رحم آگیا تھا۔" وہ ہنستے ہوئے بولے تھے اور عینا اٹھ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔

"آئی لو پاک آرمی۔" اس نے بابا کو زور سے بھینچتے ہوئے کہا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

* * *

"مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تجھے یوں اچانک یہ جن کیوں چڑھ گیا ہے؟" چائے پیتی بتول اماں نے عینک ذرا اوپر کی۔

"یہ بات آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟" وہ حیران ہوئے۔

"ہاں تو اور کیا گلی میں جا کر کسی سے پوچھوں۔ تو ہی میرے سامنے بیٹھا ہے اس وقت۔" انہوں نے ناراضی بھرے لہجے میں کہا۔ شہریار ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

"بتول اماں آپ جانتی ہیں کہ عینا کا نکاح بچپن سے عافین کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔ اور لیلیٰ آپا کئی بار مجھ سے اشاروں میں اس بات کے متعلق پوچھ چکی ہیں۔ انہوں نے مجھے عافین کی طرف سے بھی ہر صورت مطمئن رکھا۔ مگر میں نے صاف کہہ دیا کہ عینا کی تعلیم مکمل ہونے تک میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ حالاں کہ بات صرف عینا کی تعلیم تک نہ تھی۔" وہ ذرا دیر رکے، بتول اماں منتظر رہیں۔

"بلکہ میرا دل بھی تھا۔ جو عینا کو خود سے اتنی دور بھیجنے پہ قطعی راضی نہ تھا۔"

"تو کیا اب تمہارا دل راضی ہے؟" خالص پشتو لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے آنکھیں دکھائیں۔

"دل اب بھی مطمئن نہیں ہوا لیکن اس سے زیادہ دیر ٹھیک بھی نہیں۔ میں نے کہا نا کہ ماں باپ کو بعض فیصلے اپنی محبت کو پس پشت ڈال کر بچوں کی بہتری کے لیے لینا ہی پڑتے ہیں۔ اور بس میں اب یہ فیصلہ لے چکا ہوں۔ کہ جب بھی لیلیٰ آپا، عافین اور عینا کی شادی کا ذکر چھیڑیں میں کسی قسم کا تردد نہیں کروں گا۔" انہوں نے میز سے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو اس میں عینا بچاری کی زندگی یوں چکری میں ڈال دینا یہ کہاں کی اچھائی ہے؟" بتول اماں ابھی تک مطمئن نہ تھیں۔

"ہے، بلکہ عینا کی ساری بہتری کا انحصار ہی اب اس چیز پہ ہے کہ عینا اپنی ذمہ داریوں کو سمجھے۔ ایک عورت کے فرائض کو جانے۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں بتول اماں کہ عینا اور لیلیٰ آپا دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جس عمر میں عینا صرف فرینڈز، ایف بی اور پزا کے گرد گھومتی ہے۔ اس عمر میں لیلیٰ آپا گھر، شوہر اور بچوں کی خاطر نہ صرف اپنے وطن سے اس قدر دور جا بسیں بلکہ ہمارے بغیر جینا بھی سیکھ لیا، پھر لیلیٰ آپا کو تو بچپن سے ہی ہر چیز پرفیکٹ چاہیے۔ انیس بیس کا فرق ان سے برداشت نہیں ہوتا اب آپ خود سوچیں عینا جیسی کاہل اور کام چور لڑکی کیوں کر ان کے دل میں جگہ بنا پائے گی۔ وہ واقعی پریشان تھے۔

"آئے ہائے۔ اب ایسے تو نہ بولو تم۔ ماشاء اللہ سے بہت خان (اچھا) بچہ ہے امارا عینا۔ پھر کس قدر ذہین ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ امارا (ہمارا) پوتی ہے۔ دیکھنا آہستہ آہستہ سب سیکھ جائے گا۔" انہوں نے اطمینان دلایا۔

"نہیں، سیکھنا تو اسے شادی سے پہلے ہی ہو گا۔ پھر وقتاً" فوقتاً" پوچھتی رہی ہیں آپا کہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کورس وغیرہ بھی کروا رہے ہو کوکنگ وغیرہ کے یا نہیں۔ تب میں نے کتنی بڑھکیں ماریں، اب میں لیلیٰ آپا کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔" انہوں نے دو ٹوک فیصلہ سنایا۔

"اوہو۔ تو خاناں یوں بولو نہ۔ کہ پھنسا ہوا تم خود ہے اور اب آگے کر رہا ہے میری عینا کو۔" بتول اماں کو غصہ آنے لگا۔

"جو بھی ہے بتول اماں! سب عینا کے فائدے کے لیے ہے اور اس بار میں آپ کی بھی کوئی بات نہیں سنوں گا۔ آپ عینا سے کہہ دیں شام تک تیار رہے۔ اگلے ایک ہفتے تک وہ ممانی سے کوکنگ کی کلاس لے گی۔"

"ایک ہفتہ۔ اتنا عرصہ ام کیسے رہے گا؟" ان کا منہ کھلا۔

"آپ بھی اس کے ساتھ جا سکتی ہیں۔ ویسے بھی آپ کی سگی بھانجی کا گھر ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" ان کی سانس بحال ہوئی۔ شہریار مسکرا دیے۔

* * *

"شہریار بھائی کو تو بس وہم ہو گیا ہے خالہ۔ لیلیٰ آپا کو کوئی نوکرانی چاہیے کہ بہو۔" عطیہ نے پودوں کو پانی دیتے ہوئے کہا تو بتول اماں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہی تو ام نے بھی کئی بار بولا۔ مگر بات شہری بھی ٹھیک کرتی ہے۔ لیلیٰ کا عادت ایسا ہی ہے۔ وہ تو ٹیک (ٹھیک) شے میں سو نقص نکال لاتا ہے۔" اپنے خالص پشتو لہجے میں بولتے ہوئے ان کی آواز میں خدشات بول اٹھے۔

"ہاں، یہ بات تو ہے اور پھر وہ خود بھی تو کتنی پرفیکٹ ہیں۔ قسم لے لیں خالہ! دونوں بیٹیوں کی ایسی تربیت کی ہے کہ نہ صرف میرے دل سے ان کے لیے دعا نکلتی ہے۔ بلکہ اپنے پرائے سب میری بہوؤں کے سلیقے اور سیرت پہ فدا ہیں۔" ان کی آواز کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھیں بھی خوشی سے لو دینے لگیں۔

"ماشاء اللہ، یہ بات تو ہے۔ آخر بیٹی کس کا ہے؟" بتول اماں کا بوڑھا چہرہ چمکنے لگا۔

"مگر پھر بھی لیلیٰ کا مزاج ام پہ نہیں گیا۔ وہ تو ایسا بولتا ہے کہ تورا بورا کے پہاڑ کو بھی پسینہ آجائے۔" چہرے کی چمک پہ پھر خفگی غالب آنے لگی۔

"ہاں، یہ انداز ان کا غلط ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر سکھانے سے بچوں کا اعتماد کھو جاتا ہے۔ عیشا اور میشا کو دیکھ لیں۔ امریکہ میں پرورش پانے کے باوجود یہاں آ کر ایسے چھپتی پھرتی ہیں جیسے کوئی مفرور مجرم ہوں۔ بڑی مشکل سے میں نے اور بچوں نے ان کا اعتماد بحال کیا ہے۔" وہ ہاتھ صاف کرتے ہوئے ان کے پاس ہی کرسی پہ بیٹھ گئیں۔

"بس یہی سوچ سوچ کر امارا دل بیٹھا جاتا ہے۔ اب عینا کو اکیلے کیسے اتنا دور بھیجے گا ام۔"

"اللہ خیر کرے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" انہوں نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں تسلی دی تھی۔

اور پھر اگلا پورا ہفتہ ماہی، میشا اور عیشا سب نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا تھا۔ مگر عینا نہ بدلی۔ کبھی سالن، ٹی وی شوز کی محبت میں جلا بیٹھی۔ کبھی صفائی کرتے کرتے کوئی نہ کوئی چیز ایسی گرا دیتی کہ عیشا اور میشا کا پھر صفائی کرتے کرتے برا حال ہو جاتا۔ اور قیامت تو اس دن ٹوٹی جب روٹی ڈالنے کی کوشش میں وہ پورا ہاتھ جلا بیٹھی۔ رو رو کے اس نے آدھا آسمان سر پہ اٹھا لیا تھا۔

"کیا پوچھا؟..... آدھا آسمان کیوں؟"

"یار باقی دادی اور دوسرے گھر والوں نے اٹھا لیا تھا۔" شہریار انکل اور لیلیٰ آپا کو نوازتے ہوئے۔ (کاش یہاں زبان چڑا سکتی) ہی ہی ہی۔

* * *

اس بار کی ناکامی ناقابل معافی تھی۔ شہریار خان نے اس سے بولنا تک بند کر دیا تھا۔ کھانا بھی کمرے میں منگوا لیا تھا۔ وہ کئی بار دل مضبوط کر کے ان کے دروازے پہ دستک دینے جاتی۔ مگر پھر واپس پلٹ جاتی۔ ہمت ہی نہ ہوتی۔

ابھی بھی لاؤنج میں بیٹھی انگلیاں چٹخا رہی تھی کہ

فون بج اٹھا۔ کیونکہ قریب ہی بیٹھی تھی۔ سو فوراً ریسیور اٹھا لیا تھا۔

"السلام علیکم۔" دوسری طرف لیلیٰ پھپھو تھیں۔ خود بخود ہی اس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ "ان سے ہی بابا کی شکایت لگانی چاہیے۔ آخر کو ایک اکلوتی بھتیجی ہوں۔ سیدھا کر کے رکھ دیں گی میجر صاحب کو۔" اس نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے ارادہ باندھا۔

"ہیلو۔" پھپھو نے دوبارہ پکارا۔

"السلام علیکم پھوپھو۔" وہ چونکی۔

"وعلیکم السلام۔ میری جان نے فون اٹھا لیا آج تو۔" دوسری طرف لہجے میں ابھرتا پیار محسوس کر کے اس کی مسکراہٹ مزید نکھر گئی۔

"ورنہ تو ترس جاتی ہوں تمہاری آواز سننے کو۔" انہوں نے گلہ بھی کر ڈالا۔

"رئیلی سوری پھپھو۔" مصنوعی معذرت۔ "اصل میں آپ کو تو پتا ہے ناں کہ آج کل لائف کتنی ٹف ہے۔ اسٹڈی، فرینڈز، گیمز، سوشل ایکٹیویٹیز سب کو کتنا ٹائم دینا پڑتا ہے۔" اپنے تئیں تو اس نے اچھی خاصی مصروف زندگی جتائی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں دوسری طرف لیلیٰ پھپھو کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"اور پھر یہ ڈائجسٹ کی ٹینشن، اور ان کے طویل ناول، غلطی سے بس ایک قسط پڑھ لو تو باقی ساری قسطوں کا دل بار بار پوچھے گا کہ آئندہ قسط کب آئے گی۔ حالانکہ اچھی طرح پتا ہوتا ہے کہ اگلے ماہ ہی آئے گی۔ مگر نہ جی اتنی ٹینشن اف کہ نہ پوچھو۔" اس نے پیشانی سے پسینہ صاف کیا۔ دوسری طرف نہ جانے کیوں خاموشی چھائی رہی۔

"پھپھو؟" اسے لگا لائن کٹ گئی۔

"ہم!" دوسری طرف شاید وہ چونکی تھیں۔ "اچھا گھر کے کاموں میں بھی زیادہ دلچسپی لیتی ہو تم شاید پھر اسی وجہ سے۔ میں نے بھی ان کتابوں سے بہت کچھ سیکھا۔" ان کی آواز ذرا مدھم تھی۔

"گھر کے کام؟" وہ منمنائی "اللہ نہ پوچھیں پھپھو! بابا نے آج کل میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔" اسے گلے شکوے یاد آ گئے۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟ خیریت۔" پھپھو بھی پریشان ہو گئیں۔

"قسم لے لیں پھپھو! جب سے یونیورسٹی آف ہوئی ہے میری۔ تب سے بس ہر وقت دھمکی، غصہ اور ڈانٹتے رہتے ہیں۔" نہ جانے کس تالاب کے مگرمچھوں سے اس کی دوستی تھی۔ جو موقع ملتے ہی اسے آنسو ادھار دے دیتے تھے۔

"لیکن کیوں؟ ہوا کیا ہے؟ پوری بات بتاؤ مجھے۔" لیلیٰ کو واقعی فکر ہونے لگی۔

"وہی پھپھو۔ عام روایتی ماؤں والی باتیں۔ پتا نہیں کہاں سے سیکھ لی ہیں۔ ہر وقت طعنے۔ کچھ نہ کچھ سیکھ لو۔ خود کو ہی آسانی ہو گی ورنہ اگلے گھر جا کر اپنے ساتھ ساتھ میری بھی ناک کٹوا دو گی۔ کھانا بناؤ، آٹا گوندھو۔ روٹی بنانا سیکھ لو۔ صفائی کا سلیقہ رکھو۔ یہ کرو وہ کرو اُف —" اس نے کسی بڑی بوڑھی کی طرح یوں ہاتھ ہلا ہلا کر کہا۔ جیسے واقعی پھپھو اسے دیکھ رہی ہوں۔

"تمہیں کھانا بنانا نہیں آتا؟" نہ جانے کیوں اسے پھپھو کا لہجہ اس بار اتنا دکھی لگا جیسے ان کا کوئی قریبی مر گیا ہو۔

"جی پھپھو! اب آپ خود ہی بتائیں۔ میجر شہریار خان کی بیٹی کو بھلا کوئی کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہے کہ نہیں؟" اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا، فون بند ہو چکا تھا۔ وہ حیرت سے ریسیور کو تکتی رہ گئی۔

"اوہ۔ بابا یہ غصہ! آخر اپنی اکلوتی بھتیجی کا صدمہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔" مسکراتے ہوئے ریسیور پٹخا گیا تھا۔

* * *

دن بدن یہ لڑکی ان کی پریشانی بڑھا رہی تھی۔ لیلیٰ آپا کسی بھی وقت شادی کے لیے کہہ سکتی تھیں اور عینا تو ان کی ہزار کوششوں کے باوجود گھر کے کاموں سے یوں دور بھاگتی جیسے دو شادیاں کرنے والا مرد تیسری شادی سے۔

اوپر سے انہوں نے کس قدر تعریفوں کے پل باندھ رکھے تھے لیلیٰ آپا کے سامنے اپنی بیٹی کے سگھڑاپے اور سلیقے کے۔ اور اب.... ان کو ہمیشہ یہی لگا تھا کہ جونہی عینا کا دھیان پڑھائی سے ہٹے گا۔ وہ یکسوئی سے سارے کام سیکھے گی۔ تب ہی اس کو کبھی گھر کے کاموں کو ہاتھ نہ لگانے دیا تھا۔ لڑکی ہونے کی وجہ سے فطرتاً بھی اگر وہ کوئی کام کرنا چاہتی تو بڑی محبت سے اسے یہ کہہ کر روک دیا کرتے کہ میجر شہریار خان کی بیٹی کو کام کرنے کی کیا ضرورت۔ مگر انہیں ہرگز یہ نہ پتا تھا۔ کہ وہ اس بات کو اپنے پلو سے باندھ کے رکھ لے گی۔ بلکہ اس نے تو شاید یہ بات گرہ میں باندھ لی تھی کہ اب اگر وہ خود اسے کوئی کام کرنے کا کہتے تو وہ بڑے مزے سے ان کے وہی فقرے دہرا دیتی۔

سوچ سوچ کے ان کا دماغ اور شل شل کے ٹانگیں شل ہونے لگی تھیں۔ سگار سلگاتے وہ بیڈ پہ بیٹھ گئے۔ تب ہی ان کا سیل بجنے لگا۔ ایک نظر اسکرین پہ ڈالی۔ لیلیٰ آپا کا نام جگمگا رہا تھا۔ انہوں نے جھٹکے سے سگار پھینکا اور تیزی سے کال ریسیو کی۔

"عینا کیسی ہے شیری؟" سلام کے بعد ہی انہوں نے پوچھا تھا۔ وہ ذرا حیران ہوئے تھے۔

"ٹھیک ہے، کچن میں ہے۔ بلاؤں؟" خود کو سنبھالا۔

"اچھا! کیا کر رہی ہے؟"

"ظاہر ہے رات کے کھانے کی تیاری۔" کھسیانی ہنسی۔

"واہ، زبردست ویسے کیا کیا بنا رہی ہے آج؟" سوال در سوال انہیں نہ جانے کیوں دال میں کچھ کالا نظر آنے لگا تھا۔ دل ذرا سا ہولا تھا۔

"جانتی تو ہیں آپا۔ ایک چیز کہاں بناتی ہے۔ شاید پلاؤ یا بریانی کیونکہ رائس کی ایک ڈش تو لازمی ہے اس کے مینو میں۔ ساتھ میں شاید کوفتے بنائے اور نہیں تو کباب تو ضرور بنائے گی۔" وہ بمشکل بتا پائے۔

"کچھ اور ڈشز بھی سوچ لو، اور پھر بھی اگر یاد نہ

الف لیلہ
ہزار داستانیں

الف لیلہ ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنھیں پڑھ کر
بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں
جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب -/1200 روپے
ڈسکاؤنٹ -/300 روپے
آج ہی -/950 روپے
منی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

آئے کوئی ڈش تو زبیدہ آپا کے سارے تراکیب کے رسالے لے کر دیکھ لو۔" اب کی بار آواز ذرا سی تیز ہوئیں۔ ادھر خاموشی رہی۔

"ساری دال ہی کالی ہو چکی تھی۔ اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا شہری تم نے؟" خفگی سے پوچھا گیا۔

"کم از کم تم مجھے اس بات سے بے خبر نہ رکھتے تو میں کچھ نہ کچھ کر کے عینا میں یہ شوق ڈال ہی دیتی' آخر وہ لیلیٰ کی بھتیجی ہے۔" فخر سے جتلایا گیا۔ اور انہوں نے تسلیم بھی کیا۔

"میرے تو ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔ تہجد کے وقت سے لے کر سونے تک ہر وقت کام۔ کام میں جتی رہنے والی لیلیٰ کی بہو کی اتنی تلف لائف' اسٹڈی' میوزک' ٹی وی' ڈائجسٹ' سوشل ویب سائٹس' موبائل' فرینڈز اور بس۔"

"کوبہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی۔" انہوں نے کڑھ کے سوچا تھا۔

"یہ سب آپ کو کس نے بتایا؟" انہیں اچانک ہی ایک کمزور سا خیال آیا۔ سب کچھ سے مکر جانے کا خیال۔

"ابھی عینا سے بات ہوئی میری۔" تیز لہجے میں گولی ماری گئی جیسے اور وہ چاروں شانے چت ہو گئے۔

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔" ایک اور سوچ بے بس سی۔

"اب تم میری بات غور سے سنو۔ میں نے شایان (لیلیٰ کے بڑے داماد) سے کہہ دیا ہے۔ وہ سب انتظام کروا دے گا۔ عینا کو چند دنوں کے لیے میں اپنے پاس بلوا رہی ہوں۔" اور شہریار خان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"لیکن وہ کیوں؟" انہیں خود اپنے سوال کا مطلب سمجھ میں نہ آیا۔

"ابھی بھی تمہیں کچھ پوچھنے کا کوئی حق ہے؟" الٹا سوال آیا۔

"خیر پھر بھی تمہارے سوال کا یہی جواب ہے کہ میں بھی عینا کی ماں ہی ہوں۔ ایک باپ ہونے کے ناتے تم سے جو کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ میں انہیں سدھارنے کی کوشش کروں گی۔ کیا یہ کافی ہے تمہارے لیے یا اور جواب دوں۔" چبا چبا کر کہے گئے تھے الفاظ۔

"آپ کی ہی بیٹی ہے آپا۔ میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" انہوں نے ہار مانی۔ ان کی بات مکمل ہوتے ہی لیلیٰ نے فون بند کر دیا تھا اور وہ دل ہی دل میں عینا کی بے وقوفی پہ تڑپ کے رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

عینا کو پتا چلا تو ہواؤں میں اڑنے لگی۔ خوشی سے تناسب سے زیادہ سانسیں آنے لگیں۔ کاش ایسے خوش گوار لمحوں میں بڑھ جانے والی آکسیجن کہیں جمع کی جا سکتی۔ موبائل میں موجود نمبرز کو پیغام دے کر بتایا گیا (اپنے تئیں خوب جلایا گیا) whatsapp پہ چیختی چلاتی آڈیو بھیجی گئی اور خاص طور پہ (I am in America) والی شرٹ پہن کر فل اسٹائل سے تصویر لے کر فیس بک کی ڈی پی تبدیل کر دی گئی۔ لیکن خوشی اس قدر بانٹنے کے باوجود بھی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"عافین ایک کام کرو گے۔" لیلیٰ کمرے میں آئیں' عافین لیپ ٹاپ پہ مصروف تھا۔

"کیا کر رہے ہو؟" عافین کے ذرا کے ذرا نظریں اٹھاتے ہی انہوں نے دوسرا سوال بھی کر دیا۔

"جی امی! ضرور کروں گا اور جس ہوٹل میں' میں کام کرتا ہوں وہ ہوائی میں بھی ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ کھولنا چاہتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے آرام سے ماں کے دونوں سوالوں کا جواب دیا تھا۔

"اسی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی سب بات طے کر رہے ہو؟" وہ حیران ہوئیں۔

"نہیں امی! چوٹ کی وجہ سے میں چھٹی پہ تھا۔ تب ای میل کے ذریعے بس مطلع کیا اور یہ بھی کہا کہ جو بھی تجاویز ہوں میرے پاس' وہ نوٹ کرا دوں۔" لیپ ٹاپ ایک طرف کھسکا کر وہ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"اوہو' مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ میں ہلدی لگا دوں تمہیں۔" انہیں اچانک ہی خیال آیا۔

"کب کا لگا چکا امی! اور ویسے بھی کافی بہتر ہوں میں' آپ یہ بتائیں تمہیں کیا کام تھا آپ کو۔" اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے ماں کا ہاتھ تھاما۔

"فیس بک پہ عینا کو ڈھونڈنا ہے مجھے۔ ذرا دکھاؤ تو یہ کیسی سوشل ویب سائیٹ ہے اور کتنی بڑی رہتی ہے میری بھتیجی۔" ان کا کام سن کر نہ جانے کیوں عافین کو اپنے سو کام یاد آ گئے۔ وہ فوراً بیڈ سے نیچے اترنے لگا۔

"کیا ہوا؟"

"ایک کام یاد آ گیا امی۔"

"کون سا کام یاد آ گیا اور وہ بھی اس قدر اچانک؟"

"امی ضروری کام تو ہمیشہ اچانک ہی یاد آتے ہیں۔" بونگی ماری۔ اماں کا کھلا منہ مزید کھل گیا۔

"بیٹھ جاؤ آرام سے۔" وہ بھی بھلا کب اتنی آسانی سے ہار ماننے والی تھیں۔

"مجھے عینا کا اکاؤنٹ دکھا دو۔ پھر جو چاہے کام کرو۔" فوراً اسے کھینچ کے دوبارہ بٹھا لیا۔ عافین نے بے بسی سے لیپ ٹاپ سامنے کیا۔ اور چند لمحوں بعد اسے مزید کام یاد آنے لگے تھے۔ جب اس نے عینا کا اکاؤنٹ ڈھونڈا۔ لیکن وہ جانتا تھا' فی الحال یہ کام اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ لیلیٰ نے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات بھانپتے ہی لیپ ٹاپ اپنی طرف موڑا اور اگلے ہی پل وہ اپنے سارے کام بھلائے حیرت سے لیپ ٹاپ کی اسکرین تکے جا رہی تھیں۔ جہاں ان کی نرم و کومل سی' شولڈر کٹ سنہری بالوں والی بھتیجی کی خوب صورت تصویر مسکرا رہی تھی۔ شرارت سے ایک آنکھ بند تھی۔ زبان منہ سے باہر اور بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی پہنی شرٹ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

"آئم ان امریکہ۔" لکھائی صاف تھی۔

"استغفراللہ۔" ان کے بڑبڑانے پہ عافین نے بمشکل گلے میں اٹھتے جوار بھاٹے (قہقہے) کا گلا گھونٹا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا کہہ رہے ہیں شایان؟" شایان نے جونہی عینا کے امریکہ جانے کا ذکر چھیڑا کھانے کی میز کے گرد موجود سب ہی نفوس کو اچھو لگ گیا۔ عیشا بمشکل پوچھ پائی۔

"اس میں اتنی ہولناک بات کیا ہے جو آپ سب کے رنگ اڑ گئے؟" کاشان نے حیرت سے ان کے پھیکے پڑتے چہروں پہ چوٹ کی۔

"آپ کو امی کے غصے کا نہیں پتا پھر ان کا ڈسپلن۔ اُف۔۔۔ عینا جیسی لاپروا لڑکی تو ایک منٹ کے ہر سیکنڈ میں ڈانٹ کھائے گی۔" عیشا کی بھوک مٹ گئی تھی۔

"اور ظاہر ہے یہ بات سب سمجھ سکتے ہیں کہ اس طرح بار بار ٹوکے جانے کا رزلٹ کچھ بھی نکل سکتا ہے۔ عینا سے کسی بھی بے وقوفی کی توقع کی جا سکتی ہے۔" یشا بھی فکر مند تھی۔

"یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں کہ پریشان ہوا جائے۔ پھر عینا نے ایک نہ ایک دن تو وہاں جانا ہی ہے۔ آخر وہ عافین کی بچپن کی منکوحہ ہے۔" کاشی نے بریانی پہ ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"جی۔۔۔ جس کا عینا کو ابھی تک نہیں پتا۔" عینا نے کہا۔

"ہاں' یہ سب کی غلطی ہے' کم از کم عینا کو اس بات سے لاعلم رکھنے کی مجھے تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔"

"اور اگر لیلیٰ پھپھو کے گھر اس طرح کی بات کا پتا چلتا ہے اسے تو واقعی وہ ری ایکٹ کر سکتی ہے۔" شایان کو ان کی بات ٹھیک لگی۔

"ہنہ۔" کاشان نے ہنکارا بھرا۔

"مجھے تو بے حد ترس آرہا ہے بیچاری **عینا** پہ۔" سب سونے کے لیے چلے گئے۔ مگر وہ دونوں بہنیں وہیں بیٹھی **عینا** کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ تب ہی **عیشا** کے فون کی رنگ ٹون چیخ اٹھی۔

"**عینا**۔" اس نے یشا کو بتا کر کال پک کی۔

"سرپرائز۔ **عیشا** آپی! بوجھو تو کیا ہو گا؟" چھوٹتے ہی اس کی چہکتی آواز **عیشا** کے کان میں پڑی۔

"اتنی خوش ہے اسے شاید پتا نہیں کہ امریکہ جا رہی ہے۔" اس نے ذرا سا جھک کر یشا کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ سرہلا گئی۔

"کچھ بتالیا؟" **عیشا** نے اندازہ لگایا۔

"نہیں۔" اس نے انکار کیا۔

"گھر کی سیٹنگ تبدیل کرلی؟" ایک اور تکا۔

"بالکل بھی نہیں۔" رد ہوا۔

"اوکے پھر تم خود بتادو پلیز۔" اس نے ہار مانی۔ ول ویسے بھی نہ جانے کیوں بوجھل ہو رہا تھا۔

"میں امریکہ جارہی ہوں۔ امریکہ!" چیختی آواز نے **عیشا** کے ہوش گم کر دیے تھے۔

"کیا ہوا؟" یشا نے سوال کیا۔ **عیشا** نے خاموشی سے سیل اس کی طرف بڑھا دیا۔

"کیا ہوا **عینا**؟" سوال دہرایا۔

"یشا آپی، میں امریکہ جارہی ہوں امریکہ۔" اور اس بار کھلے منہ سے یشا نے **عیشا** کی طرف دیکھا تھا۔

"اسے تو پتا ہے یار۔" **عیشا** بمشکل بولی۔

"اور یہ تو بے حد خوش بھی ہے؟" یشا نے سیل ہی آف کر دیا۔

"اس دھج سے کوئی مقتل میں گیا..." **عیشا** مسکرائی اور یشا باقاعدہ ہنسنے لگی تھی۔

* * *

"کوئی بھی پریشانی ہو۔ مجھے فون کرنا۔" شہریار نے پیکنگ میں اس کی مدد کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے بابا" وہ سعادت مندی سے بولی۔

"خبردار جو اس کو فون کیا۔ ام کو کرنا۔" دادی ناراضی سے بولیں۔

"اوکے دادی۔" وہی سادہ سا جواب۔

"اور ہاں! وہاں سنبھل کر رہنا۔ سگی ماں کے گھر نہیں جارہیں تم۔" ایک اور نصیحت۔

"کسی سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ام تمہارے ساتھ ہے 'ادھر بھی ادھر بھی۔" بتول اماں نے شہریار کو آنکھیں دکھائیں۔

"اور ہاں 'عافین سے اس طرح فرینک ہونے کی ضرورت نہیں ہے جیسے تم یہاں کاشی اور شانی سے ہو جاتی ہو۔" بتول اماں کی بات پہ ضبط کرتے ہوئے انہوں نے ایک کرہ ڈالی۔

"لو عافین سے نئیں (نہیں) ہوگی تو فرنگیوں سے ہوگی۔ سنو بھلا۔" ان کی ہزار احتیاط کے باوجود بتول اماں اس بات کا مقصد سمجھ گئی تھیں۔ سو لب چبا گئے۔

"اور سب سے اہم بات 'صرف عافین یا پھپھو کے ساتھ ہی باہر جانا۔ بالکل بھی اکیلے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اوکے۔ اگر کبھی عافین یا لیلیٰ آپا سے چھوٹی موٹی لڑائی ہو بھی جائے تو اسے برداشت کرنا۔ کوئی بھی الٹی سیدھی حرکت کرنے کا مت سوچنا۔"

"اوکے بابا۔" اسے جمائیاں آنے لگیں۔

"کیوں... کیوں کرے برداشت؟" بتول اماں کو پھر غصہ آیا۔ "کوئی نہ کرنا برداشت۔ امریکہ میں جگہ جگہ پولیس والے بیٹھے ہیں۔ فوراً جا کر شکایت کروا دینا بچیا۔ (بچے 'یا پشتو میں بچوں کو پیار سے کہتے ہیں) انہوں نے اسے مزید ہدایات دیں۔

"بتول اماں! آپ نہ سدھرنے دینا اسے۔" ان کے ضبط کی طنابیں چھوٹ گئیں۔

"ایسے بھی نئیں سدھرتے۔ جو تم لوگوں نے حل نکالا۔" وہ تو تھیں ہی غصے میں۔

"ٹھیک ہے پھر آپ ہی سمجھائیں اسے۔ وہاں جا کر کچھ الٹ پلٹ کر دیا نا اس نے تو ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔" وہ غصے سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

"تم کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بات بھی ہو ادھر۔ ام کو فون پہ بتا دینا۔ ہم ادھر سے ہی سب کے کان کھینچ لے گا۔"

"ٹھیک ہے بتول اماں۔" وہ مسکرا رہی تھی۔

* * *

واشنگٹن ایئرپورٹ کے چکنے فرش پہ پاؤں پڑتے ہی اسے لگا جیسے وہ ابھی اڑنے لگی ہو۔

سامان لے کر وہ باہر آئی تو عافین کو منتظر نظروں سے ادھر ہی تکتا پایا۔ وہ فوراً" اس کی طرف آیا تھا۔

"عافین بھائی!" لمبی چیخ مار کے وہ اس کی طرف لپکی۔ عافین نے بمشکل اسے خود سے لپٹنے سے روکا تھا۔

"مجھے سب پیار سے عافی بلاتے ہیں۔" اسے خود اپنے الفاظ پہ رونا آیا۔

"تو لیں۔ اب مجھ سے تو آپ بڑے ہیں ناں۔" **عینا** نے ٹوکا۔

"مجھے 'چھوٹے بڑے سب پیار سے عافی کہتے ہیں۔" تصحیح کی گئی۔

"اوہ 'اوکے اوکے عافی۔" وہ بھی شاید سمجھ گئی۔

تب ہی عافین کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے شہریار انکل کا نام دیکھتے ہی کال پک کی۔

"انکل! اسے تو میرا اور اپنا رشتہ تک پتا نہیں۔ بھائی کہہ رہی ہیں موصوفہ اور اب...؟" اسے گاڑی میں بٹھا کر وہ ایک طرف ہو کر بولا۔

"بچی ہے نا عافین۔" دوسری طرف سے مسکراتے ہوئے کہا گیا۔ اس نے حیرت سے گاڑی کی کھڑکی سے باہر لٹک کر ادھر ادھر تکتی **عینا** کو دیکھا تھا۔

"اور پھر تم ہو نا۔ مجھے پورا یقین ہے۔ تم میری بیٹی کا پورا خیال رکھو گے۔" وہ گردن ہلا کر رہ گیا تھا۔

* * *

"گھر آخر کتنی دور ہے؟" سوال کر کر کے اس کا ناک میں دم کرنے والی **عینا** خود بھی تنگ آگئی تھی۔

"گھر ابھی بہت دور ہے **عینا**! ہم شام تک ایک دوست کے گھر پہنچ جائیں گے۔ رات وہیں رکیں گے اور پھر کل ان شاء اللہ گھر۔" وہ اطمینان سے بتانے لگا۔

"اتنی دور۔" وہ جو باہر قدرتی نظاروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ چونکی۔

"جی۔" مختصر جواب آیا۔ نہ جانے کیوں **عینا** کو پہلی بار وہ الجھا الجھا سا لگا۔

"ویسے کس شہر میں جانا ہے ہم کو۔" وہ ذرا سی نیند لے کر اٹھی تو ابھی بھی اسے اسی طرح محویت سے ڈرائیو کرتے دیکھ کر فوراً" پوچھا۔ اس بار عافین دھیمے سے مسکرا دیا۔

"یہ تو بولتی بھی بہت ہے۔ امی کو ٹھیک ٹھاک نچانے والی ہے۔"

"کچھ کہا آپ نے؟"

"نہیں تو۔ میں نے بتایا نا کہ ابھی ہم ایک دوست کے گھر رکیں گے۔ پھر صبح روانہ ہوں گے۔" دور تک پھیلے دریا کے پار سورج ڈوبنے کی تیاری کر رہا تھا۔

"کتنا پیارا منظر ہے ناں؟" **عینا** نے حیرت سے سڑک کے ایک طرف لگے درختوں کو دیکھا۔ نہ جانے کتنے ہی رنگ ایک ساتھ بکھر گئے تھے۔ عافین نے اس کے چہرے پہ آتے ستائش کے رنگ محسوس کرتے ہی گاڑی ایک طرف روک دی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ حیران ہوئی۔

"مجھے لگا تم نیچے اتر کر اس منظر سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہو۔" وہ مکمل اس کی طرف مڑ کر بیٹھ گیا۔

"مگر آپ نے بتایا' سفر لمبا ہے تو میں نے اس لیے نہیں کہا۔" نہ جانے کیوں وہ اس بار اس سے نظریں نہ ملا پائی۔

"اب تو میں نے خود روک دی گاڑی۔ سو تم انجوائے کر سکتی ہو۔"

"تھینک یو۔" وہ فوراً" باہر نکل گئی۔

"ویسے اتنی بری بھی نہیں ہے۔" وہ سوچ کر مسکرایا۔

"سدھار لایا جا سکتا ہے۔" وہ بھی باہر آگیا تھا۔

* * *

عینا کو ماریہ بھابھی کے ساتھ چھوڑ کر وہ احمر کو لیے باہر آگیا۔

"مجھے لگتا ہے تم نے میری شادی سے اچھا خاصا سبق لیا ہے؟" ٹھنڈی نم ہوا بے حد بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ دونوں باڑ لگی پگڈنڈی پہ چلتے جا رہے تھے۔

"کیا مطلب؟" عافین متحیر ہوا۔

"یار! پہلی بار تمہاری منکوحہ تمہارے ساتھ گھوم پھر رہی ہے اور جناب کا رنگ اڑا ہوا ہے۔" وہ مسکرایا۔

"جس قدر میں خوش تھا، تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔" اس نے باڑ کے ساتھ لگے اناری پھولوں والے درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"تو اب یہ ہوائیاں کیوں؟" احمر نے بھی اس کی تقلید کی۔

"امی کو جانتے ہو تم اور ان چند گھنٹوں میں مجھے عینا کی بچکانہ عادتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہے۔ اوپر سے اس کا ڈریس اور مجھے قوی امید ہے کہ میڈم سارے کپڑے اسی طرح کے لائی ہوں گی۔" اور یہ واقعی سچ تھا۔ وہ تو اسے پاکستانی روایتی لباس میں ملبوس دیکھنے کا خواہش مند تھا اور اسے امید بھی یہی تھی مگر عینا کو گھٹنوں سے ذرا اوپر شرٹ اور گلے میں لکیر نما مفلر دیکھ کر اسے واقعی دھچکے لگے تھے۔ حسب عادت سوچتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ خود بخود سائیڈ پاکٹ میں چلا گیا۔ وہ مضطرب تھا۔ احمر مسکرا دیا۔

* * *

"آپ دونوں کی لو میرج ہے؟" مزے سے سیب کترتی وہ انگلش میں بولی۔ احمر کی مسز ماریہ نومسلم امریکن لڑکی تھی۔ اسے اردو نہیں آتی تھی۔ یہ سب جان کر وہ بے حد ایکسائیٹڈ تھی۔

"جی۔۔۔ مگر پہلی پسند احمر کی تھی۔ انہوں نے جب مجھے پروپوز کیا تو میں نے انکار نہیں کیا۔ مجھے لگا اللہ نے مجھے انعام دے دیا۔ کیوں کہ ہم ایک ہی جگہ کام کرتے تھے اور میں ان کو اچھی طرح جانتی تھی۔" ماریہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہائے اللہ۔ کتنا مزہ آیا ہو گا نا۔" وہ اٹھ کر پرجوش لہجے میں کہتی احمر اور عافین کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"کاش کوئی یہیں امریکہ میں اسی طرح مجھے بھی پروپوز کر دے۔" جوس پیتے احمر کو زور کا اچھو لگا اور عافین، اس کی تو کمر صوفے کی پشت سے جا لگی تھی۔ کھڑا ہوتا تو یقیناً" زمین سے بھی جا لگتی۔

"عینا! آپ تو مجھ سے بھی زیادہ لکی ہو۔" ماریہ فوراً" اس کے پیچھے آئی تھی۔ عافین اچھی خاصی ان دونوں کی برین واشنگ کر چکا تھا۔

"وہ کیسے؟" عینا حیران ہوئی۔

"وہ ایسے کہ تمہیں منی سوٹا کی سلیٹی پانیوں کی سرزمین بلا رہی ہے۔" وہ بات بدل رہی تھی۔

"یہاں کی شام کتنی حسین ہے نا؟" وہ کھڑکی کے پار جھانکتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ واقعی یہاں کی شام بہت حسین ہے اور دیکھنا اسی طرح کی کسی شام میں پانیوں میں جھلملاتی روشنیوں کی نوخیز کرنوں میں کوئی تمہیں بھی تم سے مانگ لے گا۔" ماریہ نے شرارت سے سامنے بیٹھے عافین کی طرف دیکھا۔ وہ زبان چڑا گیا۔

"سچ میں؟ دعا دے رہی ہیں آپ؟" ماریہ کو کچن کی طرف جاتا دیکھ کر وہ بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔

"میری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں۔" احمر نے اس کے مضبوط شانوں پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"مکا کھائے گا۔" عافین نے واقعی میں مکا دکھایا۔ احمر کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

* * *

"ویسے ماریہ! کیا آپ نے اسلام احمر بھائی کے لیے قبول کیا تھا۔" رات کافی سرد تھی وہاں کی۔ پھر بھی وہ ضد کر کے ماریہ کو باہر باغیچے میں لے آئی تھی۔ جس کے چاروں طرف لکڑی کی ننھی سی باڑ لگا کر صحن کی شکل دے دی گئی تھی۔ اسے واقعی وہاں آ کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"نہیں، ہرگز نہیں میں نے بتایا نا کہ ہم دونوں ایک ہی آفس میں کام کرتے تھے۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ احمر مجھ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مجھے اپنی ایک دوست کی وجہ سے اسلام کو جاننے کا موقع ملا۔ پھر میں نے باقاعدہ اس کے ساتھ کئی لیکچر بھی اٹینڈ کیے۔ اسلام اور غیر اسلامی مفکرین کی کتابوں کا مطالعہ کیا اور جب میں ذہنی طور پہ بے حد مضبوط ہو گئی تو میں نے قرآن پاک کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور بس میں اپنے رب کے قریب آ گئی۔" ماریہ کے چہرے پہ کس قدر نور بکھر رہا تھا۔ وہ گم صم سی اس کو دیکھے گئی۔

"احمر نے تو اسلام قبول کرنے کے بعد اس وقت مجھے پروپوز کیا جب گھر والوں کے رویے سے تنگ آ کر میں گھر چھوڑ کر ایک دوست کے پاس رہنے لگی۔" اس کے گلابی ہونٹ مسکائے۔

"واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کتنی زبردست رومینٹک اسٹوری ہے آپ کی۔ کاش، کاش کہ میں بھی ایسی لکی ہوتی۔" پھر وہی حسرت۔

"ویسے عافین کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" ماریہ کو موقع اچھا لگا۔

"جی!" عینا چونکی۔

"میرا مطلب ہے کہ احمر کی طرح عافین بھی تو اسمارٹ ہے۔ کتنی ڈیشنگ پرسنالٹی ہے ان کی۔" باہر آتے عافین کے قدم رکے۔ وہ جواب سننا چاہتا تھا۔

"ہاں۔ آخر کزن کس کے ہیں۔" اس نے فرضی کالر جھاڑے۔

"پھر میرے ابو، میرے دادا اور شانی اور کاشی بھیا، بس یوں سمجھیں کہ آپ کی فلم میڈیا کے سارے ٹام کروز، جیمز بانڈ، بریڈپٹ ان کے مقابلے پہ آئیں تو شرما جائیں۔ عافین بھائی تو کافی پیچھے ہیں ابھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسمارٹ ہیں۔ لیکن۔" وہ رکی۔ عافین کا سر جھکا۔

"لیکن پھر بھی۔۔۔ مگر وہ شان نہیں جو بابا اور دادا جی کے قد کو مزید بڑھا دیتی تھی۔" ماریہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام گئی۔

"اور پھر سب سے بڑھ کر مونچھیں۔۔۔ ان کی مونچھیں نہیں ہیں جو کہ ہمارے خاندان کے مردوں کی شان ہیں۔" اس نے بات ختم کی اور وہ شرم سے ڈوب بھی نہ سکا کیونکہ گھر کے قریب جھیل تو تھی مگر چلو بھر پانی نہ تھا۔

* * *

"حیرت ہے تم ایک پیدائشی مسلمان ہو کر یہ کپڑے کیسے پہن لیتی ہو۔" وہ تیار ہو رہی تھی۔ جب ماریہ وہاں آئی۔ ماریہ کی بات سن کر وہ چونکی۔

"کیا مطلب؟"

"اتنی ٹائیٹ شرٹ، سلیولیس اور پھر ٹائیٹ جینز۔ جبکہ اس معاملے میں تو اسلام اور قرآن کی ہدایات بہت سخت اور واضح ہیں۔"

"ارے یہ بات نہیں ماریہ۔ اصل حیا تو انسان کی آنکھ میں ہونی چاہیے۔" اس نے دلیل دی۔

آنکھ کی حیا اور پردہ تو مرد کے لیے ہے۔ عورت کے لیے تو ایک بال تک کا پردہ واجب کیا گیا ہے۔ کہاں اتنے تنگ لباس۔" وہ اس قدر نرم لہجے میں بول رہی تھی کہ عینا کو واقعی شرم آنے لگی۔

"پتا ہے۔ میں تمہاری پھپھو سے کئی بار مل چکی ہوں۔ امریکہ جیسے بڑے ملک میں رہتے ہوئے بھی انہوں نے آج تک خود کو پاکستانی کلچر اور اسلامی شناخت سے الگ نہیں ہونے دیا۔ ویسے اگر دوست مانو تو ایک بات مانو گی میری۔" اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

"ہاں ماریہ! آپ میری واقعی بہت اچھی دوست ہو۔ مجھے آپ کی باتیں بے حد اچھی لگیں۔ میں نے سچ میں محسوس کیا کہ واقعی میں غلط ہوں۔" وہ شرمندہ ہوئی تھی۔

* * *

بلیو جینز پہ بے بی پنک کلر کی لمبی سی شرٹ اور اوپر

میرون کلر کا گہرا اسکارف' عافین نظریں نہ ہٹا پایا۔ خود عینا کو بھی اپنا وجود بے حد اجلا اجلا اور پر اعتماد لگ رہا تھا۔ اسے وہ گھبراہٹ نہیں ہو رہی تھی جو وہ سوچ رہی تھی کہ ہوگی۔ کیونکہ وہ اس سب کی عادی نہ تھی۔

"رشتے بہت پیاری چیز ہوتے ہیں۔ سوچو اتنے عرصے بعد جب لیلیٰ آنٹی آپ کو اس طرح دیکھیں گی تو کتنا ہرٹ ہوں گی کہ وہ امریکہ جیسے ملک میں رہ کر بھی اپنی روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور ان کی عزیز از جان بھتیجی پاکستان سے یوں مغربی انداز اپنا کر آئی ہے۔ اب آپ اتنا تو کر ہی سکتی ہیں اپنوں کے لیے۔" اور اس نے فوراً" ماریہ کی بات مان لی تھی اور اب واقعی اسے خود بھی اچھا لگ رہا تھا۔

"تھینک یو سو مچ یار اور اسپیشلی بھالی آپ کا۔" اس نے عینا کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ان کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"عینا کے رویے میں بہت لچک ہے۔ آنٹی اگر اپنی تند مزاجی کی وجہ سے غلطی کریں تو پلیز تم دھیان رکھنا۔ یقین کرو عینا بالکل ویسے ہی روپ میں ڈھل جائے گی جیسے تم اسے دیکھنا چاہتے ہو۔ مگر صرف پیار اور عزت سے۔" ماریہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عافین نے سر ہلاتے ہوئے احمر سے مصافحہ کیا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا منی سوٹا کی طرف جانے والا سارا راستہ اسی طرح ہے۔ ایک طرف دریا تو دوسری طرف سرسبز درخت۔" وہ شاید بور ہونے لگی تھی۔

"یہ جھیل لنکا ہے۔ جو دریائے مسیسپی کا حصہ بن جاتی ہے۔" اس نے اس کی بوریت دور کرتے ہوئے مسکرا کر بتایا۔

"ویسے سچ کہوں۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ لوگ اس قسم کے نام کی کسی ریاست میں رہتے ہیں۔ میں تو نیویارک اور واشنگٹن جیسے بڑے شہروں کے سپنے دیکھتی رہی۔" وہ اس کی طرف مڑ کر بیٹھ گئی۔

"بڑے شہروں کا حسن تو مصنوعی ہوتا ہے۔ آرٹ اینڈ آرکیٹکچر کی مرہون منت۔ اصل حسن تو ہے ہی ان قدرتی مقامات پر' ورڈز ورتھ کی محبوبہ نیچرل بیوٹی۔" وہ بتانے لگا۔ انداز ایسا تھا کہ عینا کو دلچسپی محسوس ہونے لگی۔

"اور پھر منی سوٹا نہ صرف قدرتی مناظر کا شاہکار ہے۔ بلکہ ٹھیک ٹھاک مصنوعی خوب صورتی کی بھی مالک۔ جو نظروں کو خیرہ کر دے۔ تم بھول جاؤ گی نیویارک اور واشنگٹن کو۔"

"ریلی۔ ایسا کیا ہے منی سوٹا میں۔" وہ پوری آنکھیں کھولے متجسس سی اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"بتاتا ہوں۔ ایک سیب دینا۔" اس نے گاڑی قدرے چوڑے راستے پہ ڈالتے ہوئے کہا' یہاں دونوں طرف درخت تھے۔ گلابی' سبز' زرد' اودے اور عجیب عجیب سے رنگوں والے آنکھوں کو تسخیر کر لینے والے درخت' عینا نے دلچسپی سے درختوں کی سیدھی رو کو تکتے ہوئے ایک سیب اٹھایا پچھلی سیٹ پہ پڑی ٹوکری میں سے اور بے فکری سے ایک دو بائیٹ لے کر عافین کی طرف بڑھا دیا۔ عافین نے سامنے دیکھتے ہوئے سیب لیا اور اگلے ہی لمحے اس کا کھلا منہ مزید کھلا۔

آدھا سیب اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے حیرت سے عینا کو دیکھا۔ وہ بے فکری سے سیب چبا رہی تھی۔ وہ کندھے اچکا کر خود بھی سیب کترنے لگا۔

"اب بتائیں بھی۔" عینا کا صبر جواب دے گیا۔

"اس کی وجہ شہرت ہے اس کی دس گیارہ ہزار جھیلیں۔" وہ خود ہی بتانے لگا۔

"اوہ۔ دس ہزار جھیلیں۔"

"جی جناب۔ یہاں زیادہ تر خالی ویرانے ہیں مگر لوگوں کی سیاحت اور دلچسپ تفریحی سہولیات کی وجہ سے وہ بھی سال کے کئی ماہ آباد رہتے ہیں۔" وہ اس وقت بھی کسی ویرانے سے ہی گزر رہے تھے۔ دونوں طرف بیابان زمین اور نہ جانے کتنی دور تک جاتی پتلی سی صاف ستھری سڑک' دھوپ میں کسی چمکیلے سانپ کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

"اگر منی سوٹا ریاست ہے۔ تو ریاست کا کوئی شہزادہ بھی ہوگا۔" اچانک ہی عینا کی آنکھیں چمکیں۔ عافین نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔

"ہاں۔" مختصر جواب دیا۔

"کنوارہ ہے۔" مزید پرجوشی سے سوال کیا گیا۔

"جی۔" اسے بھی شرارت سوجھی۔

"ویسے وہ کیسے دکھتے ہیں۔ آپ نے کبھی دیکھا ان کو؟" عافین نے ایک نظر اسے دیکھا۔ بڑی بڑی کالی آنکھوں میں شوق نمایاں تھا۔

"روز ہی دیکھتا ہوں۔" اس کے منہ سے پھسلا۔

"جی۔" حیران ہوئی۔

"میرا مطلب ہے کئی بار۔ کیوں کہ میں اکثر گیا ہوں۔"

"او کے! کیسے ہیں وہ؟" پھر وہی سوال۔

"ہم۔" وہ کچھ سوچنے لگا۔ "کسی یونانی دیوتا کی طرح۔" اس نے گاڑی روک دی۔

"سنہری آنکھوں والا' دلوں کو تسخیر کرنے والی مسکراہٹ اور۔۔۔ اور۔" وہ واپس سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ ہو گئی۔

"اور۔" عینا بے تاب ہوئی۔

"اور بھی بہت کچھ ہے لیکن۔" وہ مایوسی سے بولا۔

"لیکن کیا؟" ادھر بے صبری تھی۔

"لیکن اس کی مونچھیں نہیں ہیں۔" نچلا ہونٹ پھر دانتوں تلے دبایا۔

"اوہ۔" عینا نے اطمینان بھرا سانس لیا۔

"اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ پٹھان تھوڑی نہ ہے بابا کی طرح آخر اتنی بڑی ریاست کا شہزادہ ہے' پھر ماڈرن دور کا ہے۔ اتنا تو اس کا حق بنتا ہے۔" وہ پھر باہر جھانکنے لگی تھی۔ عافین کے ہونٹوں پہ بڑی دلکش مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"سنو!" وہ ذرا سا کھڑکی سے باہر نکل کر چیخی تھی۔

"ہرکولیس کے ہم پلہ! میں آ رہی ہوں منی سوٹا۔ پانیوں کی سرزمین پہ تمہارا غرور توڑنے۔" وہ کھلکھلائی اور عافین نے مسکراتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔

* * *

"اپولس اور سینٹ پال" منی سوٹا کے جڑواں شہر ہیں۔ اور زیادہ تر یہی علاقے آباد ہیں۔ ہم بھی یہیں جا رہے ہیں۔" شہری علاقہ شروع ہوتے ہی عافین نے آگاہ کیا۔

شہر کے داخلی راستے پہ سامنے درختوں کے بیچوں بیچ یادگاری نشان کھڑا تھا۔ جس پہ سنہری حروف میں لکھا تھا۔

"Minne Sota welcome's you"

(منی سوٹا خوش آمدید کہتا ہے آپ کو)

عافین نے مسکراتے ہوئے وہ الفاظ دہرائے تھے۔ اور عینا بھی مسکرا دی تھی۔

تقریباً" آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ لوگ ایک فارم نما علاقے میں داخل ہوئے۔ ہر طرف بیضوی' گول' مربع اور ترچھی شکل کے کھیتوں کے قطعے بے حد دلکش معلوم ہو رہے تھے۔ ذرا دور جا کر ہی گھروں کی ڈھلوانی چھتیں نظر آنا شروع ہو گئی تھیں۔

"یہاں برف باری بہت زیادہ ہوتی ہے۔ تب ہی چھتیں ڈھلوانی رکھی جاتی ہیں تاکہ برف آسانی سے بہہ سکے۔ یہ ویسے دیہی علاقہ ہے۔ مگر تمام جدید سہولیات کی وجہ سے تیزی سے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔" عافین نے ایک لین میں گاڑی گھماتے ہوئے بتایا اور پھر بالکل احمر کے گھر کی باڑ لگے صحن کی طرح والے گھر کے سامنے ان کی گاڑی جا کر رکی۔ وہ دونوں نیچے اترے۔

اور پھر لیلیٰ پھپھو سے مل کر اس کے وہ سارے خدشات دم توڑ گئے۔ جو دوسروں کی زبانی ان کے متعلق سن سن کر اسے لاحق ہو گئے تھے۔

"کل سے میری سیاحت شروع۔ منی سوٹا تمہیں تسخیر کرنے سے اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔" مسکراتے ہوئے اس نے نرم سا کمبل اپنے گرد لپیٹا

تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ نیند کی وادیوں میں منی سوٹا کے شہزادے کو تلاش کر رہی تھی۔

* * *

"حد ہوتی ہے سونے کی؟" کسی نے جھٹکے سے اس کا کمبل کھینچا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ غصے سے بولی۔

"ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں لڑکی۔ یہ اٹھنے کا ٹائم ہے۔ نماز کے لیے بھی نہیں اٹھیں اب تو اٹھ جاؤ۔" پھپھو کا لہجہ بے حد سخت تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔

اس نے آنکھیں بند کیں کہ شاید سامنے کھڑا غصہ کرتا وجود کسی اور کا ہو مگر نہیں، وہ لیلیٰ پھپھو ہی تھیں۔ اسے رونا آنے لگا۔

"اب اٹھو اور ناشتہ کرلو۔ میں نے کام پہ بھی جانا ہے۔" انہوں نے سختی سے کہا اور باہر نکل گئیں۔

"پھپھو چند گھنٹوں میں بدل کیسے گئیں؟" وہ آنسو روکتی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

"امی تھوڑی مزاج کی سخت ہیں۔ تم خفا مت ہونا۔ ویسے بھی چند ہی دن کے لیے رہنے آئی ہو۔ آئی ہوپ برداشت کرہی لوگی۔" عافین نے اسے بتا دیا تھا۔

"ڈونٹ وری۔ مجھ پہ تھوڑی غصہ کریں گی۔ میں تو مہمان ہوں۔" اس نے کتنے مان سے کہا تھا اور عافین ہنس دیا تھا۔

"امی نے تمہیں یہاں سب کام سکھانے کے لیے بلوایا ہے۔ وہ تمہاری گھر کے کام میں کچھ تربیت کرنا چاہ رہی ہیں اور اس طرح کافی ڈانٹ کھا سکتی ہو۔" اس وقت وہ واقعی اگنور کر گئی تھی۔ مگر اب لیلیٰ پھپھو کے غصے نے اسے بوکھلا کے رکھ دیا تھا۔

وہ باہر آئی تو اوپن کچن کے سامنے رکھی چھوٹی سی ٹیبل پہ ناشتہ لگا تھا۔ جہاں عافین بیٹھا کافی پی رہا تھا۔

"ناشتہ کرلو۔ پھر برتن سمیٹ لینا۔ صفائی میں نے کرلی ہے۔ تم بس اپنے اور اپنے انکل کے لیے کھانا بنا لینا۔ سارا سامان اور ترکیب لکھ کر رکھ دی ہے۔ کوئی بھی مشکل ہو تو ان سے بھی پوچھ سکتی ہو۔ اچھی خاصی کوکنگ کرلیتے ہیں۔" وہ اسے ہدایت دیتے ہوئے مسلسل ڈسٹنگ بھی کررہی تھیں۔

"ارے۔ اگر انکل کو کھانا پکانا آتا ہے تو کیوں سامان ضائع کروانا چاہتی ہیں۔ پھپھو۔ انکل ہی بنالیں گے نا کھانا۔" سینڈوچ پہ ہاتھ صاف کرتے ہوئے بے نیازی سے جواب آیا۔ عافین کو اچھو لگ گیا اور پھپھو وہ تو کچھ بول ہی نہ پائیں۔

"ویسے امی! آج پہلا ہی دن ہے اور آپ اس بے چاری کو کام پہ لگا رہی ہیں۔" عافین نے مداخلت کی۔

"صرف میں چالیس دن ہے یہاں اور حالت دیکھ رہے ہو۔ تم تو اندازہ لگا سکتے ہو کہ کتنے کم ہیں یہ دن۔" انہوں نے کوئی بھی رعایت دینے سے انکار کیا۔

"اور پھر کام ہی کتنے ہوتے ہیں گھر کے۔ باقی ٹائم آسانی سے گھوم پھر سکتی ہے۔ امید ہے تم سمجھ گئی ہو گی۔" وہ اس کی طرف پلٹی تھیں۔

"جی، جی پھپھو۔ آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ میں بنالوں گی۔" پھپھو کا لہجہ تیز ہوتا دیکھ کر اس نے فوراً ہامی بھری۔

لیلیٰ کے جانے کے بعد اس نے عافین کو بھی نکلتے دیکھا تو اس کے پیچھے باہر آگئی۔ منی سوٹا کی صبح بے حد دلکش تھی۔ ہلکی ہلکی دھند کو چیرتی سورج کی نارنجی کرنیں سبزے کو عجیب سے رنگ اور چمک بخش رہی تھیں۔

"آپ مجھے گھمانے لے جائیں گے نا۔" گاڑی کی طرف جاتے عافین نے مڑ کر اسے دیکھا۔ صبح کے منظر میں وہ اجلی اجلی صبح کی جیسی لڑکی نہ جانے کیوں اس کے دل کی دھڑکنیں منتشر کررہی تھی۔

"ہاں لے جاؤں گا، کہاں جاؤ گی؟"

اور تھوڑے سے چاول ڈال کر بھوننے لگی۔ چار پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ چاول پھدک پھدک کر فرائی پین سے نکل کر ادھر ادھر اڑنے لگے۔

"واہ! چائنیز ڈش تو بالکل چائنیز لوگوں کی طرح ہوتی ہے۔ ہی ہا کر کے اچھلنے کودنے والی۔" چاول اب پیندے سے چپکنے لگے تھے۔

"او شاید بن گئے۔" اس نے جلدی سے آنچ بند کی۔ چاول ڈھک کے رکھے اور پھر فریج سے چند سبزیاں نکال کر سلاد بنانے لگی۔

"پھپھو نے چکن کا بھی کہا تھا۔ کیوں نہ ابالنے رکھ دوں۔" اس نے سوچتے ہوئے کیتلی میں اچھا خاصا پانی ڈالا اور پھر نمک اور مرغی ڈال کر چولہے پہ رکھ دی۔

"پھپھو کے آنے تک تو اچھی طرح گل جائے گی۔" باہر کھٹکا ہوا۔ اس نے تیزی سے پلیٹ میں چاول نکالے۔ اوپر سلاد سے اچھی طرح گارنش کر کے وہ باہر نکلنے لگی کہ سامنے کھڑے عافین کو دیکھ کر چونک گئی۔

"ارے واہ! تم نے بنا لیا کھانا۔" بہترین طریقے سے سجی پلیٹ دیکھ کر اس کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔

"مجھے آتا ہے کھانا بنانا۔" وہ ناراض ہو گئی۔

"حیرت ہے۔ ورنہ انکل نے تو مجھے تمہارے بارے میں کچھ اس طرح بریف کیا تھا کہ میں سمجھا، تمہیں بالکل بھی کوئی کام کرنا نہیں آتا۔" عافین نے پلیٹ اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے کہا۔

"بابا تو ہیں ہی ایسے، انہیں تو بس ہر کام ہی غلط لگتا ہے میرا۔ آپ دادی سے پوچھتے تب آپ کو پتا چلتا کہ میں کیا کیا کر سکتی ہوں؟" اداسی کا رنگ چھانے لگا تھا کہ پھر سے وہی ازلی پر اعتماد سی روشنی چہرے پہ بکھر گئی۔

"اوہ لیکن دادی سے بھی میری بات ہوئی تھی۔" اس نے شرارتی مسکراہٹ چھپائی۔

"سچ! کیا کہا انہوں نے؟" وہ چہکی۔

"انہوں نے واقعی تمہاری بہت تعریف کی۔ کہ عینا بہت اچھی ہے۔ بہت پیاری ہے۔ معصوم ہے لیکن۔" وہ نوالہ لینے لگا۔

"لیکن۔" عینا نے بے صبری سے اس کا ہاتھ روکا۔

"لیکن یہی کہ بس اسے کوئی کام کرنا نہیں آتا۔" عینا نے مسکراہٹ کے لیے کھلتے لب ایک دم سے بھینچ لیے تھے۔ عافین نے تیزی سے نوالہ منہ میں ڈالا تھا اور اگلے ہی لمحے کھانستے ہوئے ڈسٹ بن میں تھوک دیا۔

"کیا ہوا؟"

"چاول تو بہت سخت ہیں عینا۔"

"اچھا۔" وہ حیران ہوئی۔ "شاید امریکہ کے چاول ہیں اس لیے۔"

"یہ شان بے نیازی واللہ، واللہ۔" وہ بس دل میں ہی کہہ سکا۔ تبھی ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے پلیٹ رکھ کر باہر گیا۔ لوٹا تو ہاتھ میں ایک بڑا سا گفٹ پیک تھا۔

"ارے واہ! آپ کے کسی دوست نے گفٹ بھیجا ہے آپ کو۔" عینا چہک اٹھی۔

"نہیں تو میں نے ہی کچھ آرڈر کیا تھا۔" اس نے جواب دیتے ہوئے پیکٹ میں بند گرم گرم بوائلڈ چاول اور فرائی فش پلیٹس میں نکالیں، انہیں ٹیبل پہ رکھ کے وہ واپس پلٹا۔ "بابا کو بلا لاؤ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ کہہ کر اس کے بنائے ہوئے کھانے کی پلیٹ اٹھائے باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو بابا اور عینا کھانا شروع کرچکے تھے۔ وہ بابا کو سلام کرکے تیزی سے کچن کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے تیزی سے صبح والے اور وہ سارے برتن دھوئے جو کھانا بنانے کے دوران عینا استعمال کرچکی تھی۔ صرف پندرہ منٹ میں وہ ہر چیز چمکا کر کھانے کی میز پہ آچکا تھا۔ بابا کھانا کھا کر واپس جاچکے تھے۔

"واؤ عافی، فولڈ آستینوں میں تو آپ بالکل جیمز بانڈ لگتے ہیں۔" عینا نے کھانا کھاتے ہوئے اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہوں۔" مسکراتے ہوئے اس کے بائیں گال کا ڈمپل نمایاں ہوا تھا۔

"تب ہی تو اتنا اعتماد ہے آپ میں۔" عینا کو اس پہ

سکا کی جھیل پہ۔ جہاں روشنیوں میں وہ دیوتا سا شہزادہ اترتا ہے۔“

”تمہیں ان روشنیوں کی کیا ضرورت۔ تم نے تو شہزادے کو پہلی نظر میں تسخیر کرلیا ہے۔“ وہ بے اختیار کہہ گیا۔ عینا چونکی۔

”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب ہے کہ.... کہ۔“ وہ گڑبڑا گیا۔

”خیر اس بات کو چھوڑو تم کھانا پوری توجہ سے بنانا پلیز۔ اگر ہو سکا تو میں چکر لگالوں گا۔ اوکے۔“ ہاتھ ہلاتا وہ تیزی سے دھڑکتے دل کو سنبھالتا گاڑی کی طرف بھاگا تھا۔ حیران سی عینا اس کی باتوں کو سوچتی اندر چلی آئی۔ سامنے ہی برتن اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

”تھوڑا سا ٹی وی انجوائے کرلوں۔ پھر دھولیتی ہوں۔ ویسے بھی پھپھو تو تین بجے ہی آئیں گی۔“ مطمئن سی وہ ریموٹ لے کر ٹی وی کے سامنے پڑے صوفے پہ ڈھے گئی۔ نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

تیز چنگھاڑ نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہ حواس باختہ سی اٹھی اور اس آواز کو سوچنے لگی کہ وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ وہ گھنٹی کی آواز تھی۔ عینا تیزی سے دروازے کی طرف لپکی اس نے ہول سے دیکھا۔ سہروز انکل تھے۔ جلدی سے دروازہ کھولا۔

”ارے! ہمارے گھر تو پری اتری ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

”کیسے ہیں انکل؟“ وہ ان کا بریف کیس سنبھالتے ہوئے بولی۔

”میں بالکل ٹھیک۔ سوری، آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ اصل میں واشنگٹن ہوتا ہوں میں۔ جس دن آپ ادھر آئیں اس دن میں کسی میٹنگ میں بزی تھا۔ ورنہ میں خود آپ کو لے کر یہاں آتا۔ عافی نے تنگ تو نہیں کیا نا؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل نہیں انکل۔ عافی تو بے حد اچھے ہیں۔ انہوں نے میرا بہت خیال رکھا۔ اچھا آپ کے لیے چائے، کافی کچھ لاؤں؟“ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں نہیں بیٹا۔“ اس کی سانس بحال ہوئی۔

”تم ایسا کرو کھانا لگادو میرے لیے۔ ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ اس کی سٹی گم ہوئی۔

”اوہ... انکل وہ اصل میں...“

”کیا ہوا؟“ کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ واپس پلٹے۔

”پھپھو نے کہا تھا آج کھانا میں بناؤں مگر میری آنکھ لگ گئی۔“ وہ شرمندہ تھی۔

”اوہ، کوئی بات نہیں۔ تم آرام سے کچھ بنالو۔ میں ویسے بھی پہلے شاور لوں گا۔ پھر لیپ ٹاپ پہ کچھ آفس کا کام دیکھ لوں گا۔ جب تیار ہو جائے تو مجھے بلا لینا۔ اوکے۔“ انہوں نے پیار سے اس کا سر تھپکا اور اندر چلے گئے۔

کچن میں آکر اس نے ایک نظر شیلف پہ پڑے سامان پہ ڈالی۔ اور دوسری نظر ساتھ پڑی چٹ پر۔

”ابلے ہوئے چاول۔ چکن کری کے ساتھ اور ساتھ میں کیلے کا حلوہ۔“ اس نے مینو پڑھا۔

”لو میں نے تو سنا تھا، امریکہ میں لوگ زیادہ تر چائنیز ڈشز پسند کرتے ہیں۔ یہ تو ہمارے ملک والی ڈشز لگ رہی ہیں۔“ اسے مینو ہضم نہیں ہوا۔ وہ ترکیب پڑھنے لگی۔

”بیچاری لیلیٰ پھپھو۔ میرے خیال میں ان کو چائنیز بنانے کی ترکیب نہیں آتی۔ تب ہی اس قسم کی ڈش منتخب کی۔ ویسے آتی تو مجھے بھی نہیں مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ عقل تو استعمال کر ہی سکتی ہوں۔“ اس نے دماغ پہ زور ڈالا۔

”چائنیز لوگ زیادہ مرچ مسالا استعمال نہیں کرتے اور سبزیوں اور اناج کو زیادہ دیر تک فرائی اور بوائل بھی نہیں کرتے۔ بس۔“ اسے جیسے ترکیب آگئی۔

اس نے جلدی سے فرائی پین میں ہلکا سا آئل ڈالا

رشک آیا۔

”خیر ایک بات عینا۔ پلیز جو کام بھی امی تمہارے ذمہ لگائیں۔ وہ فوراً کرلیا کرو۔ اسے کسی اور وقت پہ نہ چھوڑا کرو۔ یہاں صفائی کی باقاعدہ چیکنگ ہوتی ہے۔ اور صفائی کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے یہاں ایشین ویسے بھی کافی بدنام رہے ہیں۔“ اس نے آرام سے عینا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ سرہلا گئی تھی۔

* * *

انکل اسے بے حد اچھی طرح سمجھتے تھے شاید۔ تب ہی وہ اس کا خیال رکھتے اور بہت محبت اور طریقے سے اسے کاموں میں حصہ لینے کی ترغیب دیتے۔ لیلیٰ ابھی تک تو اس کی کارکردگی سے مطمئن ہی تھیں اور یہ سب انکل اور عافین کی توجہ کی وجہ سے ہی تھا۔ عافین دفتر لیٹ جانے لگا تھا۔

”عینا۔ دیکھو ذرا میں اس طرف ڈسٹنگ کرتا ہوں۔ تم ذرا دھیان سے لاؤنج کی گلاس ونڈوز صاف کرلو۔“ وہ اسے طریقے سے کام میں مصروف کرلیتا اور اسے کام کرتا دیکھ کر وہ بھی خوشی خوشی اس کے ساتھ مصروف ہو جاتی۔ شام میں لیلیٰ خود اس سے کچھ نہ کچھ پکوانے لگی تھیں۔ وہ آسان ترین مینو منتخب کرتیں اور پھر اس کے ساتھ کھڑی ہو کر اسے بتاتیں اور وہ بناتی۔ لیکن اتنی توجہ کے باوجود بھی کوئی نہ کوئی غلطی اس سے ہو ہی جاتی پھر بھی انکل اور عافین اس کی کارکردگی سے مطمئن تھے۔ سوائے لیلیٰ کے۔ وہ اس سے بالکل مطمئن نہ تھیں۔

آج اس نے کھانا اکیلے تیار کیا تھا۔ بابا اور دادی سے خوب لمبی ویڈیو چیٹ بھی کی۔ ٹی وی میں اب اس کا دل نہ لگتا تھا۔ تب ہی وہ اٹھ کر کوئی نہ کوئی کام کرنے لگ جاتی۔ عافین کی توجہ نے اس کو کچھ نہ کچھ بدل ہی دیا تھا۔ اسے اپنے آپ پہ خود بھی حیرت ہوتی تھی۔

عافین آج بھی ماما سے پہلے گھر لوٹ آیا تھا اور آتے ہی اس نے کھانا چیک کیا۔ وہاں سے مطمئن ہو کر اس نے صفائی چیک کی۔ پھر کچھ صفائی خود بھی کی۔ عینا نے برتن آج بھی چھوڑ دیے تھے اس نے کچن صاف کیا۔ سبزی کے چھلکے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے اسے کچھ چمکتا دکھائی دیا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ یہ کانچ تھا۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

”عینا۔“ بے اختیار ہی وہ چلا اٹھا تھا۔ عینا بھاگتی ہوئی وہاں آئی تھی۔

”یہ گلاس۔“ وہ گلاس کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھامے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں گلاس ہی ہے۔“ وہ حیران ہوئی۔

”لیکن یہ تو ٹوٹا ہوا ہے۔“ عافین کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے۔

”ہاں تو ٹوٹ گیا نا۔“ عینا کو اس کی ذہنی حالت پہ شک ہونے لگا۔

”لیکن کیسے ٹوٹ گیا؟“

”اوہ تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے ٹوٹ گیا۔ جاننا چاہتے ہیں؟“ وہ سرہلاتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولی۔

”اصل میں، میں یہاں پہ چڑھ کر اوپر کے خانوں سے کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔“ وہ ایک طرف رکھے قدرے اونچے اسٹول پر چڑھ گئی۔ وہ اسے بس دیکھتا رہا۔

”تب ہی میری نظر ان دو گلاسوں پہ پڑ گئی۔ اللہ اتنا پیارا ڈیزائن۔ بس ان کے اوپر بنے ابھرے ابھرے سے پھول مجھے دیوانہ بنا گئے۔ میں نے فوراً ایک گلاس اچک لیا۔ ایسے۔“ اس نے دوسرا گلاس بھی اٹھا لیا تھا اور نیچے اتر آئی۔

”اور پھر مجھے پتا بھی نہ چلا اور گلاس اچانک چھوٹ کر زمین پہ۔“ یک دم گلاس اس کے ہاتھ سے پھسلا تھا۔ عافین تیزی سے اس کی طرف آیا مگر لاکھ کوشش کے باوجود گلاس کیچ کرنے میں ناکام رہا تھا۔ گلاس فرش پہ گر کر چکنا چور ہو چکا تھا۔

”بس یہی پوچھنا چاہ رہے تھے نا۔“ وہ یوں مطمئن کھڑی تھی جیسے اس نے کسی ڈرامے کا آڈیشن

دیا تھا اور رزلٹ میں وہ اوکے بھی ہو چکی تھی۔

"**عینا**! میں کیا کروں تمہارا یار' وہ امی کے جینز کے گلاس تھے۔ جو وہ صرف اپنی ویڈنگ اینی ورسری میں ہی نکالا کرتی تھیں۔ اف اب ایک نئی قیامت۔" وہ سر ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"اوہ۔ تو آپ یہ سب مجھے پہلے بتاتے نا۔" وہ روہانسی ہونے لگی۔

"اچھا اچھا پلیز' سوری۔" عافین نے فوراً اسے تسلی دی۔

"اب پلیز' امی کتنی بار بھی پوچھیں' صرف یہی جواب دینا کہ تم نے ایسے کوئی گلاس نہیں دیکھے۔" وہ اسے سمجھانے لگا۔

"مطلب جھوٹ بولوں؟" بڑی کالی آنکھیں مزید کھل گئیں۔

"ہاں کیوں کہ کبھی کبھی یہ بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔" اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ اور پھر واقعی لیلیٰ بے چاری ڈھونڈتی رہ گئیں مگر نہ گلاس ملے نہ کسی چور کی داڑھی میں تنکا۔ عافین نے ہاتھ کی صفائی ہی ایسی دکھائی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ علاقائی سطح پہ بیس بال کا جانا پہچانا نام تھا اور کئی بار اپنی ٹیم کو میچز جتوانے میں اہم کردار ادا کر چکا تھا۔ **عینا** کو جیسے ہی پتا چلا تھا کہ وہ شام کے وقت اسٹیڈیم جا کر پریکٹس کرتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگی تھی۔

"وہاں صرف لڑکے ہوتے ہیں۔ تم کیا کرو گی جا کر۔" لیلیٰ پھپھو کو اس کی یہ فرمائش بالکل بھی پسند نہ آئی۔

"لڑکے ہوں تو مجھے کیا پھپھو۔ میں تو پہلی مرتبہ بس اسٹیڈیم دیکھنا چاہتی ہوں۔

وہاں سیٹس (Seats) ریئل میں کیسی لگتی ہیں۔ پویلین کیسے ہوتے ہیں۔ کنٹری باکس سب۔" وہ بے حد ایکسائیٹڈ تھی۔

"تو اس میں ایسا کیا ہے روز میچز لگتے ہیں ٹی وی پر' دیکھ لیا کرو۔" اف یہ پھپھو کے مشورے۔ وہ تنگ آنے لگی تھی۔

"پھپھو میں نے سب کچھ لائیو دیکھنا ہے۔" وہ تقریباً "چیخی۔

"وہاں کوئی میچ نہیں ہو رہا۔ سنا نا کہ پریکٹس ہے بس۔" پھوپھو کہاں چپ ہونے والی تھیں۔ عافین البتہ مسلسل چپ تھا۔

"عافی پلیز۔" اس بار اس نے براہ راست عافین کو پکارا۔

"ہاں بیٹا۔ چلی جانا۔ اب امریکہ ہے' پاکستان تو ہے نہیں جو تم اسے یوں لڑکوں سے ڈرا رہی ہو۔" انکل نے اسے اجازت دے دی تھی۔ وہ اچھل پڑی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ مگر وہاں بس میرے ساتھ رہنا اوکے۔" عافین نے کچھ سوچتے ہوئے ہاں کی اور پھر دس پندرہ منٹوں کے اندر اندر وہ عافین کے ساتھ تھی اسٹیڈیم میں' اسٹیڈیم کافی بڑا نہ تھا۔ مگر پھر بھی وہ پہلی مرتبہ کسی اسٹیڈیم میں آئی تھی۔ تب ہی اس کا شوق دیدنی تھا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ کھلاڑیوں والا یونیفارم پہن کر اس کے سامنے تھا۔

"یہ کیا پہن رکھا ہے آپ نے۔" وہ تو حیران رہ گئی۔

"بیس بال میں ایسا ہی یونیفارم پہنا جاتا ہے۔" اسے **عینا** سے اسی ردعمل کی توقع تھی۔ تب ہی سارے جواب سوچ کر آیا تھا اور جواب سن کر وہ ہنستی چلی گئی۔

"اس میں تو آپ مجھے کوئی خلاباز لگ رہے ہیں۔" ہنستے ہوئے بمشکل بولی۔ وہ مسکرایا۔

"اب تم بیٹھو' میں پریکٹس کرلوں۔" وہ اسے کہہ کر فیلڈ میں چلا گیا۔

"اب میں صحیح سے اسٹیڈیم بھی نہیں دیکھ سکتی۔ ان لوگوں کی پریکٹس ختم ہو تب نا۔" اس نے کرسی پہ تقریباً "لیٹتے ہوئے آنکھیں موندلی تھیں۔

"**عینا**۔" اسٹیڈیم کی لائٹس آن ہو چکی تھیں۔ جب عافین نے اسے جگایا۔

"جی۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ عافین لباس تبدیل کر چکا تھا۔

"ختم ہو گئی پریکٹس؟" اس نے فوراً "پوچھا۔ عافین نے اثبات میں سر ہلایا۔

"چلیں پھر میں آپ کو بتاتی ہوں۔ دیکھیں عافی! پویلین سے باہر آتے وقت کم از کم یہ کیپ سر پہ نہ لیا کریں' آپ کے گھنے بال نظر آنے چاہئیں۔ سچ میں اپالو کی طرح ہینڈسم سا تاثر ابھرتا ہے۔ جب دھیرے دھیرے ہوا کے ساتھ آپ کے بال لہراتے ہیں۔" **عینا** شروع ہو چکی تھی اور عافین..... اختتام ڈھونڈ رہا تھا۔

"اور ذرا اکڑ کے اترا کریں۔ تاکہ یہ جو سیفٹی پارٹس ہیں آپ کے یونیفارم کے' جو آپ کو گول مول بنا دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے آپ کا ہرکولیس والا شاندار قد چھپا نہ رہ سکے۔"

"گھر چلیں؟" وہ پھر دیوتاؤں کو ڈھونڈنے لگی تھی۔

"ہاں بس ذرا میں ادھر ادھر بھاگ تو لوں۔ جیسے فلموں میں ہیروئینز بھاگتی ہیں۔" وہ اس سے کہہ کر گراؤنڈ میں بھاگ گئی۔ تب ہی اس کا سیل بجا۔ شہریار انکل کا نام جگمگا رہا تھا۔

"کیسا ہے میرا شیر۔ میری بیٹی زیادہ تنگ تو نہیں کر رہی؟" انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔

"نہیں نہیں انکل۔ ڈونٹ وری۔ زیادہ تنگ نہیں کر رہی۔" اس نے بمشکل مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "بلکہ بہت زیادہ تنگ کر رہی ہے۔" موبائل اور لبوں کے درمیان فاصلہ بڑھا کر دل کا بوجھ ہلکا کیا گیا۔

"ویسے تو بہت سمجھ دار ہے۔ بس کبھی میں نے اس کو کوئی کام نہیں کرنے دیا تو تب ہی۔ تم لیلیٰ آپا کے ساتھ مل کر اسے توجہ سے سکھاؤ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں۔ لیلیٰ آپا سے بھی زیادہ قابل ہو جائے گی گھر داری میں۔"

"میں اسے کیا سکھاؤں گا انکل؟ میں تو خود اس سے بہت کچھ سیکھ رہا ہوں۔ لگتا ہے میں نے پلے گروپ میں ایڈمیشن لیا ہے۔" بے بس لہجے میں کہتے ہوئے عافین بہروز نے ہمیشہ کی طرح ایک ہاتھ سائیڈ پاکٹ میں ڈال لیا تھا۔ **عینا** آگے بڑھ گئی تھی۔ اور وہ بس اسے ادھر سے ادھر بھاگتا دیکھ کر کھڑا رہنے کے لیے کوئی سہارا ڈھونڈنے لگا۔

"ہاہاہا۔" ان کا قہقہہ عافین کے کان کے پردے پھاڑنے ہی لگا تھا کہ اس نے سیل کانوں سے دور کرلیا۔

"بہت اچھا مذاق کرتے ہو یار۔ میری بیٹی بے حد خوش رہے گی۔ جیتے رہو۔" انہوں نے دعا دی اور کال ختم کردی۔ وہ دور خوشی سے جھومتی **عینا** کو دیکھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

عافین نے ضروری سودا سلف لینا تھا۔ اس نے **عینا** کو بھی شام میں تیار رہنے کا کہا تھا۔ اس نے ماریہ کی دی ہوئی ایک بلیک شرٹ نکالی' جس کے گلے اور دامن پہ پتلی سی پٹی کی شکل میں سفید نگ جگمگا رہے تھے۔ یہ شرٹ دن کی روشنی میں بھی بے حد جھلملا رہی تھی۔ رات کی روشنی میں مزید خوب صورت لگتی۔

"شاید میں آج روشنیوں کی جھیل الاسکا پہ بھی چلی جاؤں۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے وہی شرٹ نکال لی۔ ساتھ میں ہمیشہ کی طرح وہی میرون کلر کا اسکارف بھی رکھ دیا۔ جو وہ ہمیشہ اب باہر نکلتے وقت لینے لگی تھی۔

"میں آ رہی ہوں الاسکا کے دیوتا۔" وہ زیر لب گنگناتے ہوئے تیار ہوتی رہی۔ اس نے اپنے سنہری بال کھلے چھوڑے تھے۔ ویسے بھی اسکارف خود بخود بال سمیٹ لیتا تھا۔ اس نے لبوں پہ لپ اسٹک کا ہلکا سا ٹچ دیا اور بلیک اسٹریپ والی نازک سی چپل پہن کر باہر نکل آئی۔ سامنے ہی ٹیبل پہ بیٹھے چائے پیتے عافین نے حیرت سے اس کے اس نئے روپ کو دیکھا تھا۔

"ویسے عافین بیٹا۔ ایک بات تو ماننی پڑے گی۔ تمہارا نصیب خوب صورت بہت ہے۔" بابا نے اسے یوں یک ٹک **عینا** کو گھورتے دیکھا تو دھیرے سے

سرگوشی کی۔ وہ مسکرا دیا۔

"پھپھو۔ دیکھیں ٹھیک لگ رہی ہوں میں؟" ہر بات پہ وہ پھپھو سے ضرور رائے لیتی۔ پھپھو نے اس کی آواز پہ مڑ کر ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ اور پھر پوری کی پوری پلٹ آئیں۔

"تم باہر اتنا شوخ ڈریس پہن کر جاؤ گی؟" نہ جانے کیوں وہ بھی خوش نہیں ہوتی تھیں۔ عافین نے ایک پل میں عینا کا چہرہ اترتا دیکھا تھا۔

"اوکے آنٹی! میں بدل لیتی ہوں۔" عینا نے بحث کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

"نہیں عینا! ٹھیک ہے۔ دیر ہو جائے گی۔ چلو۔" وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"کیوں دیر ہو جائے گی۔ تم کیا کسی میٹنگ میں جا رہے ہو۔ جاؤ عینا کپڑے بدلو۔" انھوں نے صاف منع کر دیا۔

"جی امی! میٹنگ ہی ہے۔ تب ہی تو اتنی جلدی کر رہا ہوں۔ آپ جانتی ہیں میرے لیے وقت کتنا قیمتی ہے۔" جواب دے کر وہ مزید سننے کے لیے رکا نہیں تھا۔ تیزی سے باہر نکل گیا۔

"اچھا جاؤ۔" ناچار ان کو بھی اجازت دینی پڑی۔ وہ مرے مرے قدموں سے باہر نکل آئی۔ سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔ عافی اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولے کھڑا تھا۔ عینا کی اداسی اس نے بھی صاف محسوس کی۔ عینا کے بیٹھتے ہی وہ بھی آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"برف دیکھنے چلو گی؟" اس موڈ میں وہ اسے بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"نہیں! بس شاپنگ کر کے جلدی واپس لوٹیں گے۔" وہ واقعی اداس تھی۔

"سوچ لو! امریکہ کی برف دیکھنے کا چانس پھر ملے نہ ملے۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"اس موسم میں برف کہاں؟" وہ منہ بنا گئی۔

"جناب اپریل کے اوائل تک یہاں برف پڑتی رہتی ہے۔ جو پھر کتنے ہی عرصے تک سیاحوں کو لطف اندوز کرتی ہے۔ اس بار تو اس برف باری کا سلسلہ اپریل کے آخر تک رہا ہے۔" عافین نے موڑ مڑتے ہوئے لمبی سیدھی سڑک پہ گاڑی ڈالتے ہوئے کہا۔

"رئیلی؟ تب تو میں ضرور جاؤں گی۔" وہ جلدی سے سیدھی ہو کے بیٹھ گئی اور موبائل جو اسے عافین نے ہی دیا تھا۔ نکال کر تصویریں لینے لگی۔ عافین کو یک گونہ سکون ملا اسے یوں دوبارہ خوش دیکھ کر۔ صرف بیس منٹ کی رش ڈرائیونگ کے بعد ہی وہ لوگ اس علاقے میں پہنچے جہاں ہلکی ہلکی جمی برف ٹھیک ٹھاک ٹھنڈک پیدا کر رہی تھی۔ درخت سبز تھے اور سڑک کے دونوں طرف جمی برف میں سے سر نکالے کھڑے ننھے منے پودے پھولوں کا لباس پہن چکے تھے۔

"یہ ہے یہاں کا سب سے مقبول تفریحی علاقہ باؤنڈری واٹرز (Boundary waters)۔ کینیڈا کی سرحد کے بالکل ساتھ واقع ہے۔ اس نے ایک جگہ گاڑی روک دی تھی۔ عینا نے دیکھا مختلف جگہوں پہ بکھری فیملیز اور کہیں کہیں نوجوان لڑکے لڑکیوں کے گروپ مزے کرنے میں مصروف تھے۔ کوئی کھیل رہا تھا۔ کوئی فشنگ کر رہا تھا۔ تو کوئی اسکیٹنگ۔

"وہ سامنے جو جو لوگ اسکیٹنگ کر رہے ہیں۔ وہ دراصل منجمد جھیل ہے۔" عافین نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں اور اگر وہ اس میں گر گئے تو۔" اسے ڈر محسوس ہوا۔

"نہیں یار! کبھی ایسا ہوتا تو نہیں۔ پھر بھی یہاں سارا انتظام ہوتا ہے۔ ویلفیئر میں یہ لوگ بہت آگے ہیں۔" وہ مسکرایا۔ تب ہی ان کے بے حد قریب کتے بھونکے تھے۔ عینا ڈر کر فوراً عافین کے پیچھے چھپ گئی۔

"رائیڈ؟" وہ تین چار بڑے بڑے لمبے بالوں والے کتے تھے۔ ان کے خونخوار دانت جھلک دکھلا رہے تھے۔ زبان مسلسل منہ سے باہر تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ ان سے جڑی سلیج کے سامنے حصے پہ کھڑا وہ آدمی ان سے مخاطب تھا۔

"یس۔" عافین نے اسے جواب دیا۔

"آؤ عینا۔" اس نے اپنا ہاتھ عینا کی طرف بڑھایا۔ جو مزید پیچھے ہو گئی۔

"کم آن یار۔ میں ہوں نا۔" عافین کی مسکراہٹ پہ وہ حوصلہ کرتے ہوئے دھیرے دھیرے اس سلیج پہ چڑھ گئی۔

"Let's go۔" اس آدمی نے ہاتھ میں پکڑی چابک چلائی اور کتے دوڑنے لگے۔ سلیج برف پہ پھسلنے لگی۔ رفتہ رفتہ رفتار بڑھنے لگی تھی۔ وہ اونچائی کی طرف جا رہے تھے۔ عینا نے تیز ہوا سے اڑتے سکارف کو سختی سے جکڑ لیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مگر وہ زبردستی کھول کر ادھر ادھر اڑتی مٹی کے غبار کی مانند روئی کو دیکھتی۔ سرسبز درخت اور سفید روئی۔ کہیں کہیں بالکل شفاف پانیوں کی جھیل تو کہیں آدھی برف سے ڈھکی نیلگوں جھیلیں۔

"یہ سب کتنا خوب صورت ہے۔" وہ بے اختیار ہی بولی۔

"محبت کی طرح نا۔" وہ نہ جانے کب سے اس کے چہرے کے رنگ اپنی آنکھوں میں جذب کر رہا تھا۔

"شاید۔" وہ ویسے ہی کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"یقیناً۔" عافین نے دور گھنے درختوں کے نیچے دوڑتے قہقہے لگاتے لڑکے لڑکیوں کے گروپ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل محبت کی طرح فاتح دل، بس محبوب کے لیے دھڑکنا سکھا دینے والی۔ شکست شوق کہ نظر بھرتی ہی نہیں۔

وصل کی طرح کہ تو نہ ہو تو بھی آس پاس ہو۔" وہ بولتا گیا۔ نظریں مسلسل عینا کے چہرے کا طواف کرتی رہیں۔

"محبت تو دیوتاؤں کے چرنوں میں رہتی ہے۔" عینا نے جھک کر برف اچھالی۔

"دیوتا تو بناتی ہی محبت ہے۔" وہ کبھی کسی سے نہ ہارا تھا۔ اتنے اہم موڑ پہ اس کا ہار جانا پھر کیسے بنتا تھا۔

"پریم کی دیوی تو ان کی داسی ہوتی ہے۔" عینا نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"لیکن ہمیشہ اپنی وفا سے ان دیوتاؤں کو غلام بنایا ہے اس نے۔" وہ بھی اس کی آنکھوں میں اپنا عکس تلاشتے ہوئے بولا۔ بایاں ہاتھ سائیڈ پاکٹ میں ڈالے چہرے پہ مسکراہٹ سجائی۔ سلیج کے آگے بڑھتے اور تمام نظاروں کے پیچھے بھاگنے والے اس لمحے میں، برف کی زمین پہ نہ جانے کیوں وہ اسے کسی دیوتا کی طرح ہی لگا تھا۔

"آپ میں دیوتاؤں کی شباہت ہے۔ بلکہ آپ باتیں بھی ویسی ہی کرتے ہیں۔" عینا نے ہاتھ میں پکڑی برف اڑائی۔

"میں نے کہا تھا نا ابھی۔" وہ بولا تو مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی اور اس کے بائیں گال کا ڈمپل بھی۔

"کیا؟" سیاہ آنکھوں میں سوال در آیا۔

"یہی کہ محبت دیوتا بنا دیتی ہے۔ اور تم نے اس کی تصدیق بھی کر دی ہے۔" سلیج والا آدمی واپسی کے لیے کتے موڑ چکا تھا۔

"اس کا مطلب، آپ کو بھی محبت ہو گئی ہے۔" وہ چونکی۔

"نہیں۔ ابھی تو مجھے اس کی پہلی عنایت دان ہوئی ہے۔" نہ جانے کیوں وہ عینا کو کچھ اداس سا لگا۔

"اداسی۔" اس نے تکا لگایا۔

"چلو چلتے ہیں عینا۔ دیر ہو گئی۔ مارکیٹ بھی چلنا ہے۔" سلیج رک چکی تھی۔ وہ اس شخص کو کرایہ ادا کر کے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ عینا نے خاموشی سے اس کی تقلید کی تھی۔

* * *

اور پھر واقعی وہ شام اس کی زندگی کی حسین ترین شام بن گئی تھی۔ رولر کوسٹر پہ بیٹھ کر اسے لگا جیسے وہ موت کے پروں پہ سوار ہو۔ ایک دم سے اوپر سے نیچے آنا اور پھر نیچے سے اوپر جانا، کس قدر جان لیوا، لیکن بے حد مسرور سا احساس دے جاتا۔ نیچے جاتے ہی اندھیروں کا سفر تو اوپر آتے ہی دور دور تک پھیلی

روشنیاں اور قریبی جھیلوں میں ان جگمگاتی روشنیوں کے عکس، عجیب کچھ جادوئی سا تھا۔ کیوں تھا یہ وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ وہ مکمل طور پہ مضبوطی سے سیفٹی بیلٹ سے جکڑی ہوئی تھی۔ مگر اس کے باوجود بھی اس نے مضبوطی سے عافین کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ وہ پھر اوپر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"کوئی وش مانگو۔" عافین اس کے قریب ہو کر چلّایا تھا۔

"کاش کہ الاسکا کی روشنیوں میں کوئی اپالو جیسا مجھے خود اپنانے کو تیار ہو جائے۔" وہ فوراً چلّائی تھی۔

"عافی! آپ کی باری۔" اس نے عافین کو دیکھا۔ وہ بول اٹھا۔

"فرشتے افضل ہیں کہ انہیں عبادت دی گئی۔
انسان افضل ہیں کہ عبادت کے ساتھ ساتھ انہیں محبت بھی عطا کی گئی۔" وہ گنگنایا تھا۔ اس کی آواز، عینا حیرت سے اسے دیکھے گئی۔

"اے کاش کہ محبت مجھے دیوتا بنا دے۔ ناقابل شکست، ناقابل مرگ۔" اس نے بھی دعا مانگی۔ عینا مسکرا دی تھی۔ وہاں سے وہ اسے ایک کلب میں لے آیا تھا۔

"آپ نائٹ کلب میں جاتے ہیں؟" وہ واقعی ششدر تھی۔

"چند دوستوں سے ملنا ہے۔ ڈونٹ وری اچھے لوگ ہیں سب۔ کپلز ہی آتے ہیں اکثر یہاں۔" اس نے اس کی تسلی کرائی۔

"مگر۔" وہ مطمئن نہ ہوئی۔

"میں نے کہا نہ صرف میٹنگ یا دوستوں کے ساتھ آیا ہوں۔ ورنہ یہاں کپلز ہی آتے ہیں۔ بہترین کھانے اور ڈانس سے لطف اندوز ہونے۔" اس نے قدرے سائیڈ والی ٹیبل منتخب کر کے اسے وہاں بٹھا دیا اور خود دوستوں کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر میں ہی ویٹر اس کے سامنے اورنج جوس رکھ کر چلا گیا۔ اس نے تیزی سے گلاس اچک لیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد عافین کی واپسی ہوئی۔

"ہے، ڈانس کرو گے میرے ساتھ؟" ایک لڑکی نے راستے میں اسے روکا۔

"سوری۔ مجھے ڈانس نہیں آتا۔" اس نے شستہ انگلش میں آرام سے منع کر دیا۔

"آپ کو ڈانس نہیں آتا؟" وہ بیٹھا تو حیرت بھرا سوال آیا۔

"تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے تمہیں بہت آتا ہو۔" وہ ہنسا اور جوس کا گلاس اٹھا لیا۔

"ہاں، مجھے تو بہت زبردست آتا ہے۔ میں تو روز پریکٹس کرتی ہوں۔" عافین کو اچھو لگ گیا۔

"مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ آپ کو امریکہ میں رہتے ہوئے ڈانس نہیں آتا۔" وہ شریر ہوئی یوں جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔ وہ فوراً جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ عینا نے اسے اسی لڑکی کے پاس جاتے دیکھا تھا۔ جو ابھی کچھ دیر پہلے اسے آفر کر چکی تھی۔ اس نے اتنی دور سے بھی اس کی سبز آنکھوں میں تیرتی حیرت واضح دیکھ لی تھی اس نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ عافین کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ عافین نے ایک نظر عینا پہ ڈالی جو اس لڑکی کا ہاتھ تھام لینے پہ نہ جانے کیوں سلگ اٹھی تھی۔ اور پھر تیزی سے اس لڑکی کو اسی ایک ہاتھ پہ گھماتے فلور پر لے گیا۔ نہ جانے اس کی تیزی اور شخصیت میں کیا بات تھی کہ سب تھرکتے بدن اچانک ہی رک گئے تھے۔ وہ سب کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔ عینا بے بسی سے اسے دیکھے گئی۔

وہ ناچتے ہوئے کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ عینا اسے یک ٹک دیکھے گئی۔ اس نے صاف محسوس کیا کہ اس قدر نفاست سے اور احتیاط سے ڈانس کرنے کے باوجود اس کی تمام تر توجہ عینا کی طرف ہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غصہ تھا یا خفگی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیوں؟...

اب بائیں ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھامے وہ اسے ادھر ادھر گھما رہا تھا۔ اور پھر اچانک ہی عافین نے اسے زور سے جھٹکا دے کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ جھولتی جھولتی کافی دور جا کر رکی تھی۔ ہال ایک مرتبہ پھر ستائشی جملوں اور تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ لڑکی اب خوش ہو کر دوبارہ اس کے قریب ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ شاید سب لوگوں کو یہ امپریشن دینا چاہ رہی تھی کہ عافین اسی کے ساتھ ہے۔ عینا سلگ کے رہ گئی۔ عافین کا اجتناب اگرچہ واضح تھا۔

"یو آر امیزنگ بوائے" وہ برطانوی اولڈ کپل تھا۔ جو اب اس کی طرف آتے عافین کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

"Just like the minne sota Prince (بالکل نی سوٹا کے شہزادے ہو تم)" اس جوڑے نے اسے بے حد سراہا تھا اور عینا بس ایک لفظ میں کھو گئی تھی۔ منی سوٹا کا شہزادہ۔

وہ ان کا شکریہ ادا کرتا عینا کے قریب آیا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"گھر چلیں۔" اس نے جیسے حکم دیا۔

"کیوں اتنی جلدی؟" وہ خوش تھا کہ اسے چڑانے میں کامیاب رہا تھا۔

"میری مرضی۔" وہ تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بھاگ کر اس کے ہم قدم ہوا تھا۔

"ارے اتنا غصہ کیوں؟" اس نے جان بوجھ کر حیران ہونے کی ایکٹنگ کی۔

"غصہ کیوں۔ ابھی آپ یہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں؟" وہ باہر روشنیوں بھرے لان پہنچ چکے تھے۔

"ہاں، کیونکہ اچھا بھلا موڈ تھا تمہارا جب میں تمہیں چھوڑ کر ڈانس کرنے گیا۔" وہ رخ پھیر کر شرارتی مسکراہٹ چھپا گیا۔

"ڈانس کرنے گئے کیوں؟ وہ بھی اس چڑیل کے ساتھ۔" وہ واقعی سخت خفا تھی۔

"حیرت ہے۔ تم بھی تو کرتی ہو نا ڈانس۔ تمہیں بھی آتا ہے تو میں کیوں نہ کروں؟" وہ اب اپنا غصہ ظاہر کرنے لگا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ پوری کی پوری ایک ایڑی پہ گھومی تھی۔

"میرا کیا مطلب؟ تم نے خود ہی کہا تھا کہ تمہیں تو آتا ہے یہ ڈانس۔" وہ اسی کے لہجے میں بولا۔

"جی نہیں، مجھے واقعی آتا ہے مگر میں نے ہمیشہ اکیلے میں پریکٹس کی ہے۔ موویز دیکھ دیکھ کے۔ آپ نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا؟" اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔ وہ تیزی سے بھاگ کر اس طرف بڑھ گئی جہاں گاڑی پارک تھی۔

وہ کچھ حیران سا سائیڈ پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر سامان لینے چل دیا۔

* * *

"عینا! ادھر آؤ۔" کھانا بنا کر وہ بمشکل ذرا ستانے لیٹی تھی کہ پھپھو کی تیز آواز پہ فوراً کچن میں پہنچی۔

"جی پھپھو؟" اس نے آتے ہی پوچھا۔

"کتنی مرتبہ سمجھایا ہے تمہیں لڑکی کہ کھانا بناتے وقت اتنا گند نہ کیا کرو اور اگر کر بھی لیا کرو تو فوراً صاف کر دیا کرو۔" وہ پھر غصے میں تھیں۔

"کیا ہر وقت ہاتھ دھو کر بچی کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔" انکل سہروز بروقت آئے تھے۔

"بچی۔ یہ بچی ہے ابھی؟" اور عینا کو اپنا آپ واقعی آنٹی لگنے لگا تھا۔

"اس کی عمر میں میرا عافین دس سال کا تھا۔" اسے چکر آیا۔

"وہ دور اور تھا پھپھو! آج کل تو پہلے پڑھائی، پھر اچھی جاب۔" اس نے باپ کا سکھایا پہاڑہ دہرانا شروع ہی کیا تھا کہ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مزید بولنے سے منع کر دیا۔

"تربیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے بیٹا۔ مجھے دیکھو، کس طرح اپنے بچوں کی تربیت کی ہے۔ لیکن ایک تمہارا باپ اور تمہاری وہ مرحومہ نکھٹو ماں، ارے ایک بیٹی کیا پیدا کر لی جیسے مصر کی شہزادی کو جنم دے دیا۔ میں تو بچی تھی۔ تب ہی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ گئی تھی۔" اپنی میں میں کے دوران وہ دیکھ بھی نہ پائیں ان کی بھتیجی کی پلکوں کے بند توڑتے آنسو اس کے گالوں پہ بہنے لگے تھے۔

"کتنی بار کہا ہے لیلیٰ! ہر وقت میں کو یاد نہ رکھا کرو۔"

ورنہ ایک دن تمہاری یہ "میں" تمہیں تنہا کر دے گی۔" انکل فوراً" عینا کی طرف آئے تھے۔

"ہاں ہاں، بھی کرو سب اس ناکارہ کی طرف داری۔ ارے میں، میں کرتی ہوں تو اس قابل بنایا ہے خود کو۔ مکمل ثابت کیا ہے خود کو۔ کوئی ایک خامی تو بتا دو مجھے۔ گھر بار سب کس قدر سلیقے سے چلایا۔"

"اچھا بس۔ صرف گھر بار سلیقے سے چلانا کچھ نہیں ہوتا۔ رشتوں کو محبت اور توجہ دینی ہوتی ہے۔ سب کو اچھی تربیت دے دی۔ مانتا ہوں کہ واقعی تم ان چیزوں سے مکمل ہو۔ مگر کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اس پرفیکشن کے جنون میں تم کتنی اکیلی رہ گئی ہو۔" انھوں نے عینا کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی کہہ لیں، مگر میرا فیصلہ بالکل واضح ہے کہ یہ لڑکی میری بہو بننے کے بالکل بھی قابل نہیں، خدا کی پناہ جو ایک بھی ڈھنگ کا کام کرے۔" وہ تلخ لہجے میں کہہ کر باہر نکل گئیں۔ عینا ان کے لفظوں کو سوچتی رہ گئی۔

"سوری بیٹا۔" وہ مدھم آواز میں بولے۔

"اٹس اوکے انکل۔" وہ آنسو بہاتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

* * *

"یہ لڑکی بالکل بھی میری بہو بننے کے قابل نہیں ہے۔" نہ جانے کیا تھا ان لفظوں میں، بار بار اس کے کان کے پردے چیرتے اس کی روح تک کو گھائل کر جاتے۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں شل ہونے لگے تھے۔

"بابا سچ کہتے تھے۔ جلد یا دیر سے ہمیں پریکٹیکل ہو کر سوچنا ہی پڑتا ہے۔" وہ عصر کے وقت گھر سے نکلی تھی۔ اب شام اپنے پر پھیلانے لگی تھی۔

"مجھے تو سگی پھپھو اپنانے کا نہیں سوچ سکتیں، کوئی شہزادہ مجھے کیا چاہے گا۔" یہ عجیب سے رنگوں والے درختوں کے جھنڈ تھے۔ جنہیں وہ پار کر گئی۔

"ہم لڑکیاں بھی، آنکھیں بند کیے، دنیا کی ساری حقیقتوں سے پرے بس خوابوں میں جیتی ہیں۔ دنیا چاہے کتنی ہی آگے چلی جائے۔ ہم لڑکیاں شہزادے اور ریاست سے آگے نہیں جاتیں۔ خواب پلکوں پہ مچلتے ہی رہتے ہیں۔ ایک شہزادے کا ساتھ جو ہمارے لیے اور جس کے لیے ہم معنی رکھتی ہوں اور ایک چھوٹی سی ریاست جہاں صرف ہمارا راج ہو۔"

اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ یہ کسی آبادی کی شروعات تھی، سڑک کے دونوں کناروں پہ لگے بلب روشن ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں درختوں کے نیچے بینچ بھی پڑے تھے۔

اس کی ٹانگوں میں درد ہونے لگا تھا۔ سامنے چاکلیٹ شاپ تھی، وہ اس کے سامنے رکھے بینچ پہ بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو جھڑی کی صورت رواں تھے۔

* * *

عینا اس دن کے بعد سے کافی ناراض رہی تھی۔ اور عافین جانتا تھا کہ کس طرح اس کا موڈ بحال کیا جا سکتا تھا۔ تب ہی آج وہ شام سے پہلے ہی گھر لوٹ آیا تھا۔ اسے ہر حال میں الاسکا کی روشنیاں جلتے ہی عینا کو وہاں لے کر جانا تھا۔

گھر آ کر وہ فریش ہوا۔ خود چائے بنا کر پی اور باہر لاؤنج میں آ گیا۔ آج پہلی مرتبہ اس کا گھر آتے ہی عینا سے سامنا نہ ہوا تھا۔

"بابا۔" اس نے بہروز کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"آ جاؤ عافی۔" وہ مسکراتے ہوئے اندر آیا تھا۔

"مجھے امید تھی کہ آپ گھر پہ ہی ہوں گے۔" وہ ان کی اسٹڈی ٹیبل کے قریب رکھی ریوالونگ چیئر پہ بیٹھ گیا۔

"شاید نہ ہوتا۔ مجھے آج ایک ضروری میٹنگ کے سلسلے میں جانا تھا لیکن آپ کی امی نے سب گڑبڑ کر دی۔" وہ خفا تھے۔ ان کا لہجہ بتا رہا تھا۔

"اوہ۔ لگتا ہے امی نے پھر اپنی تعریفیں کر کے آپ کو ڈی گریڈ کیا ہے؟" وہ ان کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔

"افسوس کہ اس بار مجھے نہیں۔" وہ ذرا سے پیچھے کو ہوئے۔

"تو۔" وہ نا سمجھی سے بولا "عینا!" فوراً" ہی اسے خیال آیا تھا۔

"اس نے آج بے حد انسلٹ کر دی بچی کی۔ تب ہی مجھے اس کی دلجوئی کے لیے رکنا پڑا۔" ان کا لہجہ تاسف سے پر تھا۔

"او۔ تب ہی وہ آج میرے بھی سامنے نہیں آئی۔ مطلب کمرے میں بند ہے۔" وہ پریشان ہوا تھا۔

"میں دیکھتا ہوں اسے۔" وہ فوراً" مڑا تھا۔

"ہاں ضرور کیوں کہ یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔" ان کا لہجہ صاف تھا۔ عافین باہر نکل گیا۔

* * *

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ اس طرف زیادہ آبادی نہ تھی۔ نسبتاً" ویران علاقہ تھا۔ تب ہی اس کی آنکھوں سے مسلسل بہتے آنسوؤں نے کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کیا تھا۔ سفید بنچ پہ بلیک اوور کوٹ میں ملبوس وہ اس وقت اس نسبتاً" ٹھنڈی رات کا ہی حصہ لگ رہی تھی، نظریں دور کسی بلب کی جلتی بجھتی روشنی پہ جمی تھیں۔

"وہ میری ہے۔ صبح ازل سے اسے میرا کر دیا گیا، مگر پتا ہے مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ یہ ہے کہ وہ ابھی تک اس بات سے انجان ہے۔" عافین کی گمبھیر آواز نے اس کی دھڑکنیں اتھل پتھل کر دی تھیں۔ اس نے جھلملاتی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا تھا۔ مگر سڑک ویران تھی۔ اس نے پیچھے چاکلیٹ شاپ کی گلاس ونڈو سے جھانکا۔ وہاں صرف سیلزمین بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ وہی آواز دوبارہ آنے لگی تھی۔ اس بار اس نے پوری توجہ سے آواز سنی تھی اور "اور پھر فوراً" سمجھتے ہوئے جلدی سے اوور کوٹ کی جیب سے موبائل نکال لیا تھا۔ جو اسے عافین نے ہی دیا تھا۔ اور جس کو ابھی تک اس نے صرف کال ملانے (Out going) کے لیے ہی استعمال کیا تھا۔ تبھی شاید عافین کی انگلش میں کہی گئی یہ نظم وہ پہلی مرتبہ سن پا رہی تھی، فون خاموش ہو چکا تھا۔ وہ یونہی آنسو بہاتی اسکرین کو تکتی رہی۔ جس کی کالی چمکدار سطح میں سٹریٹ لائٹ جھلملا رہی تھی۔

"وہ میری ہے۔" فون دوبارہ بج اٹھا۔ اس بار اس نے قطعی دیر نہ کی تھی، عیشا آپی کی طرف سے آنے والی ویڈیو کال اس نے فوراً" اوکے کر دی تھی۔

"کیسی ہو عینا۔" اس کا چہرہ نظر آتے ہی عیشا آپی چہکی تھیں۔ اور وہ مزید منہ بسور کر رونے لگی تھی۔ تبھی

"عینا کیا ہوا؟" عیشا پریشان ہو گئی اور تبھی اس نے عیشا کے پیچھے دو اور پریشان چہروں کو ابھرتے دیکھا تھا۔ بابا اور دادی اور وہ مزید رونے لگ گئی۔ شہریار خان نے فوراً" عیشا سے سیل جھپٹ لیا تھا۔

"عینا کیا ہوا؟" وہ بے طرح پریشان تھے۔

"آر یو اوکے؟" اسے اس طرح روتے دیکھ کر ایک گارڈ نما آدمی بھی اس کی طرف آیا تھا۔ آواز اس قدر اونچی تھی کہ بابا بھی صاف سن سکتے تھے۔

"یہ کون ہے؟" نامانوس اجنبی آواز ان کو مزید ہراساں کر گئی۔

"یہ ٹائم باہر گھومنے کا نہیں، اس وقت جنگلی درندے بھی ادھر کا رخ کر لیتے ہیں۔ آپ پلیز گھر جائیں۔" وہ انگلش میں بتا رہا تھا۔

"عینا! تم اس وقت باہر ہو، وہ بھی اکیلی؟" ان کا دل جیسے بند ہونے لگا تھا۔

"ڈونٹ وری۔ میں ابھی گھر جاتی ہوں کچھ دیر میں۔" اس نے پہلے اس آدمی کو جواب دیا۔ وہ سر ہلا کر دور چلا گیا۔

"بابا۔" اس کی پلکیں پھر بھیگنے لگیں۔

"عینا! کیا ہوا ہے؟ پلیز مجھے بتاؤ۔" انھوں نے بری طرح اپنا سینہ مسلا تھا۔

* * *

عینا کمرے میں نہیں تھی۔ اس نے آس پاس کے دو تین مسلم گھرانوں میں پتا کیا جہاں ان کا آنا جانا تھا۔

مگر انہوں نے بھی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا تھا اور عافین بہروز کی جیسے جان پہ بن آئی تھی۔

"حد ہوتی ہے ایک بات کی امی۔" لیلیٰ بی بی کے گھر آتے ہی وہ خود پہ کنٹرول نہ رکھ پایا۔ لیکن آگے سے ان کی لاپروائی اسے مزید چڑا گئی تھی۔

"میں نے بھی بس یہی بات ہی کی تھی کہ حد ہوتی ہے لاپروائی اور کاہلی کی۔" وہ یوں آرام سے اپنے کام میں مصروف تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"امی آپ کو مسئلہ کیا ہے؟" وہ بے بس ہوا تھا۔

"میرا مسئلہ بہت سادہ ہے۔ جس طرح میں اور میری بیٹیاں مکمل ہیں۔ میری بہو بھی ویسی ہی مکمل ہو۔" انہوں نے فرائی پین میں تیل کی تہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"چلیں بہو نہ سہی۔ وہ آپ کی سگی بھتیجی ہے۔ پھر مہمان ہے، صرف اتنا لحاظ کر لیتیں آپ۔" نہ جانے کیوں اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ رات ہونے لگی تھی۔ نہ جانے عینا کہاں تھی۔ اس کا فون بھی بزی جا رہا تھا۔

"مجھ سے ایسے کاہل لوگوں کے ناز نخرے نہیں اٹھائے جاتے۔ تم اور تمہارے باپ کو ہی یہ تپ چڑھا ہوا ہے۔ میں تو بچی تھی جب شادی ہوئی تھی۔ پھر بھی میں نے کس قدر سلیقے سے سب کو سنبھال لیا۔" وہ اب سبزیاں فرائی کر رہی تھیں۔

"کچھ خدا کا خوف کرو لیلیٰ۔ اس "میں" سے باہر نکلو۔ مکمل صرف اللہ کی ذات ہے۔ رشتے تو دور ہو ہی جائیں گے۔ خدا کو بھی ناراض کر دو گی۔" بہروز نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیا۔

"میں کچھ ہوں تب ہی اتنے فخر سے کہتی ہوں، میری پوری لائف، میری بچیاں، کامیاب زندگی، کیا چیز ہے جو میں نہیں کر سکتی۔" انہوں نے غصے میں کہتے ہوئے برنر آف کیا تھا۔

"ہر چیز مانتا ہوں، مگر کیا تم نے کبھی یہ بھی غور کیا ہے کہ تم اس سب کے باوجود کس قدر اکیلی ہو۔" بہروز ان کے قریب آتے ہوئے بولے۔

"اماں جی تم سے بات کریں۔ تم ترس جاتی ہو۔ میں دوسرے شہر میں زیادہ خوش رہتا ہوں کہ نہ مجھ سے کوئی غلطی ہو گی نہ تمہارا "مکان" گندا ہو گا۔" انہوں نے "مکان" کے لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"تمہارا بیٹا، یہ شہزادہ۔" انہوں نے مسلسل موبائل پہ کسی کا نمبر ڈائل کرتے عافین کی طرف اشارہ کیا۔

"اسی شہر میں رہتے ہوئے دوستوں کو ہوٹل میں دعوت دے دیتا ہے۔ گھر نہیں بلاتا کہ کہیں ان کی بھی کوئی حرکت تمہیں بری لگے اور وہ دوبارہ ان کے ساتھ رابطہ رکھنے میں بھی شرم محسوس کرے۔ تمہاری دونوں بیٹیاں سسرال کے گھر میں اس قدر پرسکون ہوئیں کہ انہیں تمہیں فون کرنا یاد ہی نہیں رہتا کہاں تک سنیں وہ تمہاری پرفیکشن اور اپنے نقائص۔ آج وہ بولنے پہ آئے تو بولتے چلے گئے۔ اور لیلیٰ، وہ تو کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہی تھیں۔ کسی نے جیسے ان کے سامنے کھڑے آئینے سے پردہ کھینچ لیا تھا اور ان کا وجود بہت واضح دکھنے لگا تھا۔

"خدا کے لیے سنبھل جاؤ ورنہ کچھ بھی تمہارے پاس نہ رہے گا سوائے تمہاری "میں" کے۔" وہ چلے گئے تھے۔ عافین نے جھنجلا کر فون جیب میں ڈال لیا تھا۔

"اس بالکل اجنبی شہر میں اس کے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے آپ سوچ بھی نہیں سکتیں امی۔" وہ پریشان ساماں کے قریب ہوا۔

"بہو صرف گھر کے کام کرے اپنی جان ہلکان کرے تب مکمل عورت نہیں بنتی امی۔ بلکہ اس کی توجہ اور سب گھر والوں کی دل جوئی ایک عورت کو مکمل کرتی ہے امی! شادی کا مطلب یہ کب ہے کہ ہم کوئی زر خرید لونڈی لا رہے ہیں کہ جسے بس گھر کا کام کرنا آتا ہو۔ صفائی کرنا، کھانا پکانا، کپڑے دھونا۔ یہ سب عورت خود سیکھ جاتی ہے۔ وقت سکھا دیتا ہے۔ ذمہ داریاں سکھا دیتی ہیں اور سب سے بڑھ کر عورت کی فطرت، کبھی نہ کبھی اسے اپنے اصل کی طرف لوٹنا ہی ہوتا ہے امی تب ہی وہ مکمل ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے ہی ان گھر کے سارے کاموں اور ذمہ داریوں کو ہی اصل مقصد جان لیا اسے کب مکمل رہنے دیتا ہے۔ اور سچ کہوں تو آپ بھی کب مکمل ہیں۔ مکمل ہوتیں تو عینا کو سب سے پہلے آپ سمجھتیں۔ آپ کی اپنی بیٹیاں اعتماد سے اپنے مسائل اپنی ساس کی طرح آپ سے بھی شیئر کر پاتیں۔ لیکن۔۔۔" وہ ذرا دیر کو رکا۔

"یقین مانیں امی! "میں" لوگوں سے ہی نہیں اللہ سے بھی دور کر دیتی ہے۔ ایک دفعہ اس "میں" کا خول اتار دیں، سب کی خوبیاں آپ پہ اجاگر ہونے لگیں گی۔" کہہ کر وہ رکا نہیں پھر سے موبائل پہ نمبر ملاتا باہر نکل گیا۔ انہوں نے دیوار کا سہارا لیا تھا۔

* * *

"عینا! بولو بیٹا پلیز۔ میرا دل پھٹ جائے گا۔" بابا مسلسل اپنا سینہ مسل رہے تھے۔

"ام نے بولا تھا۔ نہ بھیجو اس کو وہاں۔ مگر نہیں۔ اب سکھاؤ سارے کام۔" دادی رونے لگی تھیں۔ عینا کی آنکھیں مزید بھیگنے لگیں۔

"بابا! پھپھو نے بولا، میں ناکارہ ہوں۔ میری امی کی طرح بابا۔" وہ بولنے لگی تھی۔ بابا، دادی، ہما سب کی نظریں اس پہ جمی تھیں۔

"بابا! میں نے آپ کا سر جھکا دیا۔ میں نے بہت کوشش کی۔ فیس بک، ٹوئیٹر، سب سرگرمیاں چھوڑ کر بھی میں پھپھو جیسی نہ بن سکی۔ مگر بابا! میں واقعی ان کے جیسی نہیں بننا چاہتی۔ وہ سوائے خود کے اور کسی کو برداشت نہیں کر سکتیں بابا!" وہ رو رہی تھی۔

"ام نے کہا تھا نا۔ لیلیٰ ایسی ہی ہے۔ تم کو بڑا شوق تھا نہ شہری۔ اب ناچو۔" دادی نے ساتھ بیٹھے شہریار خان کے کندھے پہ غصے سے زور کی چٹکی کاٹی۔ وہ "سی" کر کے رہ گئے۔

"انہوں نے کہا بابا! میں ان کی بہو بننے کے قابل نہیں ہوں۔ تو اس کا مطلب یہی ہوا نا بابا کہ آپ کا خواب کبھی تعبیر نہ پا سکے گا۔ آپ کی شہزادی کی زندگی میں کوئی شہزادہ نہیں آنے والا ہے۔" وہ بے حد دکھی تھی۔

"میں نے آپ کو پھر ہرٹ کر دیا بابا۔ میں آپ سب کو فیس نہیں کر سکتی۔ میں چاہتی ہوں میں کھو جاؤں۔ ان دھند والے بڑے میدانوں یا برف اور پانیوں سے ڈھکے پہاڑوں میں۔ تاکہ آپ کو پھر میری وجہ سے اور کوئی شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔"

"عینا! تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔ ابھی کے ابھی عافین کے پاس جاؤ گی۔" بابا نے لہجہ سخت کیا۔

"میں ان راستوں سے انجان ہوں بابا۔ میں کھونے لگی ہوں۔ کیونکہ واقعی میں کھونا چاہتی ہوں۔" اس نے سختی سے اپنے گالوں کو رگڑ کر آنسو صاف کیے۔ دھند پھیلنے لگی تھی۔ تب ہی شاید سگنل کمزور پڑے تھے۔ کال ختم ہو گئی تھی۔ اس نے موبائل جیب میں ڈال لیا اور بینچ کی پشت سے سر ٹکا گئی۔ نظر دور اسٹریٹ لائٹ کے نیچے اونگھتے گارڈ پہ پڑی تو نہ جانے کیوں خوف سے کانپتے دل کو قرار سا آیا۔ تب ہی اس کا سیل دوبارہ بجنے لگا۔ عافین کی وہی دھیمی اور گمبھیر آواز۔

"وہ میری ہے۔" اس نے نہ جانے کیوں فوراً ہی کال پک کی تھی۔

"عینا! تم پاگل ہو۔ کہاں ہو تم۔ تم ایسا کیسے کر سکتی ہو یار، کم از کم میرے ہوتے ہوئے۔ میرا انتظار تو کر لیتیں تم۔" وہ کس قدر بے بس تھا۔ پریشان تھا وہ با آسانی سمجھ سکتی تھی۔

"نہیں عافی! میں اب کسی کو بھی پریشان یا اپنی وجہ سے شرمندہ نہیں دیکھ سکتی۔ آپ بھی تو انسان ہیں۔ کب تک میرے لوہے کی نسل کے چاول تبدیل کرتے۔ میرے ہاتھ کا بنا پیزا خود مزے لے کر کھاتے اور پھپھو اور انکل کو آرڈرڈ پیزا کھلواتے۔ اور کب تک میرے لیے گھر کی صفائی اور دھلے ہوئے کپڑے دوبارہ دھوتے۔" وہ سسکتے ہوئے بولی۔

"کمال ہے یار۔ میں کر کر کے نہیں تھکا اور تم کرا کرا کر تھکنے لگیں۔ اندازے لگانے لگ گئیں۔ میں کبھی نہ تھکتا کیونکہ مجھے پریکٹس ہے اور جب تمہیں بھی پریکٹس ہو جاتی۔ تو تم بھی کبھی نہ تھکتیں۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

"عافین کتنے اچھے ہیں۔" اس کے دل نے گواہی دی۔

"اچھا تم ہو کہاں؟" وہ اب اصل بات کی طرف آیا تھا۔

"میں نے کہا نا۔ میں کسی کو نہیں ملنا چاہتی۔ کھو جانا چاہتی ہوں۔" وہ رو دی تھی۔

"یار پلیز۔ جگہ بتاؤ اپنی۔ میں آج الاسکا کا پروگرام بنا کر آیا تھا۔ تم نے سب ملیا میٹ کر دیا۔" الاسکا کے نام پہ وہ چونکی۔ دل پھرنے لگا۔

"لوکیشن بتاؤ پلیز۔"

"میں نہیں جانتی۔ بس یہاں میرے پیچھے ایک چاکلیٹ کی دکان ہے اور سامنے ایک سفید چرچ ہے۔" وہ بتانے لگی۔

"یہاں تو ہر دوسری گلی میں کچھ ایسا ہی ہے۔ کچھ اسپیشل بتاؤ۔" وہ بولا۔

"اور تو کچھ بھی نہیں ہے ہاں 'اسٹریٹ لائٹس بھی ہیں۔" ایک دم ہی وہ پر امید ہوئی تھی۔

"پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ اور عینا سے وہ یہی امید کر سکتا تھا۔

"اچھا چاکلیٹ کی دکان کا نام بتاؤ۔" عافین نے سوچ کے پوچھا۔

"Do or Die"۔" اس نے فوراً" جواب دیا۔

"Yes" "تم وہیں رکنا۔ میں ابھی آیا۔" بہت ہی مطمئن مسکراہٹ اس کے لبوں پہ چمکی۔ وہ سیل بند کرنے لگا تھا کہ تب ہی دوسری طرف عینا کی ہراساں آواز سنائی دی۔ "آدم خور حبشی۔"

"واٹ۔ کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"عافی۔ ٹارزن کی کہانیوں والے وہ آدم خور حبشی، دیو قامت اور بے حد کالے۔" وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ عافین نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی۔

"تم ڈرنا نہیں او کے 'اور فون بند نہ کرنا۔ میں جلد سے جلد آ رہا ہوں تمہارے پاس۔" اس نے ایئرفون کان میں اڑسے اور سیل جیب میں ڈال لیا۔ وہ اب بے حد رش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

"اوہ واؤ۔" تب ہی اس نے کسی کی چہکتی آواز سنی تھی۔ لہجے سے وہ صاف سمجھ سکتا تھا کہ وہ حبشی تھے۔ (وہ افریقی باشندے جو بھوک افلاس سے تنگ آ کر امریکہ کے دور دراز دیہاتوں میں بنائی گئی فیکٹریوں اور کھیتوں میں بطور مزدور کام کرتے ہیں) اس نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی تھی۔

"واٹ آ لولی ایوننگ اینڈ آ سویٹ کیوٹ باربی۔" (کیا شام ہے اور اتنی ہی پیاری میٹھی سی گڑیا) جس کے لہجے سے ہی خباثت ٹپک رہی تھی۔

"So its a game time"۔ (تو یہ مزہ کرنے کا وقت ہے) پہلے والا بولا تھا۔

"Yes after a very hard day" (بالکل! ایک سخت دن کے بعد) دوسرے نے دانت نکالے تھے۔ مطلب وہ تعداد میں دو تھے۔ عافین کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ عینا خاموش بیٹھی تھی۔ وہ شاید سکتے میں ہی ہو گی۔ اس جیسی نازک سی لڑکی کے لیے وہ واقعی آدم خور حبشی بن سکتے تھے، عافین کو اچھی طرح اندازہ تھا۔ تب ہی اس نے بالکل آخری حد تک اسپیڈ بڑھا دی تھی۔ پھر چاہے پتلی سڑک آئی یا پھولوں کی بیلوں سے ڈھکا کچا پل۔ وہ موت کی سی تیزی سے اڑتا چلا گیا۔

* * *

وہ آدم خور حبشی اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ پیلے دانت دکھائے، بڑی بڑی ناک پھلاتے اس نے بابا کی بات نہ مانی تھی۔ اگر پہلے ہی وہ کسی کی مدد لے کر گھر چلی گئی ہوتی تو اس وقت اس طرح کے درندوں سے اس کا واسطہ نہ پڑتا۔ اس نے دل ہی دل میں آیات کریمہ کا ورد شروع کیا۔ وہ دونوں کسی اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے۔ ایک بالکل اس کے قریب یوں ہاتھ پھیلائے بیٹھ گیا جیسے وہ اسی کے ساتھ تھے۔ تب ہی اس نے وہاں سے ایک پولیس کی گاڑی گزرتی دیکھی۔ جس کی رفتار بے حد دھیمی تھی۔ وہ گارڈ جو ابھی تک اونگھ رہا تھا بیدار ہو کر آگے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اسے لگا یہی موقع تھا۔ غیب سے مدد آئی تھی اور اس نے پوری قوت سے چلانا چاہا۔

"Do not look at them" (ان کی طرف مت دیکھو)۔

ایک حبشی کی آواز پہ وہ چونکی۔ وہ شاید دوسرے ساتھی کو ہدایت دے رہا تھا۔ جو ذرا سا ہراساں ہو کر رک جانے والی پولیس کی گاڑی کو دیکھ رہا تھا اور دھیرے سے عینا کو کندھے سے لگایا تھا۔

اسی حبشی نے دانت نکال کر کھڑکی سے باہر جھانکتے اس پولیس والے کو جیسے مطمئن کرنا چاہا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ پولیس والا سر اندر کرتا۔ عینا نے پوری ہمت جمع کر کے عافین کو پکارا تھا۔ نہ جانے کیوں یہی لفظ اس کے لبوں سے نکل پایا تھا۔ اندر جاتے سر نے اس کی اس قدر تیز پکار پہ حیرت سے سر پورا باہر نکال کر دیکھا تھا، ساتھ بیٹھے حبشی نے فوراً" اس کا منہ بند کرنا چاہا۔ مگر وہ چلا اٹھی تھی۔

"ہیلپ پلیز ہیلپ" کالے بھدے کھردرے ہاتھوں نے اس کے نازک لب بری طرح جکڑے تھے۔ مگر اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ پولیس وین واپس پلٹی تھی۔ اور پیچھے بیٹھے دونوں سپاہی باہر جمپ لگا چکے تھے۔ دونوں سیاہ فام تیزی سے عینا کو وہیں چھوڑ کر فٹ پاتھ پہ بھاگنے لگے۔ مگر اتنی دیر میں اسٹریٹ گارڈن تک پہنچ چکا تھا۔ پیچھے دوڑتے چاروں پولیس مین بھی قریب آ چکے تھے۔ مجبوراً" ہاتھ اوپر کرتے ہوئے ان دونوں کو رک جانا پڑا تھا۔

"آر یو اوکے؟ (آپ ٹھیک تو ہیں)" ایک ادھیڑ عمر آفیسر عینا کے قریب آیا۔ وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ بس یک ٹک اسے گھورے گئی۔ تب ہی خاموش ماحول میں کسی گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے۔ سب نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ اور بھاگ کر اپنی طرف آتے عافین کو دیکھ کر عینا میں جیسے جان سی دوڑ گئی تھی۔ وہ بھاگ کر اس کے بازو سے لپٹ گئی۔ عافین نے نرمی سے اسے خود سے لگا کر جیسے اسے محفوظ ترین پناہ بخشی تھی۔

"تھینک یو سو مچ سر!" اس نے اسی آفیسر کو مخاطب کیا۔

"آپ جانتے ہیں کہ یہ علاقہ ویسے بھی رات کے وقت یوں باہر نکلنے کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ آئندہ خیال رکھیے گا۔" آفیسر نے دوستانہ لہجے میں اسے ہدایت دی وہ سر ہلا گیا۔ وہ بکتے جھکتے دونوں سیاہ فاموں کو لے کر گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

عینا رونے لگی تھی۔ عافین نے اسے تھپکتے ہوئے بائیں ہاتھ سے اپنا سیل فون نکالا اور شہریار انکل کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"عافی بیٹا!" انہوں نے پہلی ہی بیل پہ کال پک کی تھی۔

"عینا میرے ساتھ ہے انکل۔" اس نے خود کو مکمل طور پہ مطمئن ظاہر کیا۔

"وہ ٹھیک تو ہے۔" وہ پریشان تھے۔

"جی ہم ابھی الاسکا کی سیر کرنے جا رہے ہیں۔ خوشی کے مارے پاگل ہو رہی ہے۔" اس نے خود سے لگی عینا کو دیکھتے ہوئے جان بوجھ کر الاسکا کا نام لیا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق عینا فوراً" چونکی تھی اور عافین کو یوں خود کو دیکھتا پا کر دھیرے سے اس سے الگ ہوئی تھی۔ وہ اس کے اس گریز پہ مسکرا دیا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ چلو تم لوگ انجوائے کرو۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو عافین نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا اور بابا کا نمبر ڈائل کر کے انہیں بھی خیریت کی اطلاع دے کر فون واپس جیب میں ڈال لیا۔

* * *

فون کی مسلسل بجتی گھنٹی نے برتن صاف کرتی لیلیٰ بہروز کو اچھا خاصا تپا دیا تھا۔

"لیلیٰ آپا۔" دوسری طرف شہریار کی آواز سن کر ان کا بگڑا موڈ مزید آف ہوا تھا۔

"اوہ! تو پاکستان تک چغلیاں پہنچ گئیں۔" وہ طنزیہ

لہجے میں بولیں اور شہریار خان۔۔۔ کچھ لمحوں تک تو وہ کچھ بول ہی نہ پائے۔

"**عینا** رات کے اس وقت وہاں انجان دیس میں گھر سے باہر ہے وہ بھی اکیلی اور آپ یوں مطمئن بیٹھی ہیں۔" ان کے بیزار، سرد سے لہجے نے واقعی انہیں بے حد ہرٹ کیا تھا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ عینا اب کوئی چھوٹی بچی نہیں ہے۔ جسے یہ پتا نہیں کہ اس وقت اس طرح اس انجان دیس میں اسے اکیلے جانا چاہیے کہ نہیں۔ بات صرف یہی ہے کہ اسے ذمہ داریوں کا احساس ہے نہ ہوگا۔ وہ ایسے ہی سب کے لیے وبالِ جان بنتی رہے گی۔" وہ بولے جارہی تھیں۔ اور شہریار خان کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ان کی بہن، عینا کی سگی پھوپھو اس قدر لاپرواہ بھی ہوسکتی ہے اس کے معاملے میں، وہ اپنے فیصلے پہ صحیح معنوں میں پچھتائے تھے۔

"بہت افسوس کی بات ہے لیلیٰ، لیکن آپ کی باتوں نے آج مجھ پہ ایک چیز تو واضح کردی۔ ایک ماں کی بیٹی کسی اور ماں کی بیٹی بھی نہیں بن سکتی۔ اور خاص کر اس ماں کی تو کبھی نہیں جو اس کی ساس ہو۔" وہ تلخ لہجے میں بولے۔ لیلیٰ لب کچلنے لگیں۔

"بیٹیاں صرف اپنے باپ کی ہی شہزادی ہوتی ہیں۔ آگے جاکر تو بس ایک کنیز بن جاتی ہیں۔ گھر کے کام کاج کے لیے لائی جانے والی بجی سنوری کنیز۔" ان کے لہجے میں غصہ تھا۔

"تم اب مجھ سے بدتمیزی کروگے۔ اس بالشت بھر کی لڑکی کے لیے۔" انہوں نے غصے سے شہریار خان کو ٹوکا تھا۔

"آپ کے لیے وہ بالشت بھر کی لڑکی سہی۔ مگر میرے لیے میری بیٹی، میری شہزادی ہے۔ آج میری سمجھ میں آیا کہ ہیشا اور **عیشا**، **عینا** کے آپ کے ہاں آنے پہ کیوں پریشان تھیں۔ اماں کیوں ہول کھا رہی تھیں۔ ارے آپ کی اس کاملیت کے چکر نے آپ کو اندر تک سے خالی کردیا ہے آپا۔ سگی بیٹیاں، سگی ماں آپ سے فاصلے پہ رہ کر زیادہ پرسکون رہتی ہیں اور آپ بات کرتی ہیں عینا کی۔ اسے تو صرف گھر کے کام نہیں کرنا آتے لیکن دل جیتنا تو میری **عینا** کا ہنر ہے۔ اسے دلوں کو جوڑنا آتا ہے۔ کاش کاش میں نے اسے آپ کے گھر بھیجنے کی غلطی نہ کی ہوتی۔ میں نے عینا کو بس اس لیے آپ کے پاس بھیجا تھا تاکہ وہ آپ جیسی بن سکے۔ مگر پتا ہے ابھی اس نے مجھے کیا کہا؟" ان کی آواز میں تاسف تھا۔

"اس نے کہا، مجھے پھپھو جیسا نہیں بننا بابا! ان کو اپنے سوا کوئی اور دکھائی ہی نہیں دیتا۔" وہ بولتے گئے۔ "مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنی اکلوتی اولاد کو ہر رشتے سے نالاں محض "میں" کی پوجا کرنے والی بہن کے گھر بیاہ دوں۔" وہ تو گویا سب رشتے ختم کرنے لگے تھے۔ لیلیٰ بے دم سی ہوکر صوفے پہ گر سی گئیں۔

"میں نے عافین سے کہہ دیا ہے۔ **عینا** کو اب سیدھا پاکستان روانہ کردے۔" کال ختم ہوگئی۔ ٹوں ٹوں کی آواز جیسے ان کے کان کے پردے پھاڑنے لگی۔ انہوں نے حیرت سے ریسیور کو دیکھا۔ یہ ان کا وہی لاڈلا بھائی تھا۔ جو ان کے سامنے کبھی نظریں تک اٹھایا نہ کرتا تھا۔ اور آج بنا سلام دعا کے ہی بات شروع اور ختم کر

"لیکن اس نے یہ سب کہا کیا۔" وہ جیسے شہریار خان کے لفظ دہرانے لگیں۔ اور پہلی بار ان کو لگا وہ واقعی صحیح تھا۔

عیشا، ہیشا، ان کی لاڈلی بیٹیاں، جو ہر وقت ان کی روک ٹوک کی زد میں رہتیں۔ **ہیئر اسٹائل** سے لے کر ڈریسنگ تک، ایک کپ چائے سے لے کر کھانا پکانے تک اور اسکول کالج کی سرگرمیوں میں بھی ان کو روک ٹوک کا سامنا رہتا اور ہمیشہ دوسروں کو ماڈل بناکر پیش کرتیں۔ دوسروں کی مثال دے کر اپنی ہی بیٹیوں کو کاہل اور نامکمل کہتیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ **عیشا** اور ہیشا سب کچھ سیکھ تو گئیں مگر وہ اعتماد کہیں کھو گیا جو کسی بھی شخصیت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ وہ بوکھلائی رہتیں۔ شادی کے بعد انہوں نے البتہ جب بھی ان دونوں سے بات کی وہ بہت الگ لگیں، وہ واقعی ان سے اپنی سگی ماں سے زیادہ بات کرنے سے گریز کرتیں کیونکہ فون پہ بھی ان کا کلام یہی ہوتا۔

"ارے تم نے دوپٹہ اتنا چھوٹا کیوں لیا۔ میں نے تو آج تک کبھی سر سے دوپٹہ نہیں ہٹایا۔" اور **عیشا** فوراً سر پہ دوپٹہ لے لیتی۔

یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ وہ ان دونوں کو ٹوکتی رہتیں۔ تب ہی شاید انہیں پتا بھی نہ چلا اور وہ دونوں ان سے دور ہوتی چلی گئیں۔ کتنے کتنے دن تک وہ ان کی کال کا انتظار کرتیں اور مجبوراً خود ہی کرلیتیں مگر وہ مختصر سی بات کرکے اپنی ذمہ داریوں کا کہہ کر کال ختم کر دیتیں۔

اور ان کی سگی ماں، وہ ان کی اکلوتی اولاد نہ سہی اکلوتی بیٹی تو تھیں۔ اور انہیں ہمیشہ یہی گلہ رہتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ہی خوش ہیں۔ انہیں ان کی کوئی پرواہ نہیں۔ یہ تو کبھی سوچ بھی نہ پائی تھیں کہ اماں ان کی خود پرستی سے عاجز آکر ان سے دور چلی گئیں۔ وہ کتنے دل سے ان کو کال کرتیں۔ بہروز کی غلطیاں اور اپنے سدھار کا بتاتیں، کتنے فخر سے اور اماں ہمیشہ اسے ٹوک دیا کرتیں۔

"لیلیٰ! مرد کی غلطی کو نظر انداز کردینا چاہیے۔ مرد اور عورت تو ایک دوسرے کا پردہ ہوتے ہیں۔ آپ کیا یوں سب کو بہروز کی غلطیاں بتا کر اسے شرمندہ کرو گی۔"

"اماں، مائیں تو بیٹیوں کی باتوں پہ خوش ہوتی ہیں۔ خاص کر ان باتوں پہ جو ان کے شوہر اور سسرال کے خلاف ہو۔" وہ مسکرا کر بولی تھیں۔

"پھر تم شکر کرو کہ ام ایسا ماں نہیں ہے۔" انہوں نے صاف جواب دیا تھا۔ اور بددل ہوکر انہوں نے فون بند کردیا تھا۔

"اف میرے خدا!" انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر جکڑ لیا۔

"کاملیت کاملیت کرتے میں کیوں بھول گئی کہ مکمل تو بس صرف تیری ذات ہے۔ ورنہ تو ہر "میں" کو "تو" لازم ہے۔ میں کیا تھی اگر اماں نہ ہوتیں۔ اگر بہروز نہ ہوتا اگر **عیشا**، ہیشا یا عافین میں سے کوئی ایک بھی نہ ہوتا تو میں نامکمل تھی میرے رب۔ یہ مجھ سے کیسا گناہ سرزد ہوگیا مجھے معاف کردے میرے رب، میرے مہربان۔" وہ چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رودی تھیں۔

* * *

آسمان پہ رات نے پنکھ پھیلا رکھے تھے۔ مگر الاسکا جیسے دن اترا تھا۔ دور سے ہی نظر آتی جھلملاتی، رنگ برنگی پانی سے منعکس ہوکر آسمان کی طرف لپکتی روشنیاں دیکھ کر وہ آدھی سے زیادہ کھڑکی سے باہر لٹکنے لگی تھی۔ اس کی اس بے اختیار حرکت پہ عافین بے ساختہ مسکرادیا تھا۔

"اندر آجاؤ ورنہ میلے میں شامل ان پرجوش لوگوں کی کسی حرکت کا نشانہ بن جاؤ گی۔"

اس نے سڑک کے دونوں طرف امریکہ کے کئی صدیوں پرانے روایتی لباس میں ملبوس، مختلف نقلی ہتھیاروں سے لیس ان نوجوان گروپس کی طرف اشارہ کیا جو واقعی پرانی انگلش میں عجیب و غریب نعرے لگاتے بڑے بڑے ڈنڈے نما ہتھیار اٹھائے آگے بڑھے جارہے تھے۔

"اس میلے میں کم و بیش اٹھارہ لاکھ افراد شرکت کرتے ہیں۔ تاکہ موسیقی، روایتی کھانوں، موم کے مجسموں اور یہاں کے لوگوں سے مل جل کر لطف اندوز ہوسکیں۔" عافین نے اسے بتایا۔

"واؤ۔" **عینا** مزید پرجوش ہوئی۔

الاسکا کی روشنیاں مزید بڑھنے لگی تھیں۔ شور بے ہنگم ہونے لگا تھا۔ وہ جھیل کے پانی تک بنائے گئے لکڑی کے مضبوط پل پہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آئے تھے۔ آسمان پہ ہونے والی آتش بازی اور دور دور تک جھلملاتی روشنیاں رات کے اس پہر پانی میں کس قدر حسین رنگ بکھیر رہی تھیں۔ وہ مبہوت ہوکر دیکھے گئی۔

"کتنے رنگ ہیں نا یہاں۔" وہ جیسے مدہوش ہو کر بولی۔

"ہاں۔ لیکن سب مصنوعی۔" وہ اس کے برابر آ ٹھہرا۔ لہجہ عام تھا۔

"یہ لوگ تو جیتے جی جنت میں رہ رہے ہیں۔" عافین کو اس کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"ہاں مصنوعی اور مختصر ترین جنت۔" وہ مسکرایا تھا۔

"آپ یقیناً" جیلس ہو رہے ہیں۔" عافین کی بات نے اسے اچھا خاصا تپا دیا تھا۔

"تم کہہ سکتی ہو۔ کیونکہ تم یہاں سے ناواقف ہو۔ میں یہاں پلا بڑھا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اوپر سے ہنستے مسکراتے یہ لوگ اندر سے کتنے کھوکھلے ہیں اور ان چند گھنٹوں میں ذرا سی زندگی جینے کے بعد ان کو واپس اپنی تاریخ اور تنہا زندگی کی طرف جانا ہو گا۔ مشینی زندگی، احساسات اور جذبات سے عاری۔"

اس نے ذرا سا جھک کر نیچے ساکت پانی کو چھوا تھا۔ عینا اس بار خاموش رہی تھی۔ تب ہی میوزک کی آواز مزید تیز ہوئی۔

"عینا! ادھر دیکھو۔" اچانک ہی عافین نے اسے پکارا، وہ چونکی۔ جلتی بجھتی لانچ بالکل ان کے قریب آ رہی تھی۔

"کدھر؟" وہ مکمل طور پہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ادھر۔ جھیل کے اس طرف۔" وہ ذرا سا اچھل کر اس کے پاس آ ٹھہرا اور دایاں ہاتھ اٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا۔

"ہاں۔ مگر کیا دیکھوں۔ ڈانس کرتے، شور مچاتے لوگ ہی ہیں۔" وہ حیرانی سے بولی۔

"ارے نہیں۔ وہ دیکھو۔ بلیک کار میں جو شخص ہاتھ ہلا ہلا کر سب کے جوش کو ویلکم کر رہا ہے۔" اس نے دائیں ہاتھ سے دھیرے سے عینا کا سر ذرا سا گھمایا۔ وہ تیس بتیس برس کے لگ بھگ کا نوجوان تھا۔ جس کے گھونگھریالے بال اس کے کندھے چھو رہے تھے۔ بے حد بڑی ناک اس کی شخصیت کو عجب سا رنگ دے رہی تھی اور اس نے کسی جادوگر والا چغہ پہن رکھا تھا۔

"یہ کوئی جادوگر ہے۔" اس کی بے حد تیکھی کمر کو حیرت سے تکتے ہوئے اس نے سوال کیا تھا۔

"نہیں یہ یہاں کے لینڈ لارڈ جوزف کے بیٹے ڈیوڈ ہیں۔ اس ریاست کا شہزادہ سمجھو۔" اس کے لبوں کو بہت دلکش مسکراہٹ نے چھوا۔ عینا کا تو منہ کھل گیا۔

"یہ شہزادہ ہے۔" وہ جیسے صدمے میں بولی تھی۔

"ہاں ناں، کس قدر شاندار پرسنالٹی ہے۔ بس مونچھیں نہیں ہیں۔" وہ شریر ہوا۔

"اللہ اللہ۔ مگر مجھے تو لگا وہ آپ کے جیسا ہو گا۔" بے اختیار ہی اس کے منہ سے پھسلا تھا۔ اور اس دفعہ عافین کے شاکڈ ہونے کی باری تھی۔

"نہ نہ۔ اب اس کو دیکھ کر تم عین وقت پہ جھوٹ بول کر مکر رہی ہو۔" اتنی سادہ اور بے وقوف لڑکی سے وہ اس بات کی کم از کم توقع ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔

"جن کے دلوں پہ محبت اترتی ہے، وہ جھوٹ نہیں بولا کرتے عافی۔" لانچ رک گئی تھی۔ اور وہ یہ کہہ کر نیچے اتر گئی۔ عافین گم صم سا اس کے پیچھے چلا۔

"محبت فاتح عالم
گرچہ ایک دل پہ ہی حکمرانی ہو۔
کائنات قدموں تلے محسوس ہوتی ہے۔
بس جسے وقت نوازے۔
اور وہ فاتح ٹھہرا تھا۔
وقت نے اسے حکومت دی تھی۔
وہ فاتح عالم تھا۔ محبت کا شہزادہ۔"

ٹھنڈی نرم ریت پہ چلتے چلتے اس نے سینڈل اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے تھے۔

"پتا ہے عافی، کسی بھی لڑکی کو ریاست کے شہزادے کے خواب ضرور آتے ہیں۔ مگر وہ دل اسی کو دیتی ہے۔ جو اس کے لیے صرف محبت اور عزت کی دولت لائے۔۔ صرف محبت کے شہزادے کو۔" اس نے ایک طرف لگے مختلف رنگوں کے پھولوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا اس کے قریب آیا تھا۔ عافین کی نظریں اس کے لو دیتے چہرے پہ جمی تھیں اور عینا کی نگاہیں الاسکا کی جھلملاتی روشنیوں پہ۔ عینا نے ذرا سا جھک کر ایک پھول توڑ لیا۔ سفید رنگ کا شفاف اجلا پھول۔

"مجھے نہیں پتا کہ انجام کیا ہو گا۔ منزل ملے نہ ملے مگر میرے پیر اس راستے پہ پڑ چکے ہیں اور میں یہ لمحے اپنی مٹھی میں قید کر لینا چاہتی ہوں۔ ایک سنہری یاد ہی سہی۔ الاسکا کے شہزادے۔" اس نے کہتے ہوئے پھول عافین کی طرف بڑھا دیا تھا۔ عافین نے فوراً" وہ پھول دھیرے سے تھام لیا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دن کی بدترین شام کا انجام اس قدر خوب صورت جگمگاتی رات جیسا بھی ہو سکتا ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔ عینا ایک ٹک اسے دیکھے گئی۔

"جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا، میرے تصور میں بھی نہ تھا کہ میں تم سے وہ سب سن لوں گا۔" مسکراہٹ گہری ہوئی۔ عینا دوبارہ روشنیوں کی طرف رُخ پھیر گئی۔

"کاش میں یہ سب کہنے سے خود کو روک پاتی۔" اس کی آواز بے حد مدھم تھی۔

"مطلب؟" وہ الجھا۔

"پتا ہے عافی۔" اس نے گیلی ریت پہ دھیرے دھیرے قدم بڑھائے۔ عافین اس کے ہم قدم ہوا۔ "محبت کبھی اکیلے دل کی دھرتی پہ قدم نہیں رکھتی۔ جدائی کا خوف، جان لیوا خوف اس کے ہم رکاب ہوتا ہے۔" عافین کا بایاں ہاتھ خود بخود سائیڈ پاکٹ میں جا گھسا تھا۔

"اور یہاں تو سب کچھ بے حد واضح ہے۔" وہ رک گئی۔

"واضح ہے تو کیا ہوا۔ سب کچھ ختم تو نہیں ہوا۔" وہ پُرامید تھا۔

"کیا آپ کو لگتا ہے کہ اس کے بعد بھی کچھ باقی بچے گا؟" اس کی پلکیں جھپکنے لگی تھیں۔

"جن رشتوں کو قبولیت کا شرف مل جائے وہ کچھ اور معتبر اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"الاسکا۔۔۔ سرمئی پانیوں کی زمین کا جادو ہے۔" وہ شاید روشنیوں سے جھلملاتی جھیل پہ متوجہ تھی۔

"اور محبت کا شہزادہ!" وہ اچانک اس کے سامنے آ کر شریر لہجے میں بولا۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ عینا نے چند لمحے اسے بغور دیکھا تھا۔

"باقی تو سب ٹھیک ہے مگر۔۔۔؟" وہ بات ادھوری چھوڑ کر پیچھے کی طرف مڑ گئی۔

"مگر۔۔۔" عافین بے قراری سے اس کے ساتھ ہوا تھا۔

"مگر۔۔۔" وہ رکی، عافین بھی رک گیا۔

"مگر آپ کی مونچھیں نہیں ہیں۔" کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ عافین کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

* * *

یہ پہلی بار تھا جب بہروز گھر آئے تو بنا ان کو مخاطب کیے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان کا دل مزید بوجھل ہوا۔ وہ بے دلی سے کچن کو بے وجہ ہی بار بار صاف کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ اعصاب جواب دینے لگے۔ انہوں نے تھک ہار کر ڈسٹر ایک طرف پھینکا۔ لمبی سانس لے کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی اور کافی بنا کر کمرے میں چلی آئیں۔ بہروز حسب معمول اپنے لیپ ٹاپ پہ مصروف تھے۔

"کافی!" انہوں نے خود کو نارمل کرتے ہوئے ان کے سامنے کپ ٹیبل پہ رکھا۔

"شکریہ۔" مختصر سرد سا جواب۔ ان کے دل کو کچھ ہوا۔

"عافین۔۔۔" پتا نہیں کیوں مگر بہروز کے گریز کو سمجھتے ہوئے بھی، آج پہلی مرتبہ وہ خود سے بات کرنا چاہتی تھیں۔

"عینا اور عافین کے ٹکٹ بک کرا دیے ہیں۔ وہ ایک بجے تک نکل جائیں گے۔" وہی کھردرا اجنبی لہجہ۔ لیلیٰ کو دل میں درد سا محسوس ہوا۔

"اتنی رات کی فلائٹ کی کیا ضرورت تھی۔ صبح بھی جا سکتے تھے۔" ان کی آواز کمزور ہونے لگی۔

"پلیز لیلیٰ۔ جیسا تم چاہتی تھیں ویسا ہو گیا۔ اب یہاں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو تمہارے گھر کو ڈسٹرب کرے۔ سو پلیز اب یہ فضول کی باتیں چھوڑ دو۔" وہ چڑ کر بولے۔ لیلیٰ ساکت رہ گئیں۔ تیس بیس سالہ ازدواجی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ جب بہروز اس قدر خشک ہو رہے تھے۔ بے حد بیزار سے۔

"میرا یقین کریں۔ بہروز! میں ایسا کچھ نہیں چاہتی تھی۔ میں تو بس سب کچھ مکمل۔" وہ بولنے لگیں کہ بہروز نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

"مکمل، مکمل، مکمل!!۔" وہ جیسے خود کو چلانے سے روک رہے تھے۔ ان کی گردن کی نسیں تن سی گئیں تھیں۔

"اس میں اور مکمل کی لکیر سے باہر نکل آؤ۔ محبت اور مناسب کے دائرے میں لے آؤ خود کو۔ مکمل صرف اللہ کی ذات ہے۔ میں کا غرور بھی صرف اسی کی ذات کو جچتا ہے۔ ہم سب نامکمل ہیں۔ اس کامل ذات کی کن کے محتاج، ہم مٹی کے پتلوں کو یہ غرور زیب نہیں دیتا۔" وہ جیسے تھکنے لگے تھے۔

تم تو ایک بیٹی، ماں، ایک بہترین دوست نہ بن سکیں۔ ایک مکمل انسان کیسے بن سکتی ہو لیلیٰ!" وہ ہانپنے لگے تھے۔ اور لیلیٰ ساکت بیٹھی، بس انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔

* * *

"ام نے کتنا منع کیا تھا۔ مگر تم کو ہی بخار چڑھا تھا بہن کے پیار کا۔ کتنا کمزور ہو گیا ہے میرا بچی۔" گھر آتے ہی دادی، بابا، بوا، بیگم سب اس کے واری صدقے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ عافین کو بھی وہ پروٹوکول نہ مل سکا جس کی وہ اتنے عرصے بعد آنے پر توقع کر رہا تھا۔

"مجھے کیا پتا تھا، لیلیٰ آپا ایسے بی ہیو کریں گی۔" شہریار کو پھر ٹینشن ہونے لگی۔ انہوں نے فوراً" سگار سلگا لیا۔

"انکل آپ پلیز ٹینشن نہ لیں۔ آپ جانتے ہیں ان کی طبیعت کو۔" وہ ان کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولا۔

"یہی تو افسوس کا بات ہے کہ شہری نہیں جانتی۔ ام جانتا ہے اس کو۔ پکا کھڑوس روح ہے اس میں۔ اس نے ٹھیک نہیں ہونا۔ اسے بس لیلیٰ نظر آتا ہے، مطلب اپنا آپ۔" دادی عینا کے سنہری بال پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"ہم نے تو منع بھی کیا تھا مگر عینا اتنی ایکسائیٹڈ تھی کہ....." **عیشا** ناشتہ لگاتے ہوئے بولی۔ وہ دونوں بہنیں فوراً" وہاں پہنچی تھیں۔ جیسے ہی عینا اور عافین کے آنے کا سنا۔

"خیر! پھپھو اب اتنی بھی بری نہیں ہیں۔ بس مشکل بہت ہیں۔" **عینا** اداس لہجے میں بولی۔ وہاں بیٹھے سب ہی نفوس نے محسوس کیا تھا۔ وہ پہلی جیسی عینا بالکل نہیں رہی تھی۔

"میں ذرا چینج کر لوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ **عیشا** اور میشا بھی اس کے پیچھے چل دیں۔

"عینا کو نکاح کا پتا چل گیا؟" ان کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی شہریار نے عافین سے پوچھا۔ وہ نفی میں سر ہلا گیا۔

"میں اسے کسی بے حد مناسب موقع پہ خود بتانا چاہتا تھا۔ مگر ماما....." وہ سر جھکا گیا۔

"عافی زوئے (بیٹا) تم بھی ام کو اتنا ہی عزیز ہے۔ جتنا عینا..... مگر ام کو افسوس ہے کہ اب تم دونوں کے حق میں بہتر یہی ہے کہ وہ انجان ہی رہے۔" بتول اماں کی بات پہ وہ بری طرح چونکا۔

"کیا مطلب بتول اماں؟" وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھے گیا۔

"مطلب صاف ہے زوئے۔ امارے خاندان میں رشتہ بڑے بناتے ہیں اور لیلیٰ کو تم بھی جانتے ہو۔ اس نے صاف کہا کہ عینا جیسی لڑکی اس کا بہو نہیں بن سکتی۔ سو اس کے بعد باقی کیا رہتا ہے، بولو؟" بتول اماں نے دامن سے عینک صاف کرتے ہوئے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"لیکن بتول اماں....."

"بس زوئے۔ بات ختم ہو جائے تو ہی اچھا ہے۔ پھر تم کو یہ بھی پتا ہے کہ بچپن کا نکاح کا کوئی حیثیت نہیں تھا۔ وہ تو بس تمہارے دادا کا خواہش تھا تو ام سب نے مان لیا۔ باقاعدہ نکاح تو ہوا تھا۔ مگر اب۔"

"عافین بیٹا! بتول اماں کی بات سچ ہے۔ لیلیٰ آپا تمہاری وجہ سے قبول کر بھی لیں تب بھی عینا جیسی لاابالی طبیعت کی لڑکی کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ مکمل طور پہ اسے اپنے دل میں جگہ دے سکیں۔ سو بہتر یہی ہے کہ خاموشی سے اس رشتے کو ختم کر دیا جائے۔" اٹل لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے دھواں چھوڑا تھا۔ اور عافین کے پاس جیسے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔

* * *

"تم تو چند دنوں میں ہی بدل گئی ہو۔" وہ نہا کر باہر آئی تو بیڈ پہ لیٹی **عیشا** فوراً" بولی۔

"اچھا وہ کیسے؟" وہ دھیرے سے مسکرائی اور گیلے بالوں میں برش کرنے لگی۔

"تم بہت چپ چپ سی ہو گئی ہو۔" **عیشا** نے بغور دیکھا۔

"اداس سی بھی، بلکہ یہ اداسی تمہاری آنکھوں میں واضح دکھائی دے رہی ہے۔" میشا نے بات بڑھائی۔

"پچھلے تین ہفتوں میں تم نے نہ ہی ٹوئیٹر پہ وزٹ کیا نہ ہی فیس بک کی ڈسپلے پکچر بدلی۔" عیشا نے ہی مزید نکتے بتائے۔

"اور ہمارا مری کے ٹور کا البم بھی تم نے نہ صرف فیس بک پہ مس کر دیا بلکہ ہماری پہلی پوسٹ تھی جس پہ سب سے پہلے تو کیا سب سے لاسٹ میں بھی تمہارا کمنٹ نہیں آیا۔" میشا نے **عیشا** کی طرف دیکھتے ہوئے بائیں آنکھ دبائی۔ وہ مسکرا دی۔

"وہم ہے آپ لوگوں کا۔" **عینا** نے ٹالا۔

"حیرت ہے ہم دونوں کو ایک ہی وہم ایک ساتھ ہو رہا ہے اور کچھ کچھ اندازہ بھی۔" **عیشا** اس کے

ماہنامہ کرن

اپریل 2019ء کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

کرن کتاب

مزے دار ریسپیز اور دلچسپ مضامین کے ساتھ

- مصنفہ "نفیسہ سعید" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکار "منیب بٹ" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"
- آواز کی دنیا سے "آر جے عزیز احمد" اس ماہ مہمان ہیں،
- اس ماہ "ماریہ نذیر" کے "مقابل ہے آئینہ"
- "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کا سلسلے وار ناول،
- "شب نم کی سحر" رخ چوہدری کا سلسلہ وار ناول،
- "چونچ مارتے کوے" شائلہ دلعباد کا مکمل ناول،
- "ساگر کنارے" ام طیفور کا مکمل ناول،
- "شام رنگ سیاہ" ایمل رضا کا ناولٹ،
- "ایک کہانی محبت کی" نگہت سیما کا ناولٹ،
- "عزم وفا" شبانہ شوکت کا ناولٹ،
- امت العزیز شہزاد، بشریٰ احمد اور نازیہ کنول نازی کے افسانے اور مستقل سلسلے۔

قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے تو لگتا ہے جیسے تم واپس تو آگئی ہو مگر۔" عیشا نے بات روک لی۔

"خود کو وہیں چھوڑ آئی ہو۔" یشا نے بات مکمل کی۔

"میرے خیال میں نیچے چلنا چاہیے۔" وہ اٹھنے لگی۔ عیشا نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"عینا! ایک بات بتاؤں؟" یشا اس کے قدموں میں آ بیٹھی۔ وہ اداسی سے سرہلا گئی۔

"امی کا رویہ نئی بات نہیں۔ ہم سگی اولاد بھی ان کے اس مزاج سے ہرٹ ہوئے۔ مگر وہ دل کی بری نہیں ہیں۔ لیکن اس سب کو چھوڑ کر میرا بھائی عافین" وہ رکی۔ عینا کے دل نے ایک دھڑکن مس کی۔

"عافین اور بابا بے حد نرم، شفیق اور دوستانہ طبیعت کے مالک ہیں۔ بابا کس قدر ہرٹ ہوئے اس سارے معاملے میں، تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ لیکن جو کچھ میں تمہیں بتانے لگی ہوں۔ وہ بے حد ضروری ہے۔ شاید تمہارے لیے نہ سہی مگر میرے بھائی کے لیے۔"

"عافین اور تم زیادہ قریب نہیں رہے مگر پھر بھی ہم بہنیں گواہ ہیں۔ وہ تمہیں کس قدر قریب سے جانتا ہے۔ ہم بہنوں سے، ہمارے علاوہ اگر وہ کسی کی بات کرتا ہے۔ تو وہ تم ہو عینا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمہارے اور اپنے رشتے کو بے حد عزت دیتا ہے۔ تم اس کے لیے بہت ضروری ہو۔" یشا کی بات پہ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"کیا مطلب؟ کیسا رشتہ؟"

"وہ عافین بھائی..." یشا ذرا رکی "عافین اور تمہارا نکاح ہوا تھا بچپن میں دادا جی کی خواہش پہ۔" اور عینا کو نہ جانے کیوں ایسا لگا کسی نے اس کے دل کے جذبوں کی سچائی پہ مہر ثبت کر دی ہو۔

"اس نے آج تک کسی بھی لڑکی سے دوستی نہیں رکھی۔ کم عمری کے باوجود اس نے اپنے اور تمہارے رشتے کو دل و جان سے قبول کیا اور دل ہی دل میں محبت سے اس پودے کی آبیاری کرتا رہا۔ اس سارے معاملے میں اگر کسی کا نقصان ہوا تو میرا بھائی عافین کا ہو گا۔ بتول اماں نے تمہارے آنے سے پہلے ہی رشتہ ختم کر دینے کی بات کر دی ہے۔ لیکن ہم بہنیں نہیں چاہتیں کہ امی کے غلط رویے کی سزا ہمارے اتنے اچھے بھائی کو ملے اور وہ ہرٹ ہو۔" عیشا نے اس کا ہاتھ تھاما۔ عینا کی آنکھیں جل اٹھیں۔

"اور میرا کیا عیشا آپی؟" وہ سرخ ہوتی آنکھوں سے ان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں... جس نے انجان ہوتے ہوئے بھی اس رشتے کی طرف قبولیت کا ہاتھ بڑھا دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آگے آگ کا دریا ہے اس میں ننگے پیر دھر دیے۔ میرا کیا؟" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس بار حیران ہونے کی باری عیشا اور یشا کی تھی۔

"عینا! تم سیریس ہو؟" یشا تو اچھل ہی پڑی۔

"سب کچھ بکھر گیا عیشا آپی۔" اس نے ہاتھ عیشا کے ہاتھ سے نکال لیا۔

"پھپھو نے کس قدر تلخ لہجے میں مجھے مسترد کر دیا۔ وہ تو میری شکل دیکھنے کی روادار نہیں ہیں۔"

"ہم سب ہیں نا۔ ہم منالیں گے۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں چاہوں گی کہ زبردستی کا کوئی رشتہ بناؤں۔ میں نے منی سوٹا کی زمین سے قدم اٹھاتے ہی یہ فیصلہ کیا تھا۔ میں کسی کو بھی پھپھو کو مجبور نہیں کرنے دوں گی۔" وہ اٹل لہجے میں کہتی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ عیشا اور یشا ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"کل کی فلائٹ سے جانا ہے مجھے۔ ضروری کام ہے۔" عیشا، عافین کو چائے دینے کمرے میں آئی تو وہ فون پہ کسی سے بات کر رہا تھا۔ عیشا کا دل اداس ہونے لگا۔ وہ چائے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"بھائی! اتنی جلدی جا رہے ہو۔" فون بند کرتے ہی وہ اس سے بولی۔

"کام ہے ورنہ کبھی نہ جاتا۔" وہ مسکرایا۔

"پھر بھی، اتنی جلدی۔"

"تمہیں پتا ہے، امی اور ابو کا اس سب کے بعد کیا حال ہو گا۔ دونوں میں ایک خاموش سی جنگ جاری رہے گی۔ امی کبھی تبدیل نہیں ہوں گی۔ اور اب بابا برداشت نہیں کریں گے کیونکہ واقعی حد ہو گئی ہے۔ میں بس اسی لیے جلدی جانا چاہتا ہوں تاکہ گھر کے ماحول کا کھنچاؤ کچھ کم کر سکوں۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"مگر عافین! کیا تمہیں نہیں لگتا کہ اب ہم سب کو امی کو سمجھانا چاہیے۔"

"مطلب۔" وہ جانتا تھا یہ سب فضول تھا۔

"مطلب، اس بار ہم سب امی کو اکیلا کر دیں۔ صرف ان کو کچھ محسوس کرانے کے لیے۔ ورنہ تم جانتے ہو، میں امی کو بہت عزیز رکھتی ہوں۔" عیشا نے کہا تو وہ سرہلا گیا۔

"میں ایسا کبھی نہیں کر سکتا عیشا، میں سب کچھ سہہ سکتا ہوں۔ مگر امی کو ہرٹ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔" وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

"یہی تو مسئلہ ہے بھائی کہ اب بات صرف آپ کی نہیں رہی۔ اب بات عینا کی بھی ہے۔" عافین نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"آپ کی ڈھکی چھپی خواہش نے نہ جانے کب اس کے دل کو جا چھوا۔ پھر بات صرف یہاں تک نہیں رہی بلکہ یہ رشتہ اگر ٹوٹا تو کئی رشتوں میں دراڑ آ جائے گی۔ سب کچھ بکھر جائے گا۔" عیشا کی باتوں نے جہاں عافین کے دل کو یک گونہ اطمینان بخشا تھا، وہیں کسک بھی عطا کر دی تھی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

☼ ☼ ☼

"کیا کر رہی ہے میری شہزادی؟" وہ کچن میں اسے ڈھونڈتے آئے تو وہ جو شاید کسی کوکنگ کی کتاب میں گم تھی۔ چونک گئی۔

"قورمہ بنانا سیکھ رہی ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اور دوبارہ ترکیب ڈھونڈنے لگی۔

"عینا میری شہزادی، مجھے ایسی ہی اچھی لگتی ہے۔ پلیز یوں ایک دم سے نہ بدلو بیٹا۔" ان کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ منی سوٹا سے واپسی پہ واقعی بدل گئی تھی۔

"نہیں بابا! میں نے جان لیا۔ یہی عمر ہے کہ بدل لوں خود کو۔ ورنہ جو دنیا سکھاتی ہے وہ سبق بہت تلخ ہوتے ہیں بابا۔" وہ کتنی بڑی بڑی باتیں کرنا سیکھ چکی تھی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا عینا۔" انہوں نے اس کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"سب ٹھیک ہی ہوتا ہے بابا! ہم اپنی نادانی سے سب غلط کر لیتے ہیں۔ بس میں بھی یہی کوشش کر رہی ہوں کہ جو خراب کر دیا، اسے کچھ سدھار بھی لوں۔ ویسے بھی یہ بات تو میں اچھی طرح جان گئی ہوں کہ بیٹی، شہزادی صرف باپ کے لیے ہوتی ہے۔ سو اچھا ہے، دوسری دنیا کے لیے اس سے ہٹ کر بھی سوچا جائے۔"

وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے پیاز کاٹنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی وجہ وہ نہ جان سکے۔ یہ پیاز کا اثر تھا یا اس کے اندر کا درد۔ شہریار خان واقعی زندگی میں پہلی بار بے بس ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

موسم بے حد خوش گوار تھا۔ گھنے بادلوں نے دوپہر کے وقت بھی شام کا سماں باندھ رکھا تھا۔ دو کنال کے اس وسیع و عریض کچی چار دیواری والے مکان میں لگے جا بجا سرسبز درخت اور ننھے پودے جیسے خوشی سے مہک رہے تھے۔ ایک طرف بنے کچے لمبے برآمدے میں بندھی بھینسوں کے گلے میں بندھی گھنگھریاں (چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں) مسلسل بجتیں تو عجیب سی موسیقی سارے ماحول پہ سحر سا طاری کر

دیتی۔ تب ہی لکڑی کا بڑا سا دیوہیکل مضبوط دروازہ کھلا تھا اور ایک ڈاٹسن اندر آئی۔ بالکل آخر میں قطار میں بنے کمروں کے سامنے طویل برآمدے میں گڑیا سے کھیلتی وہ دس سالہ بچی، جس نے خوب صورت افغانی فراک پہن رکھا تھا۔ فوراً" اس گاڑی کی طرف بھاگی تھی۔

"بابا راغلے۔ زما بابا راغلے۔" (بابا آگئے۔ میرے بابا آگئے) وہ چلاتی ہوئی دوڑی۔ چارپائی پہ بیٹھی سب ہی خواتین اس کی اس حرکت پہ مسکرائیں۔ خان بابا نے نزدیک آتے ہی اسے جھپٹ کر اٹھالیا تھا۔

"زما جانان مورے۔" (میری محبوب بیٹی) انہوں نے اس کے خوب صورت گال چوم لیے۔

"کیسی ہے ہماری شہزادی؟" انہوں نے اسے اتارتے ہوئے پوچھا۔

"ہم ٹھیک ہے بابا۔" وہ مسلسل باپ کے چہرے کو تکتے ان کے ساتھ قدم بڑھا رہی تھی۔

"کیسے ہیں خان جی؟" خوب صورت نوجوان خاتون، سلام کرتے ہوئے ان کے قریب آئیں۔

"الحمدللہ۔ ہماری بیٹی بہت یاد کرتی رہی ہمیں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے انہیں جواب دیا۔

"بابا! ہم آپ کو سب سے زیادہ پیارے ہیں نا۔" ان کے چارپائی پہ بیٹھتے ہی اس بچی نے سوال کیا تھا۔

"سب سے زیادہ۔ مگر ہر رشتے کی اپنی اہمیت ہوتی ہے بیٹا۔" وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ان کا پیار ان کی عزیز از جان بیٹی کے لیے زہر بنے۔ تب ہی اقرار کے ساتھ چھوٹی سی نصیحت بھی کی۔

"لیکن میں تو آپ کے لیے سب سے اہم ہوں نا بابا؟" وہ بضد ہوئی اس کی لمبے بالوں کی چوٹیاں اس کے کندھوں سے نیچے تک آرہی تھیں۔

"ہاں ہاں۔" وہ ہنس دیے۔

"امارہ بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ پتا ہے گھر کا سارا کام سنبھالنے لگا ہے ہمارے ساتھ۔ ہر کام میں ہاتھ بٹانے آجاتا ہے۔" اس کی ماں کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔

"واقعی!" وہ بھی خوش ہوگئے۔

"ہاں بابا، ہم چاہتے ہیں کہ کسی بھی چیز میں کوئی بھی ہمارا مقابلہ نہ کرسکے۔ بس صرف ہم۔" وہ کیا کہہ رہی تھی۔ خان بابا کانپ کے رہ گئے۔

"ہم انسان ہیں بیٹا۔ خاکی لوگ، ہم مکمل نہیں ہو سکتے۔"

"نہیں بابا۔ میں دکھاؤں گی کہ میں سب سے بہتر ہوں۔"

"یہ تکبر میں آتا ہے بیٹا۔" انہیں اب غصہ آنے لگا تھا۔ پر ان کی بیٹی کیا سوچ رہی تھی۔

"خود کو بہتر کرنا، سب سے برتر کرنا، تکبر نہیں بابا۔"

"لیلیٰ، بس چپ۔ اس قسم کی سوچوں کو دماغ میں جگہ نہ دو۔ لیلیٰ کی ماں اسے قرآن پاک کی تعلیم دلاؤ۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے اس کی ماں کو پکارا اور پھر ذرا کی ذرا مڑے۔

"ابھی تم بہت چھوٹی ہو۔ مگر یہ سوچ اگر پختہ ہوگئی تو یقین کرو لیلیٰ بیٹا! تم اکیلی رہ جاؤ گی۔ اکیلی اور ادھوری۔" خفا خفا لہجے میں کہتے وہ اس سے دور جانے لگے۔

"بابا۔" وہ پکار اٹھی۔ لیکن ان کے قدم نہ رکے۔ وہ بہت دور جاچکے تھے۔

"بابا، بابا۔" وہ چلا اٹھی تھی۔

"لیلیٰ، لیلیٰ آنکھیں کھولو۔" بہروز نے بری طرح چلاتی لیلیٰ کو جھنجھوڑتے ہوئے پکارا۔ وہ پسینے سے شرابور تھیں۔ تنفس بھی بہت تیز تھا۔ بیدار ہونے پہ وہ حیرت بھری نگاہوں سے بہروز کو دیکھنے لگیں۔

"کیا ہوا لیلیٰ تم ٹھیک تو ہو؟" وہ پریشان تھے۔

"بہروز بابا... بابا ہم سے خفا ہو کر چلے گئے۔" ان کے لب کپکپانے لگے۔

"خواب دیکھا ہے تم نے۔" انہوں نے انہیں تسلی دی۔

"نہیں بہروز، وہ واقعی ناراض تھے۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم اکیلے رہ جائیں گے۔ انہوں نے یہ کہا اور خفا ہو کر چلے گئے۔" وہ رو دی تھیں۔

"کم آن لیلیٰ، تم اچھی طرح جانتی ہو کہ بابا تم سے کبھی ناراض نہیں ہوسکتے۔" وہ ان کو پانی پلاتے ہوئے بولے۔ جو انہوں نے پینے سے انکار کردیا۔

"اس بار خفا ہوگئے بہروز۔ کیونکہ اس بار میں نے سب کو ناراض کردیا۔ اماں، بھائی، حتیٰ کہ آپ کو اپنے بچوں تک کو ناراض کردیا میں نے "میں" کے اندر گم ہو کر میں خود کو گم کر بیٹھی۔ کھو گئی میں۔ اکیلی رہ گئی۔ بابا کی بات سچ ہوگئی۔" وہ رو دی تھیں۔ بہروز مزید کچھ نہ بول پائے۔

"بہروز۔" اچانک ہی انہوں نے بہروز کے ہاتھ تھام لیے۔

"کیا ہم پاکستان جاسکتے ہیں؟ صبح، پہلی فلائٹ سے ہی۔"

"لیکن۔" بہروز حیران و پریشان رہ گئے۔

"لیکن نہیں پلیز۔ آپ پلیز **ٹکٹس** کنفرم کروائیں۔ میں تب تک ناشتہ بنالوں۔ پلیز جلدی، ہاں۔" وہ گال ہاتھوں سے صاف کرتی انہیں ہدایات دیتی تیزی سے باہر نکل گئیں اور بہروز آنے والے وقت کا سوچنے لگے۔

* * *

گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھلا تھا۔ بہروز ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر سامان نکالنے لگے۔ لیکن لیلیٰ انہیں وہیں چھوڑ کر اندر چلی آئیں۔ یہ گاؤں کا وہی کچا مکان تھا۔ مگر جگہ جگہ لگائے گئے پودے بالکل اسی ڈھنگ سے تھے جیسے ان کے آبائی گھر میں۔ کالے سفید پتھروں سے مل کر بنائی گئی بڑی سی روش پہ چلتی وہ جیسے بیتے لمحوں میں سانس لینے لگیں۔

پرانی جگہوں پہ آتے ہی ماضی سانس لینے لگتا ہے۔ انہیں محسوس ہوا تھا۔ آگے گھر کا اندرونی دروازہ تھا۔ جس کے سامنے درخت کی سوکھی شاخوں سے چھپرنما برآمدہ بنا کر اوپر بوگن ویلیا کی بیل ڈال دی گئی تھی۔ شہریار نے کیسے اپنی یادوں، اپنے ماضی کو زندہ رکھا تھا۔ انہیں حیرت ہوئی۔

انہوں نے ہلکے سے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔

"لیلیٰ زوے!" بوا بیگم کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا۔ لاؤنج میں اس وقت صرف وہی تھیں۔

"بوا بیگم۔" وہ تیزی سے ان کے شفیق وجود سے لپٹ گئیں۔ آنسو قطار در قطار ان کا چہرہ بھگونے لگے۔ گلاس ٹوٹنے کی زوردار آواز پہ سب ہی اپنے کمرے سے باہر آئے تھے۔ اور ساکت رہ گئے تھے۔

عینا سیڑھیوں پہ ہی کھڑی رہ گئی۔ شہریار اور بتول اماں چاہ کر بھی ان کی طرف قدم نہ بڑھا پائے۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی ان کے قریب آگئیں۔

"بتول اماں، شہری!" ان کے پاس جیسے لفظ ختم ہوگئے تھے۔ وہ وہیں ڈھے گئیں اور زارو قطار رونے لگیں۔ بتول اماں کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ شہریار نے آگے بڑھ کر بہن کو کندھوں سے تھام کر کھڑا کیا۔ اور اپنے ساتھ لگالیا۔

"بیٹیاں شہزادی ہوتی ہیں۔ تو بہنیں بھی بھائیوں کا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

ماں ہوتی ہیں آپا! آپ کو آئندہ کبھی مجھ سے شکایت نہ ہوگی۔" انہوں نے بہن کو خود سے لگا لیا۔ ساری ناراضی پل میں ہوا ہوگئی۔ وہ اور روئیں۔

"السلام و علیکم۔" تب ہی بہروز اندر آئے تھے۔ شہریار اور بتول اماں نے کھلے دل سے ان کا استقبال کیا۔

"بتول اماں۔" لیلیٰ ماں کی طرف بڑھیں تو انہوں نے بھی بانہیں وا کر دیں۔ وہ کتنی ہی دیر تک سسکتی رہیں۔ عینا سب کو دیکھتی چپ چاپ واپس مڑ گئی۔

* * *

"شکر ہے کہ امی نے وقت پہ سب کچھ بکھرنے سے بچا لیا۔" عیشا نے ہری پیلی چوڑیاں عینا کی کلائی میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ویسے سچ کہوں تو مجھے اس سب کی اب امید نہیں رہی تھی۔" میشا اس کے سنہری بالوں میں چٹیا ڈال کر پھول سجا رہی تھی۔

"امید تو مجھے بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن سچ میں اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔" عیشا نے مسکراتے ہوئے گرین موتیوں کا سیٹ عینا کو پہناتے ہوئے، مسکراتے ہوئے کہا۔

"کتنی پیاری لگ رہی ہو۔ ماشاء اللہ۔" اس نے ٹھوڑی سے اس کا چہرہ تھام کر اونچا کیا۔ سبز اور زرد رنگ کے لباس میں واقعی وہ کوئی پری لگ رہی تھی۔ ان چھوئی، اجلی اجلی سی، معصوم سی پری۔

"میں نے بھی کہاں سوچا تھا کہ سب کچھ ختم ہو کر یوں دوبارہ سے شروع ہو جائے گا۔" عینا تو ابھی تک شاکڈ تھی۔ اسے تو جب سے بتایا گیا تھا کہ لیلیٰ یہاں جلد از جلد اس کے نکاح اور جھٹ پٹ رخصتی کے لیے ہی آئی ہیں تو وہ جیسے دنگ رہ گئی۔

"ابھی جب تم اور عافین ایک دوسرے کو سب کے سامنے قبول کرنے کا اقرار کرو گے تو ساری حیرت ہوا ہو جائے گی۔" میشا نے شرارت سے اسے چٹکی لی۔ وہ سی کر کے رہ گئی۔

اسے لاؤنج میں لایا گیا تو سب کی سراہتی نظریں دیکھ کر وہ جیسے خود میں سمٹی جا رہی تھی۔ میشا اور عیشا نے عافین کے ساتھ ہی اسے بٹھا دیا — اس نے ڈرتے ڈرتے ایک نظر عافین کے مطمئن چہرے پہ ڈالی، جو اب بہنوں کی شرارت کا جواب دے رہا تھا۔ اور پھر دور بتول اماں سے بات کرتی لیلیٰ پھپھو کو دیکھا ان کے چہرے پہ بھی اطمینان اور خوشی رقم دیکھ کر اسے کچھ اطمینان محسوس ہوا۔

"عینا۔" وہ چونکی۔ عافین نے اسے پکارا تھا۔ وہ مزید سمٹ گئی۔ اس کے گریز پہ وہ مسکرا دیا۔

"صرف اتنا بتا دو، کوئی اعتراض تو نہیں۔" وہی دوستانہ لہجہ۔

"میں نے شاید بتا دیا تھا آپ کو۔"

"میں پھر سننا چاہتا ہوں۔"

"میرے لیے تو اب بھی یہ سب ناقابل یقین ہے۔" وہ مدھم لہجے میں بولی۔

"لیکن میرے لیے نہیں۔" وہ چونکی، اس نے دیکھا عافین کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

"مجھے اپنے رب پہ بھروسا تھا۔ اور پھر ویسے بھی جس آسمان کا پہلا تارہ میرے نام کا تھا۔ اس آسمان کا چاند کسی اور آنگن میں بھلا کیسے جگمگا سکتا تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے پورے یقین سے بولا تھا اور عینا کے دل کے اندر تک اطمینان سرایت کر گیا تھا۔

بے شک، رشتوں کو توڑنے میں نہیں، جوڑنے میں ہی انسان کی بقا ہے۔

* * *

نظیر فاطمہ

اپنے سے پیاری

گھر کے پچھواڑے میں اسٹور نما دو کمرے بنے ہوئے تھے جن کے دروازے ہر وقت مقفل رہتے تھے۔ عائشہ نے ان بند کمروں کی چابی اٹھائی اور گھر کی مرکزی عمارت سے نکل کر ان کمروں کی طرف چلی آئی۔ اس نے باری باری دونوں کمروں کے تالے کھولے اور کمروں کے دروازے کھول کر اندر کے حبس کو باہر نکلنے کا موقع دیا۔

کوئی دس منٹ بعد اس نے پہلے کمرے میں جھانکا۔ پورا کمرہ سامان سے بھرا ہوا تھا۔ پیٹیاں، ڈبوں میں بند الیکٹرونکس مشینری، کراکری، الماریاں اور نہ جانے کیا کچھ اس کمرے میں بھرا ہوا تھا۔ ہر چیز مٹی اور گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ مکڑیوں کے

جالے تھے۔ اندر جانے کی جگہ تو نہیں تھی وہ دروازے میں کھڑی سامان کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ دوسرے کمرے کے دروازے میں جا کر کھڑی ہوگئی۔ یہ پورا کمرہ فرنیچر سے بھرا ہوا تھا۔ بیڈ، ڈریسنگ ٹیبل، صوفے، کرسیاں، ڈائننگ ٹیبل کرسیاں، چارپائیاں غرض ہر وہ چیز جو فرنیچر میں شمار کی جاسکتی تھی، یہاں موجود تھی۔

کمرے سے فرنیچر کی سیلن زدہ بو اٹھ رہی تھی۔ ناقدری سے پڑے رہنے کے باعث فرنیچر خراب ہو گیا تھا۔ عائشہ کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ یہ اس کے جہیز کا سامان تھا، جس میں سے ایک چیز بھی ایسی نہیں تھی جو عائشہ کو برتنا نصیب ہوئی ہو۔ اس کے باپ کی محنت کی کمائی اس کے جہیز کی صورت میں یہاں گل سڑ رہی تھی مگر یہاں پروا کسے تھی۔ عائشہ نے آنکھیں پونچھ کر کمروں کو تالے لگائے اور اپنا ارادہ دل ہی دل میں مزید پختہ کر کے وہاں سے چلی آئی۔ شدید سرد شام میں اس کا دل بری طرح سلگ رہا تھا اور وہ اس سلگتے دل کو قرار دینے میں ناکام ہو رہی تھی۔

☆☆☆

کوئی چھبیس ستائیس سال پہلے عائشہ اور نورالدین کی شادی ہوئی تھی۔ نورالدین انگلینڈ میں سیٹ تھا، وہیں پر تعلیم مکمل کی اور پھر وہیں پر اچھی نوکری مل گئی تو انگلینڈ کا ہی ہو کر رہ گیا۔ واپسی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ شادی کے بعد اپنی فیملی کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھنے کا ارادہ تھا۔ نورالدین کی باقی فیملی ماں، باپ، بہن بھائی سب لاہور میں تھے۔ عائشہ کی فیملی بھی لاہور میں ہی تھی۔ نورالدین کا خاندان بہت بڑا تھا یہ لوگ سات بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ تینوں بہنوں اور پانچ بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

اب نورالدین کی ہونے جا رہی تھی اس کے بعد ایک بھائی اور تھا۔ نورالدین کا رشتہ عائشہ کے گھر والوں کو ہر لحاظ سے اچھا لگا۔ ہاں مگر اس کے باقی خاندان والوں کا انداز اور طرز زندگی تھوڑا روایتی سا لگا مگر پھر یہ سوچ کر کہ عائشہ نے کون سا یہاں رہنا ہے، ان لوگوں کو ہاں کر دی گئی۔ نورالدین تین مہینے کی چھٹی پر پاکستان آیا تھا اور اسے شادی کر کے واپس جانا تھا۔ شادی کی تاریخ طے ہوئی تو ایک دن نورالدین کے ماں باپ، بڑا بھائی اور بھابھی عائشہ کے یہاں آئے۔

''ہم لوگوں نے سوچا کہ کچھ ضروری امور طے کر لیے جائیں۔'' نورالدین کے والد صاحب نے کہا۔

''جی...... جی...... ضرور۔'' عائشہ کے ابو کو کچھ عجیب لگا مگر رواداری کا مظاہرہ کر گئے۔

''دیکھیں جی ہماری برادری میں جہیز لینے اور دینے کا بہت رواج ہے۔ ہم لوگ شاندار بری اور زیورات لائیں گے۔ چالیس تولے سونا چڑھا رہے ہیں ہم عائشہ کو اور کپڑے اور دیگر سامان الگ۔'' اب کے نورالدین کی ماں بولی۔

''جی۔'' عائشہ کے ابو کی کچھ کچھ سمجھ میں آرہا تھا کہ شاید وہ لوگ جہیز کے لیے کوئی بڑی ڈیمانڈ کرنے آئے ہیں۔ خیر وہ بھی صاحب حیثیت تھے۔ بیٹی کو دینے کے معاملے میں کوئی کمی نہ کرتے۔

''ہم چاہتے ہیں کہ آپ عائشہ بیٹی کو پورا جہیز دیں۔ ہمارے ہاں بہو کے جہیز کی نمائش کی جاتی ہے۔ سارا شریکا آکر سامان دیکھتا ہے۔ کوئی کمی بیشی نہیں ہونی چاہیے ورنہ ہماری بہت بے عزتی ہوگی۔'' نورالدین کے ابو نے کہا۔

''مگر عائشہ نے تو یہاں رہنا ہی نہیں تو پھر سامان کیوں؟'' عائشہ کے امی ابو متامل ہوئے۔

''دیکھیں جی، ہمارا گھر تو پہلے ہی سامان سے بھرا پڑا ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے اللہ کے فضل سے لیکن شریکے کا منہ بند کرنے کے لیے یہ سب تو کرنا پڑتا ہے نا۔''

''ہمیں جہیز دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہے مگر یہ سامان دینے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ عائشہ سامان ساتھ تو نہیں لے جائے گی اور آپ لوگ بھی اسے استعمال نہیں کریں گے تو یہ سامان ضائع ہی ہوگا۔ اس سے بہتر ہے میں عائشہ کو کیش دے دوں۔'' عائشہ کے ابو نے دانش مندی سے کہا۔

''ارے نہیں بھائی جان! آپ لوگ ہمیں کیا ایسا ویسا سمجھ رہے ہیں۔ رب کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس، زمینیں روپیہ پیسہ۔ بس برادری کے رواج ہیں جن پر عمل کرنا پڑتا ہے۔'' نورالدین کے ابو نے ذرا سختی سے کہا۔ انھیں کیش والی بات بہت ناگوار گزری تھی۔ نورالدین کی بھابھی پہلو پر پہلو بدل رہی تھی۔ وہ ایک پڑھے لکھے اور روشن خیال خاندان سے تھی جسے اپنے سسرال کے بہت سے رسم و رواج آگ لگا دیتے تھے مگر ماحول ایسا تھا کہ منہ سے دھواں نکالنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ اب بھی وہ عائشہ کے ابو کی تائید کرنا چاہتی تھی مگر اس کے شوہر کریم الدین نے اسے گھور کر چپ رہنے کی تاکید کی تھی۔ خیر عائشہ کے ابو کو مانتے ہی بنی۔

''ابو جب میں نے یہاں رہنا ہی نہیں۔ سامان ساتھ لے جانا ہی نہیں تو پھر پیسوں کا یہ زیاں کیوں؟'' عائشہ کو پتا چلا تو وہ ابو سے ناراضی کا اظہار کرنے لگی۔

''بچے رواج ہے اُن کا۔''

''اچھا رواج ہے لڑکی والوں کا اتنا پیسہ ضائع کروا دو۔ بس خاندان میں اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے۔'' سوچوں کی بپھری لہریں اس کے گرداب بنا رہی تھیں اور وہ خس و خاشاک کی طرح ان میں ڈوب رہی تھی مگر کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔

عائشہ اور نورالدین کی شادی ہوگئی۔ عائشہ کے لیے مقام حیرت تھا۔ ولیمے سے اگلے روز اس کے جہیز کا سارا سامان ان کے گھر کے بڑے سے لان میں لگایا گیا تھا اور پورے خاندان نے یہ سامان دیکھا۔ اس پر تبصرے کیے۔ کون سی چیز کس برانڈ کی ہے سب نے نوٹ کیا۔ کچھ نے سراہا، کچھ نے کیڑے نکالے اور اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔

نورالدین کے ابا کا گھر بہت بڑا تھا۔ تین شادی شدہ بیٹے جو ساتھ ہی رہتے تھے۔ دو اپنی نوکریوں کے سلسلے میں اسلام آباد میں رہتے تھے۔ گھر سامان اور افراد سے بھرا ہوا تھا۔ عائشہ کا سامان رکھنے کی بالکل گنجائش نہیں تھی۔ سو اگلے روز اس کا سارا سامان پیک کر کے گھر کے پچھواڑے میں بنے ہوئے ان دو اسٹور نما کمروں میں ٹھونس دیا گیا جو شاید اسی مقصد کے لیے بنوائے گئے تھے۔

چھ ماہ بعد عائشہ انگلینڈ چلی گئی لیکن یہ پھانس دل میں ساتھ لے کر گئی کہ جب ضرورت نہیں تھی تو پھر یہ سب سامان لے کر ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ نورالدین سے بات کی تو اس نے اپنی بے بسی

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

دستِ کوزہ گر

فوزیہ یاسمین

قیمت -/750 روپے

[illegible] 37 [illegible] 32735021

کا اظہار کیا۔ ہاں عائشہ نے اس سے یہ وعدہ ضرور لے لیا کہ جب اللہ انھیں اولاد دے گا اور جب ان کی شادیوں کا وقت آئے گا تو وہ یہ سب نہیں کریں گے۔ ہر چار پانچ سال بعد جب بھی عائشہ اور نورالدین پاکستان آتے تو عائشہ یہ دونوں کمرے چند منٹوں کے لیے ہی سہی ضرور کھولتی تھی ورنہ وہ کمرے یوں ہی بند رہتے تھے۔

☆☆☆

اب عائشہ اور نورالدین اپنے بڑے بیٹے کی شادی کے سلسلے میں پاکستان آئے تھے۔ دونوں اپنے وعدے پر قائم تھے۔ عائشہ نے نورالدین کے خاندان سے باہر نورالدین کے دوست کی بیٹی کو پسند کیا تھا۔ جو سفید پوش مگر وضع دار اور سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔

”نورالدین! چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں، لڑکی والوں کو اپنے رواجوں کے بارے میں تفصیل سے بتا دوں گا۔ تم تو ساری زندگی باہر رہے ہو تمہیں کیا پتا ہوگا بھلا۔“ شام کو سب اکٹھے بیٹھے تھے جب نورالدین کے ابا نے کہا۔

”جی ابو میں ساری زندگی باہر رہا ہوں اور ان شاء اللہ آگے بھی مجھے اپنے بچوں کے ساتھ باہر ہی رہنا ہے تو میں اپنی باری پر جب میرے پاس اختیار ہے میں ان فضول رواجوں کو ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔“ نورالدین کی آواز تھی کہ کوئی گنگ کر دینے والی چیز سب ایک دم سے خاموش ہو گئے۔ عائشہ کی بڑی جیٹھانی نے پہلے خوشی سے نورالدین کو اور بعد میں جتاتی نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا جس نے اپنے دونوں بیٹوں کی شادیوں میں بیوی کی مخالفت کے باوجود بھی ان رسموں کو نبھایا تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو باتوں میں تو آپ کے لیے آسمان سے چاند تارے بھی توڑ لاتے ہیں مگر جب وقت پڑتا ہے تو ہاتھ چھڑا کر دور جا کھڑے ہوتے ہیں۔ بیٹوں کی شادیوں میں اس نے بیوی کے ساتھ یہی رویہ اپنایا تھا۔

”تو خاندان میں ہماری ناک کٹوائے گا؟“ ابا پھنکارے، گویا خدانخواستہ سچ میں ان کی ناک کٹ جائے گی۔

”تو سامان لے کر ضائع کرنے سے ہماری ناکوں میں کتنا اضافہ ہو جائے گا بھلا! اگر اضافہ ہونا ہوتا تو اب تک ہم لوگوں نے ان رواجوں کو جتنا نبھایا ہے، ہم سب کی ناکیں ہاتھی کی سونڈ جتنی لمبی تو ضرور ہو جانی چاہیے تھیں۔“ نورالدین نے آخر میں ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو نئی نسل کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مگر بڑوں کے چہروں کے زاویے مزید بگڑ گئے۔

”نور میں اس فیصلے میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ بڑی بھابھی نے آوازِ حق بلند کر دی۔

”ہم سب میں سے کسی کو تو اسٹینڈ لینا تھا مجھے خوشی ہے یہ سعادت تمہارے حصے میں آئی ہے۔“ اُنھوں نے سب کی طرف ایک نظر ڈال کر اپنی پوری توجہ نورالدین کی طرف کر لی۔

”جی بھابھی! ہم خاندان کے ان غلط رواجوں کو اپنی باری آنے پر ختم کرنے کی کوشش کرنے کے بجائے خود کو مجبور ظاہر کر کے انھیں بڑھاوا دیں گے تو اصلاح کیسے ہو گی؟“ عائشہ نے بھی کہا۔ اس کی آنکھوں میں اُمیدیں جھلملا رہی تھیں۔

”ہاں تم لوگ تو چلے جاؤ گے مگر خاندان والوں کی باتیں تو ہم کو ہی سننا پڑے گی نا۔“ نورالدین کی اماں اگرچہ بہت بوڑھی ہو گئی تھیں مگر آواز ابھی بھی دبنگ تھی۔ اب اس عمر میں لوگ ان کو باتیں سناتے، یہ بات انھیں ہرگز منظور نہیں تھی۔

”تو آپ مت سنیے گا یہ باتیں، جو بھی کوئی بات کرے نا آپ کہیے گا جنھوں نے یہ کام کیا ہے وہ یہاں نہیں ہیں تو بات کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر بات کرنا پھر بھی ضروری ہے تو انگلینڈ تشریف لے جائیں۔ پھر دیکھیے گا کوئی آگے سے ایک بھی لفظ نہیں کہے گا۔“ نورالدین نے بات کو ختم کرتے ہوئے حتمی انداز اختیار کیا۔

☆☆☆

سب کے سمجھانے، ڈرانے اور لڑائی جھگڑے کے باوجود نورالدین اور عائشہ اپنے فیصلے سے ایک تو کیا آدھا انچ بھی پیچھے نہ ہٹے اور سیانے کہتے ہیں کہ فیصلے کی گھڑی میں مقدر چھپا ہوتا ہے۔ اُنھوں نے یہ فیصلہ کر کے اپنی اگلی نسلوں کا مقدر بدلنے کی کوشش کی تھی۔ بڑی بھابھی کے علاوہ ساری کی ساری نوجوان نسل ـــــ ان کے ساتھ کھڑی تھی۔ آخر جیت انھی کی ہوئی اور نورالدین اپنی شرائط پر بہو بیاہ لائے۔

”ہائے ہائے کن بھوکوں ننگوں میں بیٹا بیاہا ہے نورالدین نے۔“

”لڑکے کی پسند وسند کا چکر ہوگا۔ ایسے کون دو کپڑوں میں بیٹی رخصت کرتا ہے۔“

”نورالدین تو انگریزوں میں رہ کر انگریز ہی ہو گیا ہے۔ ہمارے خاندان میں بھلا ایسی شادی کبھی ہوئی ہے۔“

جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ کچھ کانوں میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ کچھ اتنی بلند آواز میں کہ عائشہ کے کانوں میں پڑ جائے۔ بہت سے لوگوں کے جلے کٹے جملے عائشہ کی سماعتوں تک پہنچے تھے مگر اس نے پروا نہ کی۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ ایک تو وہ بغیر جہیز کے بہو بیاہ کے لائی تھی۔ دوسرا یہ کہ اپنے خاندان کی ایک فضول رسم کو اس نے ”اپنی باری“ آنے پر ختم کیا تھا۔ خوشیاں رنگ برنگے خوش نما پرندوں کی طرح اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے اس کے آنگن میں اتر رہی تھیں۔ اس کا چہرہ یوں روشن تھا جیسے اس پر قوس قزح کے سات رنگوں کا اُجالا اُتر آیا ہو۔ وہ اپنے اللہ کی بہت شکر گزار تھی۔

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
شائع ہو گئے ہیں

☆ فصلِ غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	قیمت: -/300 روپے
☆ زرد موسم	راحت جبیں	قیمت: -/1000 روپے
☆ حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	قیمت: -/400 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبۂ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

بیوٹی بکس کا تیار کردہ
Herbal
سوہنی شیمپو
SOHNI SHAMPOO
اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم
گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
قیمت -/120 روپے
رجسٹری سے منگوانے پر منی آرڈر سے منگوانے والے
دو بوتلیں -/300 روپے تین بوتلیں -/400 روپے
اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔
بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ
بیوٹی بکس 53، اورنگزیب مارکیٹ ایم اے جناح روڈ، کراچی۔
دستی خریدنے کے لیے:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

رخسانہ نگار عدنان

شاکی ہوتی ہیں

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بددعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی۔ ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا اسے پڑوسی چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تا کہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہ تیز برستی بارش میں اس کا ایکسڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میرو خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یادیں ہیں جو اسے گھیرے ہوئی ہیں۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میرو اسے منا لے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ سہیل اپنے طور پر پتا کروا لیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آ جاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہیں کہ کیا ہوا ہے اور وہ کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میرو دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میرو شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیخنا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے [illegible] جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میرو کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آنی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر زینب سے ملتا ہے تو اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آ جاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پرتکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔

کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔

زینب بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔

ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں۔ جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت سناتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔

آذر جبران سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، ردا غصے سے باہر نکل جاتی ہے۔

موحد کو زینب ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔

میرو جیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کر لے جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔

ساتویں قسط

وہ آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت لیے بس اسے دیکھے جا رہی تھی۔

وہ اس کے جواب کا منتظر تھا۔

اس نے گہرا سانس لے کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے زینب؟" حیدر آخر میں غصہ کو دباتے ہوئے جھلا کر رہ گیا۔

"یہ میں خود۔۔۔ جانتی ہوتی تو اتنی پریشانیوں سے کیوں گزرتی۔" وہ سادگی سے بولی۔ جس میں بے بسی کراہ رہی تھی۔

لمحہ بھر کو حیدر کچھ بول ہی نہ سکا۔

"خیر، یہ تو ایک لمبی بحث ہے اس میں مجھے اس وقت نہیں پڑنا لیکن یہ اپنے دماغ میں بٹھا لو کہ تمہیں اس گولڈن چانس کو مس نہیں کرنا۔" اس کا لہجہ قطعی تھا۔ کچھ دیر زینب جیسے دل میں اس کا جواب، ٹھوس جواب تلاشتی رہی۔

"تمہیں اعتراض کیا ہے اس وزٹ کے لیے؟" حیدر نے اس دفعہ قدرے نرمی سے پوچھا۔

"اعتراض تو کوئی نہیں لیکن میں جانا نہیں چاہتی پھر کشف کا بھی مسئلہ ہے، پورے دس دن کے لیے تو میں اسے اکیلا چھوڑ کر شہر ہی نہیں ملک سے باہر نہیں جا سکتی حیدر بھائی! آپ کو یہ بھی تو سوچنا چاہیے۔" بہت مشکل سے وہ یہ ایک توجیہ ڈھونڈ پائی تھی حیدر نے کوفت سے اسے دیکھا۔

"یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے زینب! کشف میرے گھر بھی رہ سکتی ہے۔ میرے حوالے سے نہ سہی، وہ کشف کی نانی کا بھی تو گھر ہے۔ تمہاری سگی خالہ ہیں میری اماں، کچھ تو حق بنتا ہے نا!" حیدر جتاتے جتاتے کچھ تلخ ہو گیا۔

"وہ خالہ جن کا خود اپنا بھی حق نہیں اس گھر پہ۔" وہ صرف دل میں ہی سوچ سکی۔

"میں اس سے انکار نہیں کر رہی لیکن میں جانتی ہوں کشف نہیں مانے گی۔ اس کے لیے۔" وہ جلدی سے ایک اور بودا بہانہ گھڑ لائی۔

"اس کو منانا تم مجھ پر چھوڑ دو، میں اس سے بات کرلوں گا، تم مجھے اپنا آئی ڈی کارڈ اور کچھ ڈاکومینٹس لا دو ارجنٹ تمہارا پاسپورٹ بنوانا ہوگا، ویسے تین دن لگ جائیں گے۔ ویزے کا تو مسئلہ نہیں ہے کینیڈا میں رہائش ہوٹل پک اینڈ ڈراپ طاہر بھائی کی کمپنی ارینج کر رہی ہے یہ سب کچھ۔ وہی اس انٹرنیشنل مشاعرے کو اسپانسر بھی کر رہے ہیں۔" وہ جلدی جلدی اسے تفصیل بتانے لگے جو پچھلے ایک گھنٹے میں تین بار دہرا چکے تھے۔

"پلیز حیدر بھائی! یہ میرا مزاج نہیں ہے۔" وہ عاجزی سے بولی۔

"کب تک خود کو تنہائی اس خود ساختہ اکیلے پن کی سزا دو گی تم؟" انہیں غصہ آ گیا ایک دم سے۔

"کیوں، میں کیوں خود کو سزا دینے لگی۔ میرا مزاج نہیں ہے، میں سوشل نہیں ہوں۔ لوگوں میں گھلنا ملنا، خواہ مخواہ کی خوش اخلاقی جھاڑنا مجھ سے نہیں ہوگا یہ سب کچھ۔" وہ بھی تپ گئی۔

"اپنی خوش قسمتی پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے ناشکرا پن کر کے ناقدری کر رہی ہو تم اس سنہری موقع کی۔" وہ تاسف سے اس کا سرخ چہرہ دیکھتے ہوئے بولے اس نے منہ پھیر لیا۔

"مجھے یہ گمنامی، یہ گوشہ نشینی عزیز ہے۔ میں اس میں خوش ہوں بہت۔" وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد حیدر کی خفگی کے خیال سے خود ہی بولی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔

"اب کیا دیکھ رہے ہیں ایسے؟" وہ اس کی نظروں سے خائف ہو کر جھلائی۔

"تم ابھی بھی اتنی خود غرض ہو زینب! جتنی سالوں پہلے تھیں۔" ان کے لہجے میں عجیب سا دکھ بولا تھا۔

زینب کے دل پہ جیسے کسی نے مکا جڑ دیا ہو۔

"میں خود غرض ہوں...... میں؟" وہ تڑپ اٹھی تھی۔

"نہیں۔ شاید غلط بول گیا میں تمہارے سر پر تو باقاعدہ بے غرضی، بے لوثی کا تاج ہے تو میں اتنا بڑا الزام تمہیں کیسے دے سکتا ہوں لیکن یہ حقیقت ہے زینب! تم اس وقت صرف اپنے مزاج کی بے آرامی اپنی مرضی کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو۔ کشف کی خوشیاں، اس کا فیوچر سب کچھ۔"

حیدر نے بالکل ٹھیک جگہ نشانہ لگایا تھا۔

"کشف...... کشف کا یہاں کیا ذکر...... اور میں اللہ نہ کرے میں کشف کی خوشی یا اس کے مستقبل کو داؤ پر لگاؤں۔ آپ یا کوئی بھی ایسا سوچ کیسے سکتا ہے۔" وہ تیز لہجے میں خاصا اونچا بولی تھی۔

"اگر تمہیں اس کا خیال ہوتا تو تم یوں ضد نہ کر رہی ہوتیں۔ وہاں جانے سے منع نہ کر رہی ہوتیں۔ صرف شہرت نہیں اچھا معاوضہ بھی ملے گا تمہیں۔ وہاں جانے سے بین الاقوامی طور پر پہچانی جاؤ گی تو آئندہ آنے والے دنوں میں ایسے بہت سے مواقع پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔ تمہارے لیے نئے رستے کھلیں گے صرف نام اور شہرت کے ہی نہیں مالی طور پہ بھی بہت فائدے مل سکتے ہیں۔ تمہیں یہ خیال کیوں نہیں آتا؟" وہ تیزی اور جھلاہٹ میں اس پہ باقاعدہ ناراض ہو رہے تھے۔

"اس دعوت نامے کو لات مار کر تم صرف اپنے فیوچر ہی سے نہیں کشف کے روشن مستقبل سے بھی کھیل جاؤ گی۔ تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ گمنامی کچھ نہیں دیتی۔ شاعر ادیب کے ہنر کو قطرہ قطرہ موت ہی نہیں دیتی اسے معاشی طور پر حالات کے سامنے بے بس کر دیتی ہے، آج کل کے دور میں جب لوگ خود اپنی اتنی پروجیکشن کرتے ہیں، عام سے لکھنے والے، شعر کہنے والے ناموری کے لیے کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں شاید تم نے کبھی خواب میں بھی سوچنے یا جاننے کی کوشش نہیں کی۔" وہ تیز تیز بولتا جا رہا تھا۔

"مجھے ضرورت بھی نہیں یہ اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کی خود کو مشہور کرنے کے لیے۔" وہ منہ میں بڑبڑائی۔

"یہ ضروری ہے زینب! تم سمجھتی کیوں نہیں اگر تم میں ٹیلنٹ ہے تو اس کا پتا چلنا چاہیے۔ ان لوگوں کے لیے یہ بہترین جواب ہوتا ہے جو سفارشی پرچی یا اپنی خود ساختہ مشہوری کے بل بوتے پر اوپر آتے ہیں۔ اپنی چرب زبانی سے خود اپنے دام بڑھواتے ہیں۔" حیدر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ، اس کی ضد کو کیسے توڑے۔

"جب مجھے ان چیزوں سے کچھ غرض ہی نہیں تو مجھے کیا پرواہ کون خود کو کس طرح سے پروموٹ کروا رہا ہے کیش کروا رہا ہے حیدر بھائی! بہتے پانی کا رستہ کوئی نہیں روک سکتا تو پھر اس بے کار کی خود نمائی کی کیا ضرورت ہے۔" وہ کسی بھی طرح سے ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"بہتے پانی کے لیے رستہ متعین کرنا بھی ضروری ہے یا نہیں؟" وہ چڑ کر بولے۔

"وہ اپنا رستہ خود بنا لیتا ہے۔" وہ اسی ہٹ دھرمی سے بولی۔

"اف!" حیدر کا جی چاہا، وہ اپنا سر کسی دیوار سے پھوڑ لیں۔ اسی وقت کشف چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے اندر آ گئی۔

"حیدر انکل! ان مذاکرات کا کچھ نتیجہ نکلا؟" وہ ماں کے سخت چہرے کو دیکھ کر جیسے مزا لے کر بولی۔

"پیوستہ رہ شجر سے، امید بہار رکھ۔" بلال اندر آتے ہوئے شوخی سے بولا۔

"اتنی لمبی امیدیں نہیں اور بہار کا موسم ہنوز دور تو خود کیوں نہ کوشش کی جائے جناب!" کشف ماں کی طرف دیکھ کر بولی اور پھر ہاتھ میں پکڑا لفافہ حیدر کی طرف بڑھا کر ماں کی بے چینی دیکھنے لگی۔

"آنی کا آئی ڈی کارڈ اور ریجنل اور دوسرے ڈاکومینٹس سب اس میں موجود ہیں اور بھی کچھ چاہیے ہوگا تو آپ مجھے بتا دیجیے گا۔ میں آپ کو پہنچا دوں گی۔

آنی! آپ کو شہرت کی ضرورت ہو یا نہیں آپ کی بیٹی کو ہے ضرورت۔ شہرت کی نہ سہی اپنی پہچان کی۔"

وہ اس کے گھٹنے کے پاس دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔

"اور پہچان حاصل کرنے کے لیے میرا دل کہہ رہا ہے آپ کا کینیڈا جانا اس سیڑھی کا پہلا قدم ہوگا ان شاءاللہ" اس کی آنکھوں میں کوئی ایسا شدید جذبہ تھا کہ زینب چاہتے ہوئے بھی انکار نہیں کر سکی۔

اس کے ڈاکومینٹس حیدر کو دینے پر کشف کو جھاڑ نہیں سکی۔

اندر کہیں دل کے نہاں خانوں میں حیدر کی یہ دلیل جم کر بیٹھ گئی تھی کہ اپنے لیے نہ سہی اسے کشف کے فیوچر کے لیے یہ قدم لازمی اٹھانا ہوگا۔

وہ خاموشی سے چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگائے کچھ سوچتے ہوئے پینے لگی تو ان تینوں نے بھی اس کی خاموشی کو رضا مندی جان کر سکھ بھرا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

"گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے ایمان۔" موحد کے لیے یہ خبر کسی کرنٹ سے کم نہیں تھی۔ وہ بے چین سا اٹھ کر کھڑا

ہو گیا۔

وہ منصور سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے گزرے سالوں میں حتی الامکان کوشش کی کہ وہ کبھی میر منصور کے ساتھ ڈائریکٹ خود سے بات نہیں کرے اگر ایسی کوئی نوبت آتی بھی تھی تو وہ اس سے نظریں چرا لیتا تھا۔

اور اس وقت کانوں میں اترتی منصور کی تھکی ہاری پژمردہ آواز سے اپنی سماعتوں کو بچانا موحد کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

"تمہاری ماں کی حالت بھی اچھی نہیں۔ استھما کا اٹیک اس بار بہت شدید ہوا ہے اور وہ تین دن ہاسپٹل میں ایڈمٹ رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اسے کیسے تسلی دوں۔ حالت بہتر ہو جائے گی۔" اس کے لہجے میں بہت سے کانچ ٹوٹ رہے تھے مگر اس سے زیادہ کرچیاں موحد کے دل میں پیوست تھیں۔

اس ٹوٹے ہوئے شخص پر اسے اس گھڑی بھی ذرا ترس نہیں آیا۔

"میں نے ایما کو کال کی تھی، اس نے میری کال نہیں لی۔ کیا کوئی بڑا جھگڑا ہوا تھا گھر میں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس گھر کے اندرونی معاملات میں دلچسپی لینی پڑ رہی تھی جن سے بھاگ کر وہ ساری دنیا میں چھپتا پھر رہا تھا۔

"کچھ خاص نہیں۔ تمہیں اس کے مزاج کا پتا تو ہے، وہ ذرا سی بات پر کس طرح ری ایکٹ کرتی ہے۔" منصور کی بے بسی موحد کے دل پر ہولے ہولے ضرب لگاتی جا رہی تھی۔ اگرچہ یہ ضرب صفر کے ساتھ کھاتے ہوئے نتیجہ صفر ہی نکل رہا تھا مگر یہ صفر اعداد کی دنیا میں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت معنی رکھتا تھا۔ ایک کے ساتھ لگتا تو اس کی قیمت دس گنا بڑھا دیتا ہے، دو ساتھ لگے یا دس کے ساتھ اپنی بے وقعتی کے باوجود وہ ہندسوں کی قیمت آسمان تک لے جاتا ہے اور یہی اس وقت موحد کو محسوس ہو رہا تھا۔ صفر سے ضرب کھاتا منصور کا ٹوٹا لہجہ اس کے دل میں کہیں نہ کہیں سوراخ کرتا جا رہا تھا۔

"وہ ذرا سی بات کون سی تھی؟" غیر ارادی طور پر اس کا لہجہ ترش ہوا۔ منصور ایک دم سے خاموش ہو گیا۔

اب وہ موحد کو کیا بتاتا کہ جس بیٹی کی ذرا سی خوشی، ذرا سی خواہش کی وہ کتنی بے دردی سے کتنے ارمانوں کو روندتا رہا ہے، جس میں سرفہرست موحد کی خواہشیں ہوتی تھیں، اب وہ کس منہ سے کہے وہ ذرا سی بات!

"تم آ نہیں سکتے؟" یکایک منصور کا لہجہ منت بھرا ہوا۔

"فوراً تو نہیں آ سکتا ناں۔" وہ کوئی بھی جھوٹا دلاسا نہیں دینا چاہتا تھا۔ منصور لحہ بھر کو خاموش رہ گیا۔

"کہیں دیر نہ ہو جائے۔" موحد کی سماعتوں نے اس کی مایوس بڑبڑاہٹ سنی تھی۔ اس کے دل کو بھی کچھ ہوا لیکن وہ واقعی فوراً سب کچھ چھوڑ کر نہیں آ سکتا تھا۔

"آپ جائیں، اس سے بات کریں۔ جس بھی شرط، جس بھی کنڈیشن پر وہ مانتی ہے، اسے راضی کریں۔" موحد نے اپنے تئیں منصور کو رستہ دکھایا۔

"اگر وہ میری شکل ہی نہیں دیکھنا چاہتی، میری بات ہی نہیں سننا چاہتی تو میں کیا کروں۔ اس سے کس شرط کا مطالبہ کروں پھر؟"

موحد پر جیسے حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

ایمان منصور اپنے باپ کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ اس سے بات نہیں کرنا چاہتی شاید یہ اس صدی کی سب سے بڑی بریکنگ نیوز تھی موحد کے لیے۔

"ایسا کیسے ممکن ہے۔" وہ خود کو بولنے سے روک نہیں پایا۔

"پچھلے دنوں ایک لڑکا ہے۔ شاید اس کا بی ایف ہے۔ اچھا لڑکا نہیں۔ میں نے ایما کو منع کیا اس سے ٹرم بڑھانے سے۔ شاید میں بھی تھوڑا سا ریش ہو گیا تھا۔" موحد کو لگا منصور نے آنسو اپنے گلے میں اتارے ہیں۔

"کچھ بھی تھا۔ اس نے موبائل بلوائی اور ایک رات مجھے سیل میں۔" اس سے زیادہ وہ شاید ہمت نہیں دکھا سکا تھا۔ اور موحد تو جیسے سکتے میں تھا۔ کوشش کے باوجود وہ کچھ نہیں بول پایا۔

نہ ہمدردی اور تسلی کے دو بول نہ دکھ اور افسوس کا اظہار!

اس وقت اس سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس شخص کے لیے جسے اس نے کبھی پسند نہیں کیا تو اسے تو پھر خوش ہونا چاہیے کہ اس کی اپنی بیٹی نے اس کو حوالات میں بند کرا دیا۔

تو وہ خوش بھی نہیں ہوا تھا، کہیں دل کے کسی کونے میں ایسی خوشی کی تمنا تھی۔ سالوں پہلے مگر اب جب وہ لمحہ آیا تو وہ ذرا سا بھی خوش نہیں ہو سکا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔ تمہیں یہ سن کر کچھ خاص افسوس نہیں ہوا ہو گا اور پھر یہ سب یہاں کی سوسائٹی میں بہت معمول کی بات ہے۔ ہم جیسے سو کالڈ ویلیوز رکھنے والے والدین کو اپنی آزادی، اپنی ترقی کی کچھ تو قیمت چکانی ہی پڑتی ہے۔"

موحد کو لگا، میر منصور خود کو تسلی دے رہا ہے۔ خود اپنے زخم پر مرہم لگا رہا ہے۔ وہ شاید بھول چکا تھا کہ وہ موحد سے بات کر رہا ہے۔

"ماں نے کچھ نہیں کہا اس سے؟" تلخ لہجے میں ایک اور دکھ دینے والے رشتے کا نام اس کی زبان سے پھسلا تھا۔

"وہ جو کر سکتی تھی۔ اس نے کیا۔ مجھے سیل سے نکلوا لائی۔ ایما کو مجھے معاف کرنے پر راضی کر لیا۔ یہ کیا کم ہے۔"

موحد نے اندازہ لگایا۔ اس اندوہناک واقعے کو شاید بہت دن گزر گئے ہیں جو میر منصور نے اپنے اندر یہ سب کچھ کہنے کا حوصلہ پیدا کر لیا کہ وہ کہیں بھی، کسی بھی تفصیل پر ہمت نہیں چھوڑ بیٹھا تھا۔

"ماں کو ابھی کچھ دیر میں کال کرتا ہوں میں۔ آپ بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کریں۔ آپ کی بات بہرحال وہ سب سے آسانی سے سمجھ جاتی ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں ایمان سے کانٹیکٹ کرنے کی اور۔" وہ بولتے بولتے رک گیا۔

اب کیسے کہتا کہ آپ بھی حوصلہ رکھیں۔ سب کچھ ٹھیک نہ بھی ہوا تو بہتر ہو جائے گا۔ کبھی کسی زمانے میں موحد نے قسم کھائی تھی وہ اس شخص میر منصور کے لیے زندگی میں کہیں کوئی آسانی پیدا نہیں کرے گا۔ کبھی اسے کوئی سہولت خود سے نہیں دے گا تو وہ کیوں اس کو تسلی یا دلاسے کی آسائش مہیا کرتا۔

"خدا حافظ!" منصور کو تسلی کی آسائش، فراہم نہ کرنے کی قسم کو اس نے خلوص سے نبھایا اور فون بند کر دیا۔

اور یہ الگ بات کہ پھر وہ پوری رات ایک لمحے کے لیے سکون کی نیند نہیں سو سکا تھا اور صبح دم اسے پہلے پچھتاوے نے گھیرا کہ وہ اس ٹوٹے ہارے شخص کو تسلی کا ایک جملہ ہی بول دیتا تو اس کی رات کانٹوں پر بسر نہیں ہوتی۔

☆☆☆

"بھول جاؤ مجھے۔ اب اس کہانی میں کچھ بھی باقی نہیں ہے۔" روا ٹوٹے ہوئے لہجے میں دوسری طرف موجود جبران سے کہہ رہی تھی۔

”تم کہہ رہی ہو، اس کہانی میں کچھ نہیں بچا۔ تم نے ہی تو مجھے اس کہانی میں شامل کیا تھا۔“ وہ تڑپ کر بولا۔

”تو میں ہی اس کہانی کو ختم کر رہی ہوں بس۔“ وہ سنگ دلی سے قطعی لہجے میں بولی۔ یہ الگ بات کہ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

”تم اتنی سنگدل کیسے ہو سکتی ہو ردا! مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا۔“

وہ بے یقین تھا۔ اسے یقین دلانا بہت ضروری تھا۔ صرف یہ ردا کے لیے ضروری نہیں تھا، جبران کے لیے بھی اہم تھا کہ وہ اسے بھول کر کوئی نئی کہانی شروع کرے۔

”مجھے تو لگتا ہے جبران! تم نے کبھی مجھ سے محبت کی ہی نہیں تھی ورنہ صرف نہ ملنے کو وجہ بنا کر تم یوں میری بربادی کے لیے گڑھا نہیں کھودتے۔“ وہ صاف آواز میں خود کو سنبھال کر کہہ رہی تھی۔

”کیا...... میں نے، میں نے گڑھا کھودا ہے تمہارے لیے؟“ اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

”تو اور کیا کہوں میں، اس روز تم جس طرح مجھے کورٹ لے گئے اگر اللہ زینب آنٹی کی شکل میں ہمیں مد نہیں بھیجتا تو شاید اس وقت میں تو تمہیں مل چکی ہوتی لیکن میں اپنے ماں باپ کو، ان کی محبتوں کو، ان کی رضامندی کو کھو چکی ہوتی اور مجھ سا بدنصیب اس روئے زمین پر کوئی نہیں ہوتا۔“ وہ پھولے سانسوں کے ساتھ کہتی جا رہی تھی۔

”تمہیں اللہ کا واسطہ ہے۔ اب بس کرو، ختم کر دو اس قصے کو۔ بار بار مجھے میرے ایک ہی زخم پر چوٹ نہیں لگاؤ جبران! میں بھی جیتی جاگتی انسان ہوں مت اتنا درد دو مجھے کہ میں سہہ نہ سکوں۔ خدا کے لیے بھول جاؤ مجھے اور بھول جانے دو مجھے بھی۔“

اس کے ضبط کی ساری طنابیں آج اس کے ہاتھوں سے چھوٹ رہی تھیں۔ وہ اتنے دنوں سے اسے میسج فون کیے جا رہا تھا۔ وہ تو جیسے پل صراط جیسی دودھاری تلوار پہ چل رہی تھی۔

کئی بار اس نے خود کو ختم کرنے کا سوچا مگر پھر رشتوں کی زنجیریں اس کے ارادوں کو کمزور کر دیتیں۔

آج اس نے حتمی فیصلہ کرتے ہوئے جبران کی آخری بار کال اٹینڈ کی تھی اور پھر جیسے خود بھی ٹوٹ گئی روتے ہوئے فون بند کر کے مڑی اور پیچھے کھڑی ماں کو دیکھ کر اس کے آنسو بھی بہنا بھول گئے۔

سونیا کی آنکھوں میں اس کے لیے کیا نہیں تھا۔

اس کی گیلی پلکیں خود بخود لرزتے ہوئے جھک گئیں۔

سونیا نے فون اس کے ہاتھ سے کسی چیل کی طرح جھپٹا مار کر چھینا تھا اگرچہ وہ ایسا نہ بھی کرتی، ردا سے یونہی کہتی تو وہ بخوشی فون اسے دے دیتی۔

”تم تو میرے لیے سرہانے کا سانپ بن گئی ہو، جب تک اس گھر سے رخصت نہیں ہو جاتیں، میں چین کی نیند تو کیا چین کا سانس بھی نہیں لے سکتی۔“ سونیا کے لہجے میں اس کے لیے جو نفرت تھی۔ ایک بار تو ردا بے یقین سی ماں کو دیکھتی رہ گئی۔

”آپ کو چین کی نیند میری بے یقینی نہیں آپ کے دل کا کوئی چور ہو گا جو سونے نہیں دیتا۔“ معلوم نہیں کہاں سے اس کے اندر اتنی ہمت اور اتنی تلخی آ گئی تھی کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بول گئی۔

اور سونیا تو جیسے سن کر ہی پتھر ہو کر رہ گئی۔

دوسرے لمحے اس نے شدید طیش کے عالم میں اسے تھپڑ دے مارا تھا۔

اور پھر خود ہی اپنا ہاتھ روک کر بے اختیار پیچھے پڑے صوفے پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”عمر بھر کی کمائی یہ عزت آبرو ہی تو تھی میرے پاس آج وہ بھی میری اولاد نے کیچڑ بنا کر میرے منہ پر مل دی کہ میرے دل میں کوئی چور ہو گا جو مجھے چین سے سونے نہیں دیتا۔“ پھٹی آواز میں کہتی وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہی تھی۔

ردا کو عجیب سی پشیمانی نے گھیر لیا۔

وہ وہیں کھڑی انگلیاں مروڑتی رہی مگر جانے کون سی طاقت نے اس کے قدم پکڑ لیے تھے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی آگے بڑھ کر روتی ہوئی ماں کو گلے لگا کر دو لفظ تسلی کے نہیں بول سکی۔

سونیا روئے جا رہی تھی اور ردا بے بسی سے ماں کو دیکھتے ہوئے گم صم کھڑی تھی جب آزر کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”کیا ہوا ہے تمہاری ماں کو؟“ اس کی گونج دار آواز نے جیسے سونیا کی ہچکیوں کو زوردار بریک لگائی تھی۔

ردا نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

وہ جانتی تھی، سونیا اب جتنی بھی صفائی پیش کرے گی، آزر نہیں مانے گا کہ اس کے رونے کی وجہ میں ردا شامل نہیں۔

”کیا کروں۔ جھٹ پٹ تو اماں جی نے فیصلہ کر لیا اسے اتنی دور بھیجنے کا۔ خود سے ہی رشتہ بھی طے کر دیا۔ میں نے اسے کبھی اپنے سے ایک رات کے لیے جدا نہیں کیا اور اب سات سمندر پار بھیج دوں۔“ سونیا خود کو سنبھالتے ردا کے حساب سے ایک بہترین کہانی گھڑ چکی تھی۔

”خوش قسمت ہو بے وقوف عورت! جو گھر بیٹھے بیٹی کا اتنا عالی شان رشتہ مل گیا ہے تمہیں۔ بیٹی کے رشتے کے لیے دردر پھرنا نہیں پڑا اور تم یہاں بیٹھی آنسو بہا کر نحوست پھیلا رہی ہو، باہر اماں جان آ چکی ہیں انہوں نے تمہارا یہ رونا دھونا سن لیا تو کھڑے کھڑے یہ رشتہ ختم کر دیں گی۔ بس کرو اب یہ ڈرامے بازی اور باہر آ کر اماں جان سے ملو اور تم بھی۔“ وہ کرخت لہجے میں ساکت کھڑی ردا کو حقارت سے اشارہ کرتے ہوئے کہہ کر باہر نکل گیا۔

سونیا کے آنسو یک بیک خشک ہو چکے تھے۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر ردا کا فون مٹھی میں دبائے آزر کے پیچھے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

پھر ایک ہفتہ گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔

زینب کا پاسپورٹ بن کر آ گیا۔ ٹکٹ بھی کنفرم ہو گیا۔

اور وہ ذہنی طور پر خود کو ابھی تک جیسے تیار ہی نہیں کر پا رہی تھی۔

کشف نے ہی اس کے لیے کپڑوں، جوتوں اور دوسری ضروری چیزوں کی خریداری کر کے پیکنگ کی تھی۔

وہ خود تو جیسے خالی الدماغ پھر رہی تھی۔

اسکول سے اس نے دس دن کی چھٹی لے لی تھی۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر تولیے سے چہرہ رگڑتی باہر نکلی تو بے اختیار چونک گئی۔ کشف سونیا کے ساتھ صحن سے گزر کر اب کمرے کی طرف آ رہی تھی۔

زینب کو قدرے اطمینان سا محسوس ہوا شاید اب کشف کو سمجھانا نسبتاً آسان ہو جائے گا کہ وہ اتنے دن زینب کی غیر موجودگی میں سونیا کی طرف رہ لے۔

”تم آج نہیں آتیں تو میں تھوڑی دیر میں تمہاری طرف نکلنے والی تھی۔“ گرم جوشی سے گلے ملتے ہوئے زینب نے بے ساختہ کہا تو سونیا لمحہ بھر کو کچھ بول ہی نہ سکی۔

پتا نہیں یہ جھجک کب سے اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ وہ کبھی بھی زینب کو خود سے اپنے گھر آنے کا نہیں کہتی تھی اگر کہتی بھی تھی تو ساتھ ہی کوئی اور موضوع چھیڑتے ہوئے بات کو اس طرف لے جاتی تھی کہ اس کی طرف سے دعوت دینے کی حجت بھی تمام ہو جائے اور اس دعوت میں کچھ ایسا اصرار بھی شامل نہ ہو سکے اس لیے شاید زینب سالوں میں کبھی اس کی طرف چکر لگا پاتی تھی۔

آج زینب کے یوں بے ساختہ کہنے پر سونیا کا چونکنا کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

”خیریت تھی نا؟“ اس نے کچھ محتاط لہجے میں پوچھا۔

”ہاں ہاں، بالکل خیریت ہی تھی۔ تم پریشان نہیں ہو، اندر آ کر بیٹھو کشف جان! تم جلدی سے اپنی پھپھو کے لیے اور میرے لیے دو کپ چائے تو بنا لاؤ۔“ زینب کا موڈ خلاف عادت بہت خوش گوار تھا سونیا نے محسوس کیا تھا۔

کشف بھی ہمیشہ کی طرح اکھڑی ہوئی سی اس سے نہیں ملی تھی۔

”لگتا ہے کوئی گڈ نیوز ہے زینب؟“ اس نے پھر سے محتاط لہجے میں زینب سے پوچھا جو اب کھڑکیوں کے پردے ہٹاتی ناکافی روشنی پا کر کمرے کی لائٹس آن کرنے لگی۔

باہر ایک دم سے شام اتر آئی تھی۔

اس پرانے محلے کی تنگ و تاریک گلیوں میں شام ویسے بھی باقی شہر کے مقابلے میں کچھ پہلے ہی اتر آتی تھی۔

”میں ذرا جلدی میں ہوں زینب! زیادہ بیٹھ نہیں سکوں گی اور چائے بھی پھر کبھی ان شاء اللہ۔“ جانے کیوں اس آبائی گھر میں آ کر سونیا کو عجیب سی وحشت گھیرنے لگتی تھی۔

شادی کے اولین دنوں میں بھی جب لڑکیاں بھاگ بھاگ کر میکے آتی ہیں، بہت اصرار کے بعد بھی ماں کی ناراضی کے خیال سے مہینوں بعد چکر لگاتی بھی تو جیسے کرسی کے کنارے پر ہی ٹک کر بیٹھتی بصد اصرار، اگر چائے بنوا بھی لی تو پیالی میں آدھی چھوڑ کر کھڑی ہو جاتی تھی جانے کے لیے۔

”تم ہمیشہ ہی جلدی میں رہتی ہو سونیا یا یہاں آ کر تمہیں اپنے سب ضروری کام یاد آ جاتے ہیں۔“ زینب کے لہجے میں ڈھکی چھپی ناراضی تو تھی، عجیب سا طنز بھی تھا۔

سونیا نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

اور دوسرے لمحے چونک گئی۔

کونے میں ایک درمیانہ سوٹ کیس اور ایک بیگ کہیں جانے کے لیے تیار رکھا تھا۔

”کہیں جا رہی ہو تم؟“ وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی۔

”ہاں!“ زینب متذبذب لہجے میں بولی۔

سونیا کو فوری تفصیل بتانے سے شاید وہ برا مان جاتی کہ اسے اتنے دنوں سے کیوں نہیں بتایا اور زینب کو شرمندگی بھی محسوس ہوئی کہ کم از کم اسے سونیا کو بتانا تو چاہیے تھا۔

”تم بیٹھو تو سہی۔“ وہ ہاتھ پکڑ کر اسے اپنائیت سے بٹھانے لگی۔

”یہ سب کیا ہے زینب! کہاں کی تیاری ہے تمہاری؟“ سونیا بری طرح سے الجھی تھی۔

”کینیڈا...... ایک ادبی تنظیم ہے ان کی طرف سے دعوت ہے، مطلب بصد اصرار مجھے بلایا گیا ہے حالانکہ میں نے انکار کر دیا تھا بالکل نہیں جانا چاہ رہی تھی مگر انہوں نے اتنا اصرار کیا بلکہ ٹکٹ بھی بھجوا دیا ہوٹل میں بکنگ سب کچھ پھر یہ کشف نے بہت مجبور کیا تھا۔“ زینب ہتھیلیوں پر آتے پسینے کو محسوس کرتے کچھ شرمندہ شرمندہ سی یوں بتا رہی تھی جیسے اس نے کینیڈا جانے کی ہامی بھر کر بڑا کوئی جرم سرزد کیا ہو۔

”کینیڈا!“ سونیا کی سوئی ٹھیک اسی جگہ اٹکی تھی جو زینب کو بھی لگا تھا، اسے دھچکا لگے گا۔ ”کب جا رہی ہو؟“

”کل۔“ وہ سر جھکا کر رہ گئی۔

”اور میں تمہارے لیے اتنی غیر ہو گئی کہ تم...... تم نے مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔“ سونیا کو شدید رنج ہوا تھا۔

وہ جھٹکے سے اٹھ کر جانے لگی۔

زینب نے بوکھلا کر کھڑے ہوتے ہوئے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑا۔

”سونیا آنٹی! میں نے ہی آنی کو منع کیا تھا آپ کو یہ سرپرائز ایکچولی میں دینا چاہ رہی تھی حالانکہ آنی نے تو کئی بار آپ کو بتانے کے لیے کال کرنی چاہی، میں نے روکا۔ پلیز فارگیو می۔“ کشف چائے کی ٹرے ایک طرف رکھ کر کچھ ایسی مٹھاس سے سونیا کی طرف دیکھ کر بولی۔ سونیا کو لگا اصل سرپرائز، کچھ اور ہے۔

وہ کشف کے دمکتے چہرے سے چند لمحے کے لیے نظریں ہٹا ہی نہیں سکی۔

”یہ کب اتنی بڑی، اتنی پیاری ہو گئی۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ میں اپنی الجھنوں میں اتنی الجھتی چلی گئی کہ میں نے شاید کبھی اسے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں اور یہ۔“ وہ اسے یک ٹک دیکھتی جا رہی تھی۔

اس کی نظروں میں کیا نہیں تھا۔

زینب گہرا سانس لے کر ایک طرف ہو گئی۔

”کیا ہوا سونیا آنٹی؟ بولا ناں سوری۔ پلیز، میری غلطی ہے مجھے معاف کر دیں۔“

وہ اب بڑی اپنائیت سے اس کے کندھے کو ہلکا سا چھو کر کچھ بے تکلفی سے کہہ رہی تھی۔

سونیا کے کندھے پر رکھی کشف کی نازک پتلی انگلیاں! سونیا کو لگا کہ کسی نے تیز دھار آلہ اس کے کندھے میں گاڑ دیا ہو۔

اس کے منہ سے بے اختیار سسکی سی نکلی تھی۔

وہ کشف کے لمس سے بچنے کے لیے رخ پھیر کر کپ میں چائے ڈال کر مگن انداز میں شکر گھولتی زینب کو دیکھنے لگی۔

”کتنے دن رکو گی وہاں؟“ اس نے جیسے کوئی دریا پار کیا تھا۔ بمشکل خود کو سمیٹ کر، سنبھال کر پوچھ رہی تھی۔

”دس دن۔“ زینب بے تاثر لہجے میں بولی۔

کمرے میں چند لمحے خاموشی نے گہرے سانس لیے۔

”سونیا آنٹی! اچھا کیا ناں آنی نے وہاں جانے کے لیے ہامی بھر کر۔ دیکھیں ناں، ایسے گولڈن چانسز بار بار تو ملتے نہیں۔“ وہ سونیا کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی اور اسی میٹھے لہجے میں کہہ رہی تھی جس سے سونیا کو عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی۔

”ہوں۔ اچھا، اچھا کیا بہت۔ زینب! شکر نہیں ڈالنا میری چائے میں، لینا چھوڑ دی ہے میں نے۔“ وہ بے اختیار بولی تھی۔

”کیوں خیریت؟ کیا ہو گیا؟“ زینب چونک کر فکرمندی سے بولی۔

”نہیں ٹھیک ہے سب یوں تو...... ڈاکٹر نے کچھ احتیاط کرنے کو کہا ہے تو۔“ وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے کہہ گئی۔

”آنی! لگتا ہے، سونیا آنٹی ڈائٹنگ پر ہیں۔“ کشف کچھ شوخی سے بولی۔

”یہ بھی ہو سکتا ہے لیکن سونیا کو ڈائٹنگ کی کیا ضرورت بھلا۔ ماشاء اللہ سے اتنا اچھا سانچے میں ڈھلا فگر

ہے ہماری سونیا کا۔"

زینب کے یوں کہنے پر سونیا کھوئی کھوئی سی اسے دیکھنے لگی۔

کتنے زمانوں بعد کسی نے یوں اپنائیت و محبت سے اس کا ذکر کیا تھا۔

"تم نے پوچھا نہیں سونیا! میں کیوں آنے والی تھی تمہاری طرف۔" زینب بڑے اچھے موڈ میں تھی۔

"کشف چائے اچھی بناتی ہے۔" سونیا کو چائے کا پہلا گھونٹ ہی مزہ دے گیا تھا۔

"آپ کو پسند نہیں آئی ناں سونیا آنٹی؟" کشف تعریف کو طنز سمجھ کر دکھ سے بولی۔

"نہیں نہیں، چائے بہت اچھی ہے۔ بہت ذائقے والی۔ زینب جیسا ذائقہ ہے تمہارے ہاتھ میں بھی۔ یاد ہے منصور کو کتنی پہچان تھی تمہارے ہاتھ کی چائے۔" وہ روانی میں بولتے بولتے رکی تھی۔

کمرے میں لمحہ بھر کو پھر خاموشی اپنی قدم جمانے لگی۔

"ایکچولی، میں چاہ رہی تھی جتنے دن میں کینیڈا میں رہوں تو کشف تمہارے گھر رہے گی۔" زینب نے اس خاموشی پر بڑی گہری ضرب لگائی تھی۔ سونیا کے ساتھ کشف کو بھی جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"میں کیوں جاؤں گی کہیں آنی! میں یہیں رہوں گی اپنے گھر۔" وہ بغیر کسی لحاظ کے ایک دم سے بولی تھی۔

سونیا کا ردعمل اس کے اچانک جواب میں دب کر رہ گیا۔

"کشف! بچوں جیسے باتیں نہیں کرو، یہ ممکن نہیں کہ میں تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤں۔" زینب قطعی قدرے غصیلے لہجے میں بولی۔

"ہرگز نہیں۔ مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔" وہ زینب کے غصے کی پروا کیے بغیر اسی بپھرے انداز میں بولی۔

"تو ٹھیک ہے پھر میں بھی نہیں جاؤں گی۔" زینب بھی اسی کے لہجے میں دھمکا کر بولی تھی۔ کشف ٹھٹکی۔ سونیا بالکل خاموش تھی۔

"آنی! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" ایک دم لہجہ نرم بنا کر چہکی۔ "میں اپنے گھر میں ہوں دن میں یونی میں ہوں گی اور شام کو......" وہ نرمی سے سمجھانے لگی۔

"کشف! تم ابھی سونیا کے ساتھ جاؤ گی اور جتنے دن میں وہاں رہوں گی، تم بھی وہیں رکو گی۔ یہی میرا فیصلہ ہے۔" زینب تیز تیز بولتی چلی گئی۔

"میری بھولی ماں! سونیا آنٹی کو کیوں مشکل میں ڈال رہی ہیں۔ یہ بھی تو دیکھ لیں، وہ بے چاری مجھے ساتھ لے کر جا بھی سکتی ہیں یا نہیں۔" کشف سونیا کے چہرے کی اڑی رنگت دیکھ کر جیسے مزہ لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ زینب نے یونہی سونیا کو دیکھا اور کچھ بول نہ سکی۔

سونیا نظریں چرا کر پیالی میں بچی چائے دو بڑے گھونٹوں میں ختم کرنے لگی جیسے وہاں کوئی بھی ضروری بات نہیں ہو رہی جس میں اس کا ذکر بھی ہے۔

اس نے پیالی خالی کر کے ٹرے میں رکھی۔

ٹشو سے نزاکت سے ہونٹوں کے کنارے یونہی تھپتھپائے۔

"اور اگر میں کہوں کہ میں ردا کی شادی کے لیے پہلے ہی تمہیں اور زینب کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئی تھی تو کیا تم تب بھی میرے ساتھ نہیں چلو گی۔" سونیا کا اطمینان بھرا لہجہ دونوں کو حیران کرنے کے لیے کافی تھا۔ کشف کوفت سے ماں کو دیکھنے لگی۔

"بھئی، آپ دونوں نے میرے یہاں آنے کی وجہ تو پوچھی ہی نہیں تھی۔ اصل میں تھوڑا مطلب بھی ہے

لیے یعنی میں اپنے کام سے ہی یہاں آئی تھی۔ ردا شادی کی تیاریوں میں میری کچھ خاص مدد نہیں کر رہی رمشہ کا سز چل رہا ہے۔ اماں جان اسلام آباد گئی ہوئی تھیں دو دن پہلے آئی ہیں۔ شادی میں پندرہ سولہ دن ہی تو ہیں کیلی کیسے سب کچھ کروں گی تو اس لیے میں تم دونوں کو ساتھ لے جانے کے لیے آئی تھی۔" شاید سونیا بھی آج انہیں حیران کرنے آئی تھی۔

"میری طرف سے تو ایکسکیوز ہے۔ وجہ تمہیں معلوم ہے۔ ہاں کشف ضرور جائے گی تمہارے ساتھ۔" زینب نے کشف کے چہرے کی ناگواری کو نظرانداز کرتے ہوئے گویا فیصلہ سنایا تھا۔

کشف پیر پٹختی احتجاجاً کمرے سے باہر نکل گئی۔

"میری کل تین بجے کی فلائٹ ہے، میں اسے کل دن میں دس گیارہ بجے خود چھوڑ جاؤں گی تمہاری طرف۔" زینب نے کچھ سوچ کر کہا تو سونیا جواب میں سر ہلا کر ہلکا سا مسکرائی اور ساتھ ہی اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

زینب بھی اسے دیکھ کر خاموش کچھ سوچتی رہ گئی۔

☆☆☆

"بلال! رکو۔" وہ گاڑی کی چابی لیے باہر جا رہا تھا جب ثمینہ نے اسے کمرے سے پکارا تھا، وہ شاید کہیں جانے کے لیے تیار تھی اپنے شاندار برینڈڈ کرتے کی دکھائی نہ دینے والی شکنیں درست کر کے بلونڈ بالوں کو کندھے پر جھٹک کرلاتے اس نے رک کر آئینے میں خود کو آخری بار دیکھا۔

"آپ نے بلایا ماما مجھے۔" وہ اس کی اتنی بھرپور تیاری سے نظریں چرا کر کچھ عجلت بھرے انداز میں بولا۔

"مجھے جاتے ہوئے بیگم جعفر کی طرف ڈراپ کر جانا بلکہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ ان کے گھر میں آج گیٹ ٹو گیدر ہے، انوائیٹڈ تو انہوں نے مجھے پوری فیملی کے ساتھ کیا ہے لیکن تمہارے آدم بیزار باپ کے پاس میرے لیے ٹائم ہی کہاں ہے جو میری کمیٹمنٹ کو اہمیت دے۔" وہ نخوت سے لیدر بیگ کندھے پہ ڈالتے ہوئے بولی۔

"پوری فیملی میں تو ماما! پھر دادو بھی آتی ہیں۔ میں اور پاپا تو بزی ہیں، آپ دادو کو لے جائیں۔" بلال کو بڑی عجیب سی شرارت سوجھی تھی بلکہ ثمینہ کے نزدیک بڑی گھٹیا شرارت۔

"شٹ اپ!" وہ حسب توقع بولی تھی۔ بلال کو اس سے کم جواب کی توقع نہیں تھی۔

"وہ تھرڈ کلاس عورت اس قابل ہے کہ میرے سرکل میں میرے ساتھ کہیں آ جا سکے۔" صالحہ جو اندر کی طرف جا رہی تھیں انہیں قدموں پر ٹھٹکی تھیں۔

"اور کہیں دادو سن نہ لیں۔" اس خیال سے بلال نے ذرا سی گردن موڑ کر لاؤنج کی طرف دیکھا تھا اور سن ہو کر رہ گیا تھا۔ صالحہ بھاری قدموں کے ساتھ واپس مڑ گئی تھیں۔

"ایکچولی مام! آپ کا سو کالڈ سوشل سرکل اس لائق نہیں ہے کہ وہ میری شان وار دادو کی کمپنی سے فیض یاب ہو سکے۔" اس نے ایک دم سے مڑ کر تقریباً بھاگ کر صالحہ کو اپنی بانہوں میں لیا تھا۔

"تمہاری شان وار دادی...... ہونہہ۔ خوش فہمی کہو۔" وہ حقارت سے بولی۔ صالحہ نے بے اختیار بلال کا ماتھا سر چوم کر اسے پیار کیا۔

"میری نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے بلال! اور بچے! اماں کے ساتھ اس انداز میں بات نہیں کیا کرتے۔" وہ اسے پیار کرتے ہوئے نرم لہجے میں نصیحت کرنا نہیں بھولیں۔

"یہ ڈرامے بازی کسی اور کے سامنے کیا کریں۔ پہلے میرے بیٹے اور شوہر کے کان میرے خلاف بھرتی رہتی ہو پھر اتنے مکر سے انہیں نصیحت کرنے لگتی ہو چالاک بڑھیا! جیسے میں تمہاری سازش کو سمجھتی نہیں۔"

ثمینہ کے لہجے میں کوٹ کوٹ کر نفرت اور زہر بھرا تھا۔

”ماما! فار گاڈ سیک کچھ تو خیال کر لیں، وہ ماں ہیں میرے پاپا کی۔“ بلال چیخ اٹھا تھا۔

صالحہ خاموشی سے اندر چلی گئی تھیں۔

”ہونہہ مائی فٹ!“ ثمینہ کا لہجہ اور بھی برا ہوا۔

”مجھے اس دن کا انتظار رہے گا ماما! جس دن میری بیوی آپ سے ٹھیک اسی لہجے میں، انہیں الفاظ میں بات کرے گی جس میں آپ دادو سے کرتی ہیں۔ مجھے شدت سے اس دن کا انتظار رہے گا آج سے۔“

وہ اس کے پاس آ کر رکا، چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر غصے میں پلٹ کر جانے لگا۔

اور ثمینہ تو جیسے انہیں قدموں پہ پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔

اس کا اپنا بیٹا، اس کا اپنا سگا بیٹا اس کی کوکھ سے جنم لینے والا اس کے لیے ایسی اذیت ناک خواہش دل میں رکھتا ہے سوچ کر۔ جان کر اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

”رکو خبردار تم نے میری اجازت کے بغیر اپنا قدم بھی باہر نکالا تو بلال تم دوبارہ میری شکل نہیں دیکھ سکو گے۔“ وہ زور سے چلائی تھی۔ بلال انہیں قدموں پر رک گیا تھا۔

مگر اسے لگ رہا تھا، اس کے پیچھے کھڑی عورت اس کی ماں نہیں کوئی ڈائن ہے۔ اسے خود سے نفرت محسوس ہونے لگی۔

☆☆☆

زری نے آس بھری نظروں سے بھورے رنگ کے کوٹ اور براؤن پینٹ میں کمر کو تھوڑا خم دیے ہوئے اندر داخل ہوتے منصور کو دیکھا۔

اس کے چہرے پر گہری مایوسی اور اداسی اس کے کسی بھی سوال کا جواب تھا۔

مگر پھر بھی آس امید کی ٹوٹی پھوٹی ڈور اگر اس کے ہاتھوں میں رہی تو اس کی ہتھیلیاں زخمی کرتی جائے گی اسے اس ڈور کو بھی توڑنا ہوگا۔ وہ کمرے میں آ کر کونے میں رکھے کافی میکر میں پانی ڈال کر بڑے دھیان سے کافی بنانے میں مگن ہو چکا تھا۔

”وہ نہیں آئی؟“ وہ ضبط کھو کر حلق کے بل چیخی تھی۔

منصور گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

چند لمحے یونہی کافی میکر میں پانی کھولنے کی شوں شوں سنتا رہا۔ یہ چند لمحے اسے غنیمت لگے، اس نے خود کو کمپوز کر لیا تھا۔ پھر وہ اطمینان سے اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

”فائنل سمسٹر ہے اس کا اور بڑا اہم پروجیکٹ کرنا ہے اسے اس بار۔ اپنی فرینڈز کے ساتھ کمبائن اسٹڈی کے لیے اس نے موو— کیا ہے یہاں سے۔“ وہ رک رک کر جھوٹ کو سچ میں ملا کر زری کو مطمئن کرنے کے لیے بظاہر بے تاثر چہرہ لیے ہوئے بول رہا تھا۔

”وہ اپنے گروپ کے ساتھ اس پروجیکٹ کے سلسلے میں آؤٹ آف سٹی ہے پانچ دنوں کے لیے۔ کوئی رورل ایریا ہے۔ کل شام تک آ جائے گی تو میں اسے یہاں لے آؤں گا۔“ وہ اسے بھی اور خود کو بھی بہلا رہا تھا۔

زری یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں یقین اور بے یقینی کی کیفیت تھی۔

”اور دیکھو، وہ مجھ سے جتنی بھی ناراض ہو، وہ تمہاری بیماری کا سن کر تم سے بالکل بھی ناراض نہیں رہ سکتی۔ وہ ضرور تم سے ملنے کے لیے آئے گی۔ کافی لو گی ناں تم؟“ وہ اس سے زیادہ اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔ کافی میکر سے آتی آوازوں نے اسے سہارا دیا۔ وہ اٹھ کر اس کمرے میں چلا آیا جہاں پہلے کھڑا تھا۔

اس کی اپنی آنکھوں میں دھند سی چھا رہی تھی۔ اس دھند میں کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا تھا۔

ماضی بھی دھندلا رہا تھا اور مستقبل بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور حال...... اور حال سے تو وہ خود نظریں نہیں ملانا چاہتا تھا۔

”پتا نہیں کس کی بددعا لگی ہے ہمیں۔ ہمارے گھر کا سکون، خوشیاں سب روٹھ گیا۔ ہماری اولاد ہماری نہیں رہی سگی اولاد ہو کر دونوں ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم سے دور بھاگتے ہیں۔ ہم سے بات نہیں کرنا چاہتے جانے کون ہے جو دن رات ہمیں بددعائیں دے رہا ہے۔ کوئی بھی سکھ کی گھڑی، سکون کا لمحہ نصیب میں نہیں رہا۔“

زری اونچا اونچا بولتے اب رونے بھی لگی تھی اور منصور تو جیسے وہیں کھڑے کھڑے پتھر کا ہو گیا تھا۔

اتنے سالوں بعد کسی نے ٹھیک دل کے اس مقام پر چوٹ لگائی تھی جہاں بڑا پرانا، بڑا گہرا۔ گھاؤ تھا اور وہ گھاؤ مندمل بھی ہو چکا تھا۔ منصور کے نزدیک تو شاید اب اس گھاؤ کا کوئی نشان بھی نہیں بچا تھا۔

تو پھر یہ چوٹ اتنے زور سے کیوں لگی۔

یہ تکلیف اتنی شدت سے کیوں ہوئی تھی۔

”کوئی دن رات بددعائیں دے رہا ہے ہمیں۔“ زری کی پھٹی آواز ہتھوڑے کی طرح اس کے پورے وجود کو کوٹ رہی تھی تو پھر دل کیسے محفوظ رہتا۔

وہ وہیں زمین پر ڈھے سا گیا۔

وہ آج تک اپنے اور موحد کے بگڑتے تعلقات، اپنی اور ایمان کی ناراضی کی وجوہات تلاشتا رہا تھا۔ وہ سارا وقت زری کی دل جوئی اس کی طبیعت کے بہتر ہونے کے لیے دواؤں، ڈاکٹروں اور اسپتالوں میں بھاگتا رہا تھا مگر اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ بات سوچی ہی نہیں تھی کہ وہ، اس کی پوری زندگی کسی کی بددعا کے حصار میں ہے۔

جیسے دعا کا حصار ہوتا ہے ایسے ہی بددعا کا بھی حصار ہوتا ہے۔ آدمی لاکھ سر پٹخے، لاکھ جتن کرے اس حصار کو توڑ نہیں سکتا۔ اس سے بھاگ نہیں سکتا تو یہ وجہ تھی اس کی ساری مصیبتوں، اس کی ساری بربادیوں اور بے چینیوں کی!

وہ سر پکڑے حساب کتاب کے پرانے کھاتے کھنگالنے لگا تھا۔

☆☆☆

”میں اندر آ سکتی ہوں۔“ موحد بہت تیزی سے لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کرتا بے اختیار رکا تھا۔

کشف آف وائٹ کرتے کے ساتھ پرپل ٹراؤزر اور اسی رنگ کی کڑھائی کیے۔ اسٹالر کو گلے میں ڈالے چہرے پر سنجیدگی لیے کھڑی پوچھ رہی تھی۔ وہ اسے شاید اجازت دینا بھول گیا تھا۔

وہ ہوا کے خوش گوار جھونکے کی طرح کمرے کے دروازے سے آگے بڑھ کر اس کے قریب آئی تھی۔

”پلیز!“ اس نے بے ساختہ اچھل کر اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ کرسی ذرا پرے کھسکا کر بیٹھ گئی تھی۔

”آپ بزی تو نہیں تھے۔“ اس کے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے مروتا پوچھا تھا۔

”اب نہیں ہوں۔“ وہ عادتاً مسکرا کر بولا۔

”آپ اتنا مسکراتے کیوں ہیں؟“ بے ساختہ اس کی مسکراہٹ سے چڑ کر اس نے پوچھ ہی لیا۔

موحد کے منہ سے اونچا سا قہقہہ نکلا تھا۔ کشف کو اور بھی غصہ آ گیا۔

”اب پاگل تو ڈاکٹر ہونے سے رہے۔“ موحد نے قہقہے کے اختتام پر اس کی بڑبڑاہٹ صاف سنی تھی۔

”ہو بھی سکتے ہیں...... یہ بھی ہو سکتا ہے، میں کسی پاگل خانے سے چھوٹ کر آیا ہوں۔“ وہ جیسے انجوائے

کرتے ہوئے بولا۔

کشف کچھ اور بھی جل کر رہ گئی۔

"پھر تو اس ہاسپٹل والوں کو ایوارڈ ملنا چاہیے۔" وہ طنز سے بولی۔

"اگر ایوارڈ دینا میرے بس میں ہوتا تو میں بھی کسی کو ایوارڈ ضرور دیتا۔" وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کس کو؟" بے ساختہ پوچھ کر رہ گئی۔

"سر پھری ہوا کو۔" وہ لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا تو کشف اسے گھور کر رہ گئی۔

"کیا لیں گی آپ کافی یا چائے؟" وہ مروتاً پوچھ رہا تھا۔

"تھینکس۔" وہ کچھ بے چینی سے بولی۔

"آپ کی مدر آئی مین زینب آنٹی کیسی ہیں؟" خیال آنے پر وہ پوچھنے لگا۔

"شی از فائن۔" وہ بے دھیانی سے بولی۔

"میں بھی پاگل ہوں۔ اب اس سے کیسے پوچھوں کہ مجھے اس سے کس قسم کی مدد چاہیے۔ مجھے اپنے والد صاحب کی تلاش ہے اور۔"

"او ہیلو!" اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہراتا وہ شوخ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اسی وقت کشف کا فون بجنے لگا۔ زینب کی کال تھی۔

وہ ایک دم سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"سوری۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے پھر بات کرتے ہیں بائے۔" وہ موحد کے کچھ بھی پوچھنے سے پہلے جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے چلی بھی گئی تھی۔

موحد کو پہلے حیرت ہوئی پھر غصہ سا آنے لگا۔

اس نے غصے میں ایک دو چیزیں میز پر پٹخیں پھر یونہی بیٹھ گیا۔ "مجھے کیوں غصہ آ رہا ہے، اس کے اچانک چلے جانے پر......؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

"اور مجھے اس کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ایک دم سے اتنی خوشی کیوں ہوئی تھی؟" دوسرا سوال پہلے سے بھی زیادہ خوفناک انکشاف تھا۔

"کیا وہ مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔" وہ ایک دم سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"نہیں نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کبھی بھی نہیں۔" وہ الجھتے ہوئے اپنی دو تین ضروری چیزیں اکٹھی کرتا وہاں سے تیزی سے باہر نکل گیا جیسے وہاں، اس جگہ مزید رکا تو اس کا خود پر رہا سہا اعتماد بھی اٹھ جائے گا۔

☆☆☆

"کشف! یہ کیا بے وقوفی ہے۔ تم بغیر بتائے مجھ سے کچھ بھی کہے بنا گھر سے نکل گئیں۔ یہ کیا طریقہ ہے؟" زینب فون پر غصہ ہو رہی تھی۔

"آ رہی ہوں آپی! گھر ہی آ رہی ہوں۔ آپ پریشان نہیں ہوں۔ ایک ضروری کام یاد آ گیا تھا اس لیے جلدی میں آپ کو بتا نہیں سکی۔ بس آدھے گھنٹے میں گھر پہنچتی ہوں۔" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

"میں کیوں چلی آئی تھی ڈاکٹر موحد سے ملنے اگر اس نے آپی سے ذکر کر دیا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گی۔" وہ سڑک کے ایک طرف رک کر اپنے پوائنٹ کا انتظار کرتے ہوئے بے ساختہ چونکی تھی۔

ثمینہ کسی ادھیڑ عمر امیر کبیر شخص کے ساتھ بہت خوش گوار موڈ میں ہاتھوں میں دو تین قیمتی برانڈز کے شاپنگ بیگ اٹھائے اس کے بازو میں اپنا بازو ڈالے بہت بے تکلف انداز میں پارکنگ میں کھڑی شان دار قیمتی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی اور وہ سن سی وہیں کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

"وہ مجھے پسند نہیں کر سکتی۔" کشف نے آخری لقمہ لیتے ہوئے اسے جیسے بڑی مشکل سے نگل کر مدھم آواز میں کہا تھا۔

زینب کا پانی کا گلاس منہ کی طرف جاتا رک گیا تھا۔ کشف اب میز سے کھانے کے برتن اٹھا رہی تھی۔

"چائے پییں گی آپی آپ!" اس نے تکلفاً پوچھا تھا، کچن سے آواز لگا کر ورنہ وہ جانتی تھی زینب اس وقت چاہے تھوڑی سی لے چائے ضرور لیتی ہے زینب شاید کمرے میں جا چکی تھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کشف نے برتن دھوتے ہوئے چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔

کشف جب چائے لے کر کمرے میں آئی تو زینب کشف کا بیگ تیار کر چکی تھی۔ کشف نے احتجاجاً کچھ بولنا چاہا مگر زینب کا چہرہ دیکھ کر بے دلی سے اپنا کپ لے کر بیٹھ گئی۔

"پلیز آپی! میں رہ لوں گی نا یہاں۔ ساتھ والی یاسمین آنٹی، ان کو بلا لوں گی رات میں۔" وہ آخر میں لجاجت سے منت کرنے لگی۔

"کشف! کوئی کسی کے لیے اپنا گھر چھوڑ کر نہیں آتا اور تم دس راتیں اکیلے رہنے کی بات کرتی ہو۔ تم یہاں ایک رات اس گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ میری موجودگی میں تم رات کو ڈر کر اکثر میرے پاس آ جاتی ہو بستر میں تو اکیلے رہنے کا تو سوچو بھی نہیں۔" زینب کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور اس کی بات غلط بھی نہیں تھی۔

زینب کی موجودگی میں کشف پھر بھی بہت بہادری دکھا لیتی تھی مگر اس کے نہ ہونے پر اس کھنڈر نما گھر میں اکیلے رات رہنا موت کے کنویں میں چھلانگ لگانے کے برابر تھا۔

وہ خاموش ہو گئی۔

"کل صبح دس بجے میں خود تمہیں لے جاؤں گی سونیا کی طرف اور دیکھو وہاں تمہارا دل بھی لگا رہے گا۔ شادی کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔ مصروفیت میں وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلے گا تمہیں۔" وہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہی تھی کشف بے دھیان سی تھی۔

زینب نے اٹھ کر الماری سے ایک لفافہ نکال کر کشف کے ہینڈ بیگ میں رکھ دیا۔

"اب یہ کیا ہے۔" اس کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

"کچھ پیسے ہیں تم بھی شادی کی تیاری کے لیے اپنے لیے کچھ کپڑے وغیرہ بنا لینا اور کچھ تمہارا خرچ۔"

کشف کو بے اختیار رونا آ گیا۔

رونا تو زینب کو بھی آ رہا تھا مگر وہ اس کے سامنے یوں رو کر کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ گیلی آنکھوں کے ساتھ اسے گلے سے لگا کر تھپکنے لگی۔

"آپی! ایک بات تھی۔" کشف کو یکایک خیال آیا تھا۔

"کیا؟" زینب اس کے انداز سے چونکی۔

"پتا نہیں مجھے آپ سے شیئر کرنی بھی چاہیے یا نہیں۔" وہ بات کر کے کچھ پچھتائی۔

"ایسی کون سی بات ہے آج تک تو تم نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔"

"وہ ثمینہ آنٹی ہیں نا بلال کی مام!" وہ اٹک کر بولی۔

زینب خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"وہ آج شام میں جب میں گھر آ رہی تھی، کسی امیر شخص کے ساتھ شاید شاپنگ کرنے کے بعد...... اس کی گاڑی میں جا رہی تھیں۔" وہ کچھ جھجک کر، رک رک کر بول رہی تھی۔

"تو اس میں کیا ہے؟" زینب نے لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے پھر سے اس کا بیگ چیک کر کے زپ بند کی۔

"نہیں۔ وہ جس بے تکلفی سے اس کے ساتھ...... آئی مین دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیے۔ بہت عجیب سی بات نہیں آنی؟" وہ شاید جھجک کی وجہ سے ٹھیک سے بیان نہیں کر پا رہی تھی زینب ایک دم سے چپ ہو گئی۔

اس کی نظروں کے سامنے حیدر کا گہری اداسی لیے چہرہ آ گیا۔

"بے چارا بلال کتنا اچھا ہے اور انکل حیدر بھی...... میں بلال سے یہ بات نہیں کروں نا آنی؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" وہ رخ پھیر کر الماری میں کچھ تلاشنے لگی۔

☆☆☆

"تم آ جاؤ ناں موحد! میرے پاس میرے بیٹے!" زری فون پر بات کرتے خود پر قابو نہیں رکھ پا رہی تھی۔

"میں آ جاؤں گا جلد ماں۔" وہ اسے بہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم نے مجھے معاف نہیں کیا ناں موحد؟" وہ ہچکی سی لے کر۔ پوچھ رہی تھی موحد فوری طور پر کچھ بول نہیں پایا۔

"میں جانتی ہوں۔ تم ابھی بھی مجھ سے ناراض ہو، خفا ہو مجھ سے۔ ہونا بھی چاہیے۔ میں نے کچھ بھی اچھا نہیں کیا نہ تمہارے ساتھ نہ اپنے ساتھ۔ نہ منصور کے ساتھ۔" جوں جوں انسان عمر کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے۔ اس کی حساب کتاب لگانے کی پچھلے کھاتے کھنگالنے کی عادت پختہ ہوتی جاتی ہے۔

یہ وہی زری ہے۔ کوئی نہیں مان سکتا تھا جو ماضی کو محض الوژن گردانتی تھی اور مستقبل کو ایک وہم!

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" وہ اس کا دھیان بٹانا چاہتا تھا۔

"میں اس دن ٹھیک ہوں گی موحد! جب تم اور ایمان میرے پاس ہو گے تم ڈاکٹر ہو ناں۔ تمہیں تو یہ بات سمجھنی چاہیے ناں کہ مجھے کوئی بیماری نہیں صرف جدائی ہے میری بیماری کی وجہ موحد! مجھے ایک مریض سمجھ کر، بیمار سمجھ کر مجھ پر رحم کھاؤ۔ مجھے معاف کر دو۔ میرے پاس آ جاؤ میرے بچے!" وہ اب باقاعدہ رونے لگی تھی۔

"میں کوشش کروں گا آپ کے پاس آنے کی۔ جو میرے بس میں ہے۔" اس نے ایک بار پھر کسی بھی "وعدے" سے گریز کیا تھا۔

"صرف آنے کی کوشش کرو گے۔ مجھے معاف نہیں کرو گے؟" وہ بھی اس کی ماں تھی کیسے اس کے دل کا حال نہ جانتی۔

"آپ نے یہ سب جاننے میں بہت دیر کر دی ماں۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔

"آپ دوا لے رہی ہیں نا باقاعدگی سے؟" وہ پروفیشنل انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے موحد! اب مجھے Fits (دورے) نہیں پڑتے۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر اسے بتا رہی تھی۔

"ویری گریٹ ماں! بہت اچھی خبر ہے یہ تو۔" وہ واقعی خوش ہوا تھا یا اس کے سامنے ظاہر کر رہا تھا۔

"میں کوشش کر رہی ہوں ٹھیک ہونے کی۔" وہ پھر سے بڑی رازداری سے اسے بتانے لگی۔

"یہ تو بہترین ہے ماں! آپ کوشش کریں گی تو آپ کو کسی بھی میڈیسن، ڈاکٹر کی ضرورت نہیں رہے گی۔" وہ اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بولا۔

"میں اس لیے خود کو ٹھیک کر رہی ہوں۔ کہ میں جانتی ہوں تم، یہاں نہیں آؤ گے تو میں تمہارے پاس آ جاؤں گی۔

تمہارے پاپا نے مجھے منع کیا تھا یہ بات بتانے سے ورنہ تم یہاں سے بھی کہیں دور چلے جاؤ گے، ہم سے بھاگ جانے کے لیے تم نہیں جاؤ گے نا موحد! پرامس کرو اپنی ماں سے۔" وہ بچوں کی طرح اس سے باتیں کر رہی تھی۔

منصور نے غصے میں آ کر پیچھے سے اس سے فون چھین لیا تھا۔

"مجھے اب تم سے بھی کچھ شیئر نہیں کرنا۔ تم کسی بھی طرح سے بھروسے کے لائق نہیں ہو۔"

موحد نے منصور کی غصے بھری آواز سنی تھی اور اس نے تھک کر فون بند کر دیا۔

قدرت ہم سے وہ امتحان کیوں لیتی ہے جو ہم دینا نہیں چاہتے جس کے لیے ہماری تیاری ہی نہیں ہوتی اور ہمیں اپنی ناکامی کا مکمل یقین ہوتا ہے پھر بھی ہمیں اس امتحان میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ خالی دماغ، خالی دل کے ساتھ اس پرچے کو حل کرنا ہوتا ہے جس کا ایک بھی سوال ہماری مرضی کا نہیں ہوتا۔

اور میں کب تک بھاگتا رہوں گا خود سے، ان سے میں تھک گیا ہوں، بھاگ بھاگ کر۔ مجھے اب حالات کے سامنے کھڑے ہو جانا چاہیے۔ مجھے بات کرنا چاہیے۔ خود سے پوچھنا چاہیے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔

"کیوں میں ماضی کا قیدی ہو کر رہ گیا ہوں۔ کیوں میں خود کو اس قید سے آزاد نہیں کر پا رہا۔ میں اپنی خوشی سے اس قید میں ہوں تو پھر مجھے کوئی گلہ کرنے کا حق بھی نہیں۔ کوئی حق نہیں۔" وہ زور زور سے کرسی جھلانے لگا۔

☆☆☆

"وہ آزر! کشف یہیں رہے گی دس بارہ دن تک بلکہ جب تک شادی ہے تو۔"

آزر بیڈ پر شادی کے خرچوں اور دوسرے اخراجات کی لسٹ چیک کرتے ہوئے لمحے بھر کو گنگ سا رہ گیا۔

"کیا کہا تم نے؟" وہ چیخ کر بولا۔ "وہ کیوں رہے گی یہاں۔" اس کے لہجے میں واضح ناپسندیدگی تھی۔

"بتایا تو ہے، زینب کو ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے کینیڈا جانا پڑ رہا ہے تو ظاہر ہے، وہ کشف کو گھر میں اکیلا تو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" سونیا نے ہمت کر کے رک رک کر جواب دیا تھا۔

پھر بھی آزر کے ماتھے کے بل کم نہیں ہوئے۔

"ان ماتھے کی شکنوں کی وجہ سے آزر! میں ساری زندگی اس گھر میں، اس کمرے میں کبھی کھل کر سانس نہیں لے سکی۔

"تم نے زندگی کے اتنے سارے سال مجھے ان دیکھے خوف میں کچھ اس طرح جکڑے رکھا ہے کہ میں فیصلہ ہی نہیں کر پاتی کہ میں تمہارے ساتھ کیوں رہ رہی ہوں۔ اس لیے کہ تم میرے شوہر ہو یا میرے بچوں کے باپ ہو یا تمہارے سوا میری زندگی میں دوسرا کوئی سہارا نہیں۔ تمہیں چھوڑ کر میں کہاں جاؤں گی۔

بلکہ نہیں اسے یوں کہنا چاہیے کہ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں کہاں جاؤں گی۔

یا محبت کی وجہ سے؟

اس آخری وجہ کو دل میں دہراتے اس کا جی چاہا، وہ بہت بلند قہقہہ لگائے اس کے پاس ساری وجہیں سارے بہانے ختم بھی ہو جائیں۔ آزر کے ساتھ رہنے کے تو بھی یہ وجہ نہیں بچے گی کہ وہ آزر سے محبت کرتی ہے یا شاید وہ کرتی بھی ہو مگر یہ ماننا کہ آزر اس سے محبت کرتا ہے، ایسے ہی ہے جیسے اس کائنات کا نئے سرے سے بننا۔

"تو اتنی آزاد خیال ہو گئی ہے تمہاری بھابھی کہ اب یوں آزاد روش عورتوں کی طرح مردوں کے درمیان بیٹھ کر عشقیہ شعر پڑھے اور ہم بیٹی کی دیکھ بھال کریں۔"

اور سونیا کے اندر سر اٹھاتا مکالمہ جیسے آخری ہچکی لے کر دم توڑ گیا کہ آزر سے اتنی گھٹیا، اتنی عامیانہ بات کی توقع تو شاید وہ مر بھی جاتی تو بھی نہ کرتی۔

"یہ سب آزر نے کہا تھا؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

"بلکہ اس سے کہو کہ اپنی بیٹی کو اپنے اس دوست نما کزن کے گھر کیوں نہیں چھوڑ دیتی جس کا بیٹا ہمہ وقت

اسے ساتھ لیے گھوم رہا ہوتا ہے۔"

آزر کے اندر کشف اور زینب کے لیے اتنا غصہ اور ایسا کھولتا لاوا ہوگا۔ یہ تو کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں!

"تم انہیں صاف منع کردو یہاں آنے سے۔" وہ قطعی لہجے میں کھردرے پن سے بولا۔

"خیر اب تو میں انہیں منع نہیں کرسکتی میں ہامی بھر چکی ہوں دوسرے زینب کیا کرتی ہے آزر! یہ ان کا پرسنل معاملہ ہے اور کشف کو یہاں بلا کر رکھنے میں میری اپنی غرض بھی ہے شادی کی تیاریوں میں میرا کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں۔ کل اگر شادی میں کوئی کمی رہ گئی تو آپ کی اماں جان ہی میرا جینا محال کردیں گی۔"

سونیا نے اٹھ کر آگے پڑے کپڑوں کو اٹھا کر الماری میں رکھنا شروع کردیا۔

آزر کے چہرے کا رنگ سلگنے لگا تھا۔

"یہ تم مجھ سے کس لہجے میں بات کررہی ہو؟" اس نے بہت بے دردی سے اس کی کلائی مروڑی تھی۔

"جس لہجے میں بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔" سونیا میں اتنی طاقت بھی ہوسکتی ہے کہ وہ آزر سے اپنی کلائی چھڑا سکے یا اس طرح منہ پر دو ٹوک جواب دے سکے، یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"اور وہ دونوں اس دنیا میں میری اکلوتی رشتہ داری ہے۔ اس گھر کی خدمت کرنے کے ناتے کچھ حق میرا بھی ہے کہ میں اپنی مرضی سے اپنا کوئی مہمان بلاسکوں۔"

وہ اس بار سکون سے آزر کو جتا کر باقی کے کپڑے اٹھا کر کمرے سے باہر لے گئی تھی۔

آزر گہرے سناٹے میں بیٹھا رہ گیا تھا۔

گزرے تیئیس چوبیس سالوں میں سونیا نے کبھی اس سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی وہ سر پکڑ کر نہ بیٹھتا تو اور کیا کرتا۔ اس نے ساری فائلیں سمیٹ کر ایک طرف پٹخ دیں۔

☆☆☆

ایما اپنا بیگ گھسیٹتی اپارٹمنٹ کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ ڈینئل کچن میں چولہے کے پاس کھڑا شاید رات کے ڈنر کا بندوبست کررہا تھا۔

جان لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا گود میں لیپ ٹاپ کھولے بظاہر مصروف تھا۔

ایما دونوں کو نظر انداز کرتی اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تھی۔

"ہائے ایما!" ڈینئل نے دور سے نعرہ بلند کیا۔

"ہائے!" جواباً تھکا ہارا اس کے منہ سے نکلا۔

"کیسا رہا تمہارا پروجیکٹ...... کمپلیٹ ہوگیا سب کچھ۔"

"آل موسٹ ہو ہی گیا۔" وہ بیگ اندر رکھ چکی تھی۔

"تم ڈنر میں کیا لوگی۔ میں اسٹیک بنا رہا ہوں۔" وہ دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"تھینکس ڈیڈی! بٹ میں بہت تھک گئی ہوں۔ لنچ ابھی کچھ دیر پہلے لیا تھا میں نے۔ رات میں کچھ نہیں لوں گی صرف ریسٹ کرنا چاہتی ہوں پلیز کوئی مجھے ڈسٹرب نہیں کرے۔ اوکے۔" وہ کہہ کر دروازہ لاک کرکے اندر چلی گئی۔

"اوکے ڈارلنگ!" ڈینئل نے اونچی آواز میں کہتے ہوئے جان کو دیکھ کر آنکھ ماری۔ دونوں ہنسنے لگے تھے۔

☆☆☆

ماحول میں کچھ تناؤ تھا یہ بات تو زینب نے آتے ہی محسوس کرلی تھی لیکن وہ کشف کے سامنے اپنے احساس کو ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ جس مشکل سے کشف کو یہاں تک لے کر آئی تھی۔ یہ وہی جانتی تھی۔ ردا اور رمشا بہت اچھی طرح سے ملی تھیں۔

سونیا کی ساس کی طبیعت کچھ اچھی نہیں تھی۔ وہ صبح جلدی اٹھ کر دوبارہ سے سونے کے لیے جاچکی تھیں۔

اور اس بات پر کشف کے ساتھ زینب نے بھی دل میں شکر ادا کیا تھا کہ ہاجرہ خاتون کی تیز بدن کو چھیدتی نظریں ہی برداشت کرنا سامنے والے کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں ہوتا تھا۔

سونیا خلاف توقع ناشتے کے ساتھ ان کی آؤ بھگت کررہی تھی۔

"سونیا! ناشتہ ہم کرکے آئے ہیں پلیز تم پریشان نہیں ہو۔ میں صرف چائے لوں گی۔" زینب نے آزر کے بے حد سنجیدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا تھا اور چائے کا کہہ کر بھی پچھتائی تھی۔

لیکن اگر وہ فوراً چلی جاتی تو شاید کشف زیادہ پریشان ہوجاتی پھر اسے حیدر بھائی کا انتظار بھی کرنا تھا جنہوں نے اسے یہاں سے پک کرنے آنا تھا۔ ابھی تو دونوں آئی تھیں۔

"جی سونیا آنٹی! مجھے بھی نہیں لینا بریک فاسٹ۔" کشف بھی سونیا کے اصرار پر انکار کرتی اٹھ کر زینب کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

"میں اتنے سارے دن اس سٹریل ماحول میں کیسے رہوں گی" وہ روہانسی ہوکر سرگوشی میں بولی تھی۔

اور زینب اسے دیکھ کر رہ گئی۔

جس احساس کو وہ کشف سے چھپانے کی کوشش کررہی تھی، اسے کشف زینب سے زیادہ جان گئی تھی۔

وہ اس پر ایک مجبوری نظر ڈال کر رہ گئی۔

"کشف! تم جاؤ اپنا سامان ردا کے کمرے میں سیٹ کرلو جاکر یا رمشا کے روم میں۔" سونیا بھی آزر کی گہری چپ سے دل ہی دل میں پریشان ہورہی تھی۔

کشف نے ماں کو دیکھا تو اس کے اشارہ کرنے پر کشف بادل ناخواستہ اپنا بیگ اٹھا کر اندر کی طرف چلی گئی۔

"کتنے بجے کی فلائٹ ہے تمہاری؟" سونیا چائے کے کپ لیے زینب کے پاس ہی آکر بیٹھ گئی۔

آزر نے زور سے کرسی کھینچی کہ سارے میں آواز گونجی تھی۔

وہ اپنا بیگ اٹھا کر غصے بھرے انداز میں باہر جاچکا تھا۔

سونیا اپنے کپ کے کناروں کو انگلی سے چھو کر یونہی شرمندگی چھپاتی رہی۔

"سوری زینب! آزر کی طبیعت بس ایسی ہی ہے یوں دل کے برے نہیں ہیں۔" وہ نظریں نہیں اٹھا پارہی تھی۔

"پلیز سونیا! تم پریشان نہیں ہو، اٹس اوکے۔ تم کشف کو کچھ دن اپنے پاس رکھ لوگی تو میں تمہارا یہ احسان بھی نہیں بھولوں گی۔"

سونیا اس کی بات پر ششدر سی اسے دیکھنے لگی۔

دوسرے لمحے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

زینب نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگالیا دونوں بے آواز آنسوؤں میں اپنے اپنے دل کے دکھ خاموشی سے بہانے لگیں۔

☆☆☆

کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔

وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

سوتے میں اسے لگا، اس کا دم گھٹ رہا ہے کوئی دباؤ ہے جو اس کے سینے پر بڑھتا جارہا ہے۔

وہ سانس لینے کے لیے خود کو اس دباؤ سے آزاد کرانے کے لیے دائیں بائیں سر مارنے کی کوشش کررہی تھی۔

دباؤ کم ہونے کے بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔

ایمان نے اپنے پورے وجود کی قوت کو ایک جھٹکے میں سمو کر اپنے اوپر موجود دباؤ کو جھٹکنا چاہا تو نشے میں دھت ڈینئل، جان اور ان کے ساتھ تیسرا کون تھا۔ اندھیرے اور بری حالت کی وجہ سے وہ بالکل سمجھ نہیں پائی۔

وہ پاگل وحشی درندوں کی طرح اس پر جھپٹ رہے تھے۔

وہ نہتی تھی۔ اکیلی تھی اور کمزور تھی۔

لیکن اس کی مرضی اس کی خواہش اس کی وجود سے زیادہ طاقت ور، زیادہ زوردار تھی!

”جب میری مرضی نہیں تو تم مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔“ وہ گھٹتی سانسوں سے اپنا بچاؤ کرتی دم توڑتی مزاحمت کے ساتھ زور سے چیخی تھی۔

مگر اس منہ زور حیوانیت میں اس کو سن کون رہا تھا۔ ایمان نے اپنے تار تار ہوتے مختصر لباس کو دیکھا۔

ایک لمحہ لگا اسے فیصلہ کرنے میں، وہ خود کو اپنی مرضی کے خلاف استعمال نہیں ہونے دے گی۔

بے بس ہونے کے بجائے وہ بھی ان پر پل پڑی۔

نہ جانے اس کے اندر کون سے جن کی طاقت آئی تھی کہ اس نے شیطانیت میں اندھے ہوتے ان تین حیوانوں کو جس طرح خود سے پرے دھکیلا اور چیزوں سے ٹھوکریں کھاتی وہ بیڈ روم کے دروازے سے ٹکرائی کانپتے ہاتھوں سے اس کی کنڈی ٹٹولے جا رہی تھی جو کہ پہلے سے کھلی تھی۔

جیسے ہی ڈینئل نے اس کے بال کھینچے۔ اس نے ڈینئل کو کونے میں پڑا گملا اٹھا کر مارا اور خود باہر کی طرف بھاگی۔ فلیٹ کا دروازہ لاک تھا اور کوئی دروازہ نہیں تھا وہ پاگلوں کی طرح ٹیرس کی طرف بھاگی اور وہ تینوں اس کے سر پر آ چکے تھے۔

فیصلہ کرنے کے لیے صرف ایک پل تھا۔

اس نے جان قربان کرتے ہوئے اس بلند و بالا ٹیرس کی ریلنگ سے بغیر دیکھے نیچے اندھیرے میں چھلانگ لگا دی تھی۔

اور وہ تینوں شیطان کے چیلے بنت حوا کی اس جرأت، اس بے جگری پر ہر طرح کا نشہ ہرن ہوئے پتھر کے بت کی طرح کھڑے رہ گئے تھے۔

☆☆☆

سارے نمبر زینب کے فون میں محفوظ ہو چکے تھے۔

فلائٹ کی ٹائمنگ اناؤنس ہو چکی تھی۔

زینب کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔

وہ جس طرح کشف کو اس ان چاہے ماحول میں چھوڑ کر آئی تھی، وہ بہت تکلیف دہ تھا۔

”حیدر بھائی! پلیز آپ اس سے فون پر خیریت پوچھتے رہیں، مجھے اس کی بہت فکر ہو رہی ہے، وہ بالکل وہاں رہنا نہیں چاہ رہی تھی۔“

وہ بار بار آنکھیں صاف کرتی، حیدر کو تاکید کرتی ڈیپارچر لاؤنج کی طرف اپنا بیگ گھسیٹتی الوداعی ہاتھ ہلاتی چلی گئی تھی، حیدر نے نم آنکھوں کے ساتھ ہاتھ ہلاتے اسے رخصت کیا تھا۔

وہ دکھے دل کے ساتھ مڑا اور پینٹ کی جیب سے گاڑی کی چابی نکالتے ہوئے کوئی کاغذ اس کے ہاتھ سے ٹکرایا اس نے کاغذ نکالا اور پریشان سا کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سویرا فلک

خزاں کے بعد

افنان نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ خبر تھی یا بم دھماکا۔ وہ متاثرین کی فہرست میں سب سے اول نمبر پر تھی۔ اس کا قصور نہ تھا مگر وہ کسی مفرور ملزم کی طرح منہ چھپاتی پھر رہی تھی۔ خوف اس کی پرچھائیں بن کر اس کے وجود سے چپک گیا تھا اور وہ ہر آہٹ پر پتے کی طرح لرز جاتی تھی۔ ایسے میں صالحہ آپا کے

آنے کی اطلاع اس کی سماعتوں میں سیسہ انڈیلے جانے کے برابر تھی۔ گوکہ نہ اسے عدالت کے لگائے جانے کا انتظار تھا، نہ سزا سنائے جانے کا۔ وہ تو بس رد کیے جانے کی اذیت سہنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی۔

وقت کی سوئیاں لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھتی اس کے وجود سے لہو کی بوندیں نچوڑے جا رہی تھیں اور اس کی حالت زلزلے کے نتیجے میں زمین بوس ہو جانے والے اس شخص کی طرح تھی جس کی امداد کو پکارتی چیخیں اس کے وجود کے اندر ہی دم توڑ جاتی ہیں اور انہیں سننے والا کوئی نہیں ہوتا اور آخرکار وہ اس اذیت پسند موت سے سمجھوتا کر کے سانسیں رکنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔

☆☆☆

طے شدہ وقت کے مطابق صالحہ آپا دوپہر کے کھانے کے وقت آچکی تھیں۔ کھانا وہ کھا کر آئی تھیں اور اب سب ابا کے کمرے میں موجود تھے۔ وہ اپنے کمرے میں جلے پیر کی بلی کی مانند گھوم رہی تھی کہ پرانی ملازمہ نذیرہ نے اسے ابا کے کمرے میں بلوائے جانے کا حکم سنایا۔ وہ خود کو بڑی سی چادر میں لپیٹے دھڑکنوں کی رفتار گنتے ہوئے ابا کے کمرے میں داخل ہوئی۔

صالحہ آپا، فرحین اور صارم کے ہمراہ کمرے میں موجود تھیں۔ ابا، امی، بڑے بھیا، ثمرہ آپی، بھابھی سب کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں مگر وہ خود کسی سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی صور پھونکے جانے کی منتظر تھی۔

”عنایا! بیٹھ جاؤ۔“ صالحہ آپا کی آواز بے تاثر تھی، سو وہ ان کے مزاج کا اندازہ نہیں لگا سکی البتہ ثمرہ آپی کے اشارے پر روبوٹ کی مانند چلتی ہوئی ان کے پاس بیٹھ گئی اور سر جھکا لیا۔

”ہم سب نے مل کر ایک فیصلہ لیا ہے کہ اب جبکہ افنان نے فرحین سے شادی سے انکار کر دیا ہے تو تمہاری اور صارم......“ صالحہ آپا پانی کے گھونٹ لیتے ہوئے بات کر رہی تھیں، اچانک انہیں اچھو لگ گیا۔

عنایا کا دل چاہا کہ وہ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر بھاگ جائے یا پھر ان سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ان سے پوچھے کہ اگر افنان بھائی نے شادی سے انکار کر دیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اور صارم تم تو مجھ سے محبت کے دعویدار تھے۔ افنان بھائی اور فرحین کا رشتہ تو پھر بھی ان کے بدلے طے پایا تھا۔ فرحین سے پوچھے، فرحین تم بھی تو ایک لڑکی ہو، خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو کہ اگر افنان کی جگہ صارم نے ایسا کیا ہوتا تو کیا تم اس کے کیے سزا کی بھگتتے ہوئے خون کے آنسو نہیں روتیں۔

مگر اس کے الفاظ قوت گویائی سے محروم تھے۔ سوچوں کی بڑھتی آوازیں اگرچہ اس کا دماغ پھاڑنے پر آمادہ تھیں اور قریب تھا کہ وہ سر پکڑ کر غش کھا کر گر جاتی۔ صالحہ آپا نے آ کر اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔

”کیا ہوا ہے میری بچی! چہرہ سے خون کیوں نچڑا ہوا ہے تمہارے۔ ارے یہ وقت تو سب پر آتا ہے۔ لڑکیاں ماں باپ کا گھر چھوڑ کر جاتی ہیں، ہاں البتہ یوں اچانک یہ خبر تمہیں ضرور حیران و پریشان کر گئی ہوگی۔ بس اصل میں، میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتی اور اچھا ہے ناں، تمہاری اور صارم کی شادی کے بہانے یہ جو وقتی اداسی ہم سب کے درمیان گھر کر گئی ہے، دور ہو جائے گی۔“ صالحہ آپا جانے کیا کیا کہے جا رہی تھیں اور وہ دم بخود ان کے چہرے کو کھوج رہی تھی گویا اندازہ لگانا چاہ رہی ہو کیا آیا وہ اپنے ہوش و حواس میں ہیں ورنہ ان جیسی روایت پسند خاتون کا یہ فیصلہ اور ایسا قدم اس کے لیے تو کم از کم کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

”صالحہ آپا! ہم کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کریں۔ قسم لے لیں، ہمیں ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ افنان باہر جا کر ایسی گری ہوئی حرکت کرے گا۔ صرف نیشنلٹی کے چکر میں گوری سے شادی رچا کر اس نے بہت پستی کا ثبوت دیا ہے اور افسوس تو یہ ہے کہ اگر ایسا ارادہ تھا بھی تو وہ فرحین سے منگنی سے انکار ہی کر دیتا۔ سچ مانیں آپ جیسے مہذب اور روایت پسند گھرانے سے جڑنا ہماری خوش نصیبی ہے ورنہ کس نے سوچا تھا کہ پڑوس سے ہمارا رشتہ سمدھیانے میں بدل جائے گا۔ مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ آپ سب نے اتنا بڑا دل کیا اور ہماری عنایا کو ٹھکرا کر جانے کے بجائے دل سے اپنا لیا۔ ورنہ اکثر تو ایسے معاملات میں یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر ایک طرف سے رشتہ ٹوٹے تو دوسری طرف سے بھی برابر کا بدلہ لیا جاتا ہے۔ آپ کے ظرف نے ہمیں جیت لیا۔“

ثمرہ آپی نے گویا عنایا کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ خود اس کے دل میں بھی صالحہ آپا کی قدر و منزلت بے حد بڑھ چکی تھی۔

”نہیں ثمرہ! ایسے مت کہو۔ میں انسان ہوں فرشتہ نہیں۔ میں آج بھی روایت پسند ہوں مگر میں صرف ان روایتوں کی ترقی کی حامی ہوں جو مثبت ہوں۔ ادلے بدلے کی شادی اگر ہم پلہ اور بخوشی ہو تو کوئی حرج نہیں مگر کسی ایک کی غلطی کی سزا دوسرے کو دینا سراسر ناانصافی ہے اور میں ایسی روایت کی نہ طرف دار ہوں نہ حامی۔ چلو عنایا! اب ذرا جلدی سے اپنے ہاتھ کی چائے اور پکوڑے تو کھلا دو۔ دیکھو ذرا کیسی سہانی ہوا چل رہی ہے۔“ صالحہ آپا نے اس کا ماتھا چوم کر کہا تو وہ مسکرا کر صحن میں بنے کچن میں آ گئی۔

کڑھائی میں تیل ڈال کر چولہے پر چڑھایا اور سامنے لگی کیاریوں میں لگے ننھے سرسبز پتوں اور پھولوں کی کونپلوں کو ہوا کی گدگدیوں سے جھومتا دیکھ کر مسکرا دی کیونکہ خزاں کے بعد آنے والی بہار کے جھونکے اسے گنگنانے پر مجبور کر رہے تھے۔

بہار آئی
تو جیسے ایک بار لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے، شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پر مرمٹے تھے
جو مٹ کے ہر بار پھر جیے تھے
نکھر گئے ہیں گلاب سارے
جو تیری یادوں سے مشک بو ہیں
جو تیرے عشاق کا لہو ہیں
ابل پڑے ہیں عذاب سارے
ملال احوال دوستاں بھی
خمار آغوش مہ وشاں بھی
غبار خاطر کے باب سارے
تیرے ہمارے سوال سارے، جواب سارے
بہار آئی تو کھل گئے ہیں
نئے سرے سے حساب سارے
بہار آئی............!!!

☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست	آمنہ ریاض	300/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	400/-
فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	300/-
دل اک گلشن	رضیہ جمیل	300/-
سوچ نگر کی رانی	رضیہ جمیل	350/-
حنا	نادرہ خاتون	550/-
چلمن	نادرہ خاتون	300/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار کراچی۔ فون: 32216361

حسن ابر کرم ہے تو

شیریں ملک

سعد بڑے خوش گوار موڈ میں دانیال کے گھر سے باہر آیا تھا۔ لیکن گیٹ سے باہر کا منظر اس کے گھبرانے کے لیے کافی تھا۔ کیونکہ دانیال کا ٹائیگر (پالتو کتا) گارڈ کی آنکھ بچا کر باہر نکلا ہوا تھا اور ایک چھوٹے سے بچے کو روکے اسے خوں خوار نظروں سے گھور رہا تھا جو کہ اس معصوم سے بچے کو ہراساں کرنے کے لیے کافی تھا۔ اور وہ حلق پھاڑے روئے جا رہا تھا۔

سعد کو خود کتوں سے بڑا ڈر لگتا تھا لیکن اب اس معصوم بچے کو مشکل میں دیکھ کر نتائج کی پروا کیے بغیر وہ اس کی طرف بڑھا تھا اور اسے جلدی سے اوپر اٹھا لیا۔ بھلا ہو ٹائیگر کی یادداشت کا جسے یاد تھا کہ سعد اس کے مالک کا دوست ہے۔ اسی لیے دم ہلاتے ہوئے اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اسی دوران گارڈ بھی باہر آ گیا تھا۔

”خان بابا آپ کہاں تھے؟ آپ کو معلوم بھی ہے کہ یہ ٹائیگر کتنا خوں خوار ہے اور کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے پھر بھی آپ نے اسے باہر آنے دیا۔“ سعد کافی سخت لہجے میں بولا جو اس کا خاصہ نہ تھا۔

”معاف کرو صاحب! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ میں تو صرف پانی پینے ہی گیا تھا۔ نجانے یہ کیسے باہر آ گیا۔“ وہ کافی گھبرایا ہوا تھا۔

”آپ اس کا انتظام گیٹ سے تھوڑا دور کریں۔ اگر اس بچے کو کچھ ہو جاتا تو کیا کرتے۔“

وہ ان کو تاکید کرتا بچے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جو حد سے زیادہ کیوٹ تھا۔ سعد نے بڑے پیار سے اس کے آنسو صاف کیے اور اس کے پھولے پھولے سرخ گالوں کو چوم لیا۔

”بیٹا! کیا نام ہے آپ کا؟“

”میرا نام محمد سبحان ہے اور مما مجھے ہانی کہتی ہیں۔“ سعد اس کے معصوم انداز پر مسکرا دیا۔

”تو ہانی آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ باہر اکیلے کیوں نکلے تھے۔ اتنے چھوٹے بچے اکیلے باہر نہیں آتے۔ بلکہ اپنی مما کے ساتھ آتے ہیں۔“ سعد کو ویسے بھی بچے بہت اچھے لگتے تھے اور یہ تو تھا بھی اتنا پیارا کہ اس سے باتیں کرنے کو دل کر رہا تھا۔

”انکل میں اپنی بال لینے باہر آیا تھا جو اس طرف آ گئی تھی۔ وہ وائیٹ گیٹ والا میرا گھر ہے۔ آپ مجھے وہاں چھوڑ دیں۔“

اس نے کافی دور ایک گیٹ کی طرف اشارہ کیا تو سعد اس سے باتیں کرتا اسی جانب چل دیا۔ جہاں ایک لڑکی بڑی پریشانی میں بار بار گلی کے دونوں اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔

”بس انکل! آپ مجھے یہیں اتار دیں، وہ میری مما کھڑی ہیں۔“

اور سعد اس کو اتارتے ہوئے حیرانی سے اس خوب صورت لڑکی کو دیکھنے لگا۔ جو کہیں سے بھی اس بچے کی مما نہیں لگ رہی تھی۔ لیکن بچہ اگر کہہ رہا تھا تو یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اب وہ ساری کہانی اپنی مما کو سنا رہا تھا۔ جو بات سن کر سعد کی

طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ ہانی کی وجہ سے آپ کو کافی تکلیف اٹھانی پڑی۔" بڑے شائستہ انداز میں اس نے سعد کا شکریہ ادا کیا تھا۔

"کوئی بات نہیں، او کے بیٹا میں چلتا ہوں۔ اللہ حافظ۔" مسکراتے ہوئے وہ واپسی کے لیے مڑا تھا۔

"ارے انکل رکیں، آپ نے اپنا نام تو مجھے بتایا ہی نہیں۔" ہانی ایک دم آ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹا تھا۔

"میرا نام سعد ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"تو پھر آپ کی مما آپ کو پیار سے کیا کہتی ہیں؟" اس کے اس معصوم سے سوال پر سعد کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

"میری مما کی ڈیتھ ہو چکی ہے اور آپ باتیں ختم کریں اور اندر جائیں کیونکہ سردی کافی ہو گئی ہے۔" وہ ایک دم اٹھا تھا۔

"میرے پاپا کی طرح آپ کی مما کو بھی اللہ میاں نے اپنے پاس بلا لیا ہے؟"

اس کے اس طرح کہنے سے سعد کو دھچکا سا لگا تھا۔ اس نے اس لڑکی کی جانب دیکھا تھا جس کی آنکھوں کی ویرانی ہانی کی بات کی تائید کر رہی تھی۔

"انکل! آپ ہمارے گھر آئیں نا، میں آپ کو اپنی نانو سے ملواتا ہوں۔" ہانی اس کا ہاتھ پکڑے اسے اندر آنے کو کہہ رہا تھا۔ سعد کو خود یہ بات معلوم نہ تھی کہ وہ جہاں بھی جاتا ہے بچے پہلے ہی ملاقات میں اس کے دیوانے کیوں ہو جاتے ہیں۔

"بیٹا! میں پھر کبھی آپ کے گھر آؤں گا۔ ابھی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ آپ اپنی مما کے ساتھ جاؤ۔ اللہ حافظ۔" وہ اسے پیار کرتا ہوا واپسی کے لیے مڑا تھا۔

"انکل آپ پرامس کریں۔ آپ پھر ہمارے گھر آئیں گے۔"

اس کی مما اسے اٹھا کر اندر لے جا رہی تھی اور وہ اونچی آواز میں بولتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ سعد اس کی بات کے جواب میں صرف مسکرا سکا تھا۔ کیونکہ اس کے جواب سے پہلے ہی وہ گیٹ سے اندر داخل ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے اور اس کے تھکے تھکے قدم واپسی کے لیے مڑے۔

"شکر ہے یہ بچہ مجھ جتنا بدنصیب نہیں۔ اس کی ماں تو اس کے پاس ہے نا۔ میری طرح ہوش سنبھالنے کے بعد پہلا ہی دکھ والدین سے محرومی کی صورت میں تو نہیں ملا۔" آنکھیں جلنے سی لگیں۔

فلیٹ میں داخل ہوتے ہی ویرانی اور بے چینی پہلے سے زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ لائٹ آن کیے بغیر وہ صوفے پر ڈھے سا گیا۔ اور اس سے پہلے کہ ماضی کو یاد کرتے ہوئے آنکھیں برسنے لگتیں اس کا موبائل بج اٹھا تھا۔ جگمگاتی اسکرین پر کائنات کا نام دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے سب کچھ بھول سا گیا۔

"سعدی! کہاں ہو تم؟ مجھے تم سے ملنا ہے۔"

"صبح ہی تو آفس میں ملے تھے۔" وہ حیرانی سے بولا تھا۔

"تم سے مل کر بات کرتی ہوں۔ تم فلیٹ میں ہی ہو نا؟"

"تم میرے گھر آ رہی ہو۔ اس وقت، کیا دانیال ساتھ ہے؟" اس کے سوال کے جواب میں ادھر سے بھی سوال کیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ دانیال کے ساتھ اس کے گھر بہت دفعہ آ چکی تھی لیکن اکیلے میں کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا اور نہ کبھی سعد نے اسے آنے کے لیے کہا تھا۔ اس لیے وہ ناگواری سے بولا تھا۔

"دانیال میرا باڈی گارڈ تو نہیں کہ جہاں میں جاؤں، وہ میرے ساتھ ہو اور نہ میں کوئی دودھ پیتی بچی ہوں کہ کسی کا ساتھ ہونا ضروری ہو۔ تم فون رکھو، میں آ رہی ہوں۔" کائنات کو بھی اس کی بات پر غصہ آ گیا اور اس کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھے بنا ہی اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا اور وہ مسکرا دیا۔

"کائنات اگر تم دودھ پیتی بچی ہوتیں تو میں کبھی تمہیں اپنے گھر آنے سے نہ روکتا۔ خیر تم میرے فلیٹ کے قریب ریسٹورنٹ میں پہنچو میں فریش ہو کے وہیں آتا ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی اس نے کائنات کی بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔

"کائنات تم مجھے دانیال کے توسط سے ملی ہو، اور میں ہمیشہ تمہیں اس کے ساتھ ہی ملنا چاہوں گا۔ اس سے آگے تو میں اپنی سوچ کی بھی حد بند کر سکتا ہوں عمل تو بہت دور کی بات ہے۔"

وہ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھوتا ہوا کائنات اور دانیال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

جب وہ ریستوران میں داخل ہوا تو اس کی پہلی نظر ہی کائنات پر پڑی تھی جو برا سا منہ بنائے گھڑی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ سعد کاؤنٹر پر کافی کا آرڈر دے کر کائنات کی طرف آیا اور سلام کرتا ہوا کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"سعدی! تم بہت بے مروت ہو، کوئی بھلا اپنے دوست کو یوں کہتا ہے کہ تم میرے گھر نہ آنا۔ میں کون سا تمہیں کھا جاتی۔"

وہ ابھی تک غصے میں تھی۔ لیکن جواب میں وہ مسکرایا تھا۔

"کائنات تم جلدی سے مجھے بات بتاؤ کیونکہ مجھے بہت سخت نیند آ رہی ہے۔ اور صبح آٹھ بجے میری میٹنگ ہے۔ تو نیند پوری ہو گی تو آفس ٹائم سے پہنچوں گا نا۔"

وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا تو نرمی سے تھا لیکن بات کافی بے مروتی والی کی تھی۔

"سعد! تم میری باتوں کو سنجیدگی سے کیوں نہیں لیتے۔ مما، پاپا مجھ پہ شادی کے لیے زور ڈال رہے ہیں۔ تم کب آ کر ان سے بات کرو گے۔ تم میری فیلنگز کو کیوں نہیں سمجھ رہے؟" ایسا لگ رہا تھا وہ ابھی رو دے گی۔

"کائنات تم خود کو اور اپنے جذبوں کو اتنا ارزاں کیوں کر رہی ہو۔ میں نے تمہیں پہلے بھی واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ میں تمہیں صرف اپنی ایک اچھی دوست سمجھتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ تم بار بار ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ مت کیا کرو۔" وہ بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"لیکن سعدی مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کیوں تم یہ بات کہتے ہوئے اپنی نظریں جھکا لیتے ہو۔ تمہارا لہجہ اتنا ٹوٹا ہوا اور بکھرا ہوا کیوں ہوتا ہے۔ میں جانتی ہوں تم یہ سب کچھ صرف دانیال کی وجہ سے کر رہے ہو۔ کیونکہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور تم اس کی محبت میں یہ کہہ رہے ہو۔ لیکن یاد رکھنا میں ایسا کچھ بھی نہیں ہونے دوں گی۔"

سعد کے برعکس اس کا لہجہ بڑا سلگتا ہوا اور مشتعل تھا۔

"کائنات! فرض کرو تم جو کہہ رہی ہو وہ درست بھی ہے تو پھر میں بھی غلط نہیں کر رہا۔ کیونکہ مجھے دانیال اور تم دونوں ہی بہت عزیز ہو۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم دونوں کو زندگی میں کبھی کوئی دکھ ملے۔ اگر تمہاری

بہنوں کے لیے خوش خبری
آج ہی تشریف لائیں اور
30% فیصد ڈسکاؤنٹ
حاصل کریں ہماری شاپ پر موجود
تمام کتب کی سیل جاری ہے
یہ رعایت صرف کراچی کی بہنوں کے لیے ہے
شاپ کا پتا:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

شادی دانیال سے ہوتی ہے تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں۔ کیونکہ وہ نہ صرف تمہارا کزن ہے بلکہ بہت اچھا دوست بھی ہے۔ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔ تم دونوں کا فیملی بیک گراؤنڈ اور اسٹیٹس میچ کرتا ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ کبھی کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہو گی۔ جبکہ میں تو تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ جس کی زندگی کی پہلی حقیقت یہ ہے کہ وہ یتیم ہے۔ جس کا پہلا گھر یتیم خانہ ہے۔ جس کے پاس محرومیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مجھے اپنے والدین کا نام تو بہت دور کی بات، اپنا پورا نام نہیں معلوم۔ تو اچھے برے خاندان کا کیسے پتا چلتا۔ یہ جو تم میرے پاس جاب دیکھ رہی ہو یہ دانیال کی وجہ سے ہے۔ ورنہ بی۔ اے پاس اور چند کورسز پر مجھے کسی اچھے ہوٹل میں ویٹر کی جاب بھی نہ ملتی۔ وہ تو دانیال کا پیار ہے جو اسے مجھ میں نجانے کون کون سے ٹیلنٹ نظر آتے ہیں۔ اور یہ جو لگژری فلیٹ ہے یہ بھی اس نے دیا ہے۔ ورنہ میں یتیم خانے کے بعد جس کٹیا نما کمرے میں رہتا تھا وہاں تمہارے گھر کے نوکر بھی رہنا پسند نہ کریں۔ میری یہ گاڑی، یہ قیمتی کپڑے سب کچھ دانیال کے توسط سے ہے۔ میرے پاس اپنا کچھ بھی نہیں۔"

"تمہیں اور تمہاری صلاحیتوں کو میں جانتی ہوں، مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔" وہ جارحانہ انداز میں بولی۔

"اور کائنات! ان باتوں کے علاوہ جو سب سے اہم بات ہے وہ یہ ہے کہ تم خود دو دن میں ٹوٹ جاؤ گی۔ یہ ساتھ تمہارے لیے مجبوری بن جائے گا۔ جب تمہیں اپنے اسٹیٹس سے نیچے آنا پڑے گا۔ تو تم روز جیو گی اور روز مرو گی۔ اور کائنات! اللہ تعالیٰ نے تمہیں بہت مکمل زندگی دی ہے اور میں کچھ بھی نہیں لیکن میں رب کی اس تقسیم پر دل سے راضی ہوں۔ بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ لیکن تمہارا ساتھ مجھے احساس کمتری میں مبتلا کر دے گا۔ میں تم تک پہنچتے پہنچتے تھک جاؤں گا اور ہمارے لیے بے زاری اور اکتاہٹ کے سوا کچھ نہیں بچے گا۔ بجائے اس کے کہ ہم بعد میں پچھتائیں ہمیں صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنا چاہیے۔"

وہ اتنی تلخ باتیں بڑے نارمل موڈ میں کر رہا تھا۔ لیکن اس کی خوب صورت آنکھوں میں نہ جانے کیوں سُرخی اترتی جارہی تھی۔

"سعد! تم تو ایسے مجھے یہ باتیں بتا رہے ہو جیسے میں کچھ جانتی ہی نہ ہوں ساری حقیقت جاننے کے باوجود سوچ سمجھ کر تم سے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔" وہ جیسے اسے تسلی دے رہی تھی۔

"تم نے حقیقت کو صرف جانا ہے۔ جاننے اور برتنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں کبھی مر کے بھی یہ نہیں چاہوں گا کہ تم ان حقیقتوں کو بدلو۔ اور شادی کا فیصلہ تم نے کیا ہے، میں ایسا بالکل نہیں چاہتا۔"

وہ اس کو ہر حال میں خود سے مایوس کرنا چاہتا تھا۔

"سعد! تم مجھے ڈی گریڈ کر رہے ہو۔ تمہیں اندازہ ہے تمہاری باتیں مجھے کتنا ہرٹ کر رہی ہیں۔" وہ جو کب سے آنسو روکے بیٹھی تھی اپنا ضبط کھو بیٹھی اور آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے خوب صورت گالوں پر گرنے لگے۔

"نہیں کائنات! میں تمہیں ڈی گریڈ ہونے سے بچا رہا ہوں۔ جو کہ تم میرا ساتھ پا کر ہو جاؤ گی۔ تمہیں میری باتیں وقتی طور پر ہرٹ کر رہی ہیں۔ لیکن میری بات مان کر تم آئندہ زندگی میں کبھی ہرٹ نہیں ہو گی اور پلیز ایک اچھا دوست سمجھ کر میرا مشورہ مانو اور دانیال سے شادی کر لو۔ تم اس کے ساتھ اتنی خوش رہو گی کہ ایک دن تمہیں یہ ساری باتیں حماقت لگیں گی۔"

اس نے اس کے آنسوؤں سے نظریں چراتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔

"لیکن وہ حماقت میری زندگی کا خوب صورت سچ ہو گی۔" یہ بات کہہ کر وہ رکی نہ تھی۔ بلکہ اٹھ کر چلی گئی۔ لیکن سعد میں اتنی سکت بھی نہ رہی کہ وہ سر اٹھا کر اسے جاتا ہوا دیکھ سکے۔

"کائنات تم مجھ سے پیار کرتی ہو یہ بات تمہاری زندگی کا خوب صورت سچ ہے۔ لیکن یہ سچ میرے لیے پوری زندگی ہے۔ جب میں تمہاری بات رد کرتا ہوں تمہیں دکھ دیتا ہوں تو میرا روم روم روتا ہے۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ میں یہ سب کچھ دانیال کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ لیکن اگر دانیال ہمارے درمیان نہ بھی ہوتا تب بھی میں تم سے شادی نہ کرتا۔ تم شاید کبھی نہ سمجھ سکو۔ لیکن یہ بھی میری محبت کا ایک رنگ ہے جو فی الحال تمہیں تکلیف دے رہا ہے لیکن آئندہ کی تمہاری زندگی بہت سہل کر دے گا۔"

کائنات کب کی چلی گئی تھی لیکن سعد مستقل اسی طرف دیکھ کر باتیں کیے جا رہا تھا جہاں وہ بیٹھی تھی۔ وہ اس سے زیادہ خود کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس رات سردی کے باوجود نجانے کتنی دیر وہ سڑکوں پر گھومتا رہا۔ لیکن باہر کی سردی سے اندر کی آگ سرد نہیں ہوئی۔

☆☆☆

سعد ان بدنصیب بچوں میں سے تھا جن کی پرورش یتیم خانے میں ہوئی ہے۔ وہ وہاں کیسے پہنچا؟ اسے وہاں کون لایا؟ اس کے ماں باپ کون ہیں؟ ان سوالوں کے جواب اس کے پاس نہ تھے اور نہ ہی اس نے کبھی جاننے کی کوشش کی تھی۔ اسے یہاں ہونے کا کوئی دکھ نہ تھا کیونکہ وہ باہر کی دنیا کے بارے میں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کبھی خوشی کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ بس ایک عجیب سی بے حسی ہر وقت مسلط رہتی تھی۔ کوئی خواہش، کوئی جستجو، کوئی امنگ نہ تھی۔ بس ایک بندھی روٹین میں وقت گزرتا گیا۔

یتیم خانے کا مالک بہت اچھا انسان تھا۔ جن کو وہ سب بابا کہتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف کھانے پینے اور رہائش کی ذمہ داری اٹھائی بلکہ تعلیم و تربیت کا بھی مقدور بھر خیال رکھا۔ ان کی ہی سرپرستی میں اس نے باقی بچوں کے ساتھ سرکاری اسکول اور کالج میں پڑھا اور بی۔ اے پاس کرنے کے بعد اسے یتیم خانے کے مالک کی توسط سے ایک بہت بڑی مارکیٹ میں سیلز مین کی جاب مل گئی۔ اس کے ساتھ کئی اور لڑکے بھی تھے جن کو جاب دلوا کر انہوں نے سب کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دیا۔ ان کا رابطہ آج بھی اس یتیم خانے کے ساتھ تھا جو کہ اٹوٹ تھا۔ لیکن اب وہ بھی عام لوگوں کی طرح زندگی کی دوڑ دھوپ میں شامل ہو گئے۔

یتیم خانے سے نکلتے وقت بابا جان کی نصیحت سعد کو آج بھی لفظ بہ لفظ یاد تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔

"شروعات ہمیشہ زیرو سے ہوا کرتی ہیں لیکن اللہ کے کرم اور اپنی محنت و دیانت داری سے اس زیرو کے ساتھ ایسا ہندسہ ضرور لگتا ہے جو اس کی قدر و قیمت بڑھا کر ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ زندگی میں کبھی مایوس نہ ہونا۔ اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر دل سے راضی رہنا، کبھی غلط راستے کا انتخاب نہ کرنا۔ تمہیں تمہارا حصہ ضرور ملے گا۔"

بابا جان خود تو اس دنیا میں نہ رہے لیکن ان کے الفاظ کی روشنی ہمیشہ سعد کے راستے میں رہی۔ سعد بہت محنت سے کام کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ زیادہ نہ تھی لیکن اس کی ضروریات کے حساب سے کافی زیادہ تھی۔ اس نے شروع سے ہی عادت بنالی۔ اپنی تنخواہ کے تین حصے کرتا۔ ایک اپنے خرچ کے لیے۔ ایک سیونگ کے لیے اور ایک یتیم خانے میں رہائش پذیر بچوں کے لیے چھوٹے چھوٹے گفٹ میں خرچ کرتا۔ بچت وہ اس لیے کرتا تھا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اس کا اپنا ایک گھر ہو۔ جہاں وہ اپنی مرضی سے رہ سکے۔

☆☆☆

وہ ایک عام سا دن تھا۔ سعد جس شاپ پہ کام کرتا تھا آج وہاں معمول سے کچھ زیادہ ہی رش تھا۔ ہر گاہک چاہتا تھا کہ اس کو پہلے فارغ کیا جائے اور سعد ان کی ڈیمانڈ پوری کرتے کرتے ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ جب اس کی نظر ایک ڈیسنٹ سی خاتون پہ پڑی تھی۔ جو کونے میں پڑی کرسی پہ بیٹھی جیسے کسی کو بلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن اس شور میں ان کی کون سنتا۔ ان کی خطرناک حد تک زرد ہوتی رنگت اور تشویش ناک حالت سے سعد چونکا تھا۔ وہ سب گاہکوں کو چھوڑ کر ان کی طرف بھاگا۔ آج گرمی حد سے زیادہ محسوس ہو رہی تھی اس لیے وہ جلدی سے پانی

کا گلاس لے کر ان کے پاس آیا۔

"آنٹی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وہ پانی کا گلاس ان کی طرف بڑھاتے ہوئے پریشانی سے بولا تھا۔ لیکن دوسری طرف یقیناً پانی کی ضرورت نہ تھی۔ وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہی تھیں۔ اور اسے ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھا بھی رہی تھیں۔ کیونکہ وہ کوشش کے باوجود بول نہیں پا رہی تھیں۔

سعد کو ان کی حالت دیکھ کر ان کا اشارہ سمجھنے میں صرف ایک پل لگا۔ ان پر (استھیما) کا اٹیک ہوا تھا اور ان کو ان ہیلر چاہیے تھا۔

"آنٹی آپ کا ان ہیلر کہاں ہے؟ ان کے فرش کی طرف اشارہ کرنے پر اس نے وہاں دیکھا تو ان کا بیگ وہیں گرا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اٹھا کر وہ کھولا لیکن بار بار دیکھنے پر بھی اسے وہاں ان ہیلر نظر نہ آیا تھا۔

"آنٹی آپ کے بیگ میں ......" باقی کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ کیونکہ وہ خاتون ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی تھیں۔ ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ ان کی یہ حالت سعد کے ہاتھ پاؤں پھلانے کے لیے کافی تھی۔

"خرم بھائی میں ان کو ہاسپٹل لے کر جا رہا ہوں۔" اس نے خاتون کا بیگ گلے میں ڈالا اور ان کو اپنی بانہوں میں اٹھاتے ہوئے دکان کے مالک سے کہا تھا۔

"سعد اپنا خیال رکھنا کوئی پرابلم ہو تو مجھے فون کر لینا۔ اس طرح کی سچویشن میں پولیس ضرور انوالو ہوتی ہے۔"

خرم نے اسے اونچی الفاظ میں خبردار کیا تھا۔ لیکن اس وقت تک وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ اس مصروف ترین علاقے میں جو پرائیویٹ ہاسپٹل ہے اس کا بل وہ اپنی سال بھر کی تنخواہ سے بھی ادا نہیں کر سکے گا۔ اس کے لیے بس یہی بات تسلی بخش تھی کہ وہ وقت پر ہاسپٹل پہنچ گیا تھا۔

ان خاتون کا ٹریٹمنٹ ہونے کے بعد ان کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ ڈاکٹر بتا رہے تھے کہ ان پر بہت شدید استھیما کا اٹیک ہوا تھا۔ اگر ان کو بروقت ٹریٹمنٹ نہ ملتی تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

کسی کے کام آنے سے کتنا سکون ملتا ہے یہ احساس آج سعد کو بڑی شدت سے ہوا تھا۔ حالانکہ اس سکون کے لیے اس کی پانچ سالہ بچت کا بڑا حصہ ہاسپٹل کے بل کی صورت میں خرچ ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ مطمئن تھا۔ مریض کو کمرے میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔

"آپ ان سے مل سکتے ہیں۔" نرس کی آواز اسے خیالوں کی دنیا سے باہر لے آئی اور وہ سر جھٹکتے ہوئے نرس کے بتائے ہوئے کمرے میں آ گیا۔

"آنٹی اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" وہ مسکراتے ہوئے ان کے پاس آ گیا۔

"بہت خوش نصیب ہے وہ ماں جس کو رب نے تم جیسا بیٹا دیا ہے۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے لبوں سے لگا لیا۔ تو وہ مسکرا دیا۔ ماں کیا ہوتی ہے، اس کا احساس آج اسے اس شفیق عورت کے بوسے سے ہوا تھا۔

"آپ کو یوں اکیلے شاپنگ کے لیے نہیں نکلنا چاہیے تھا اور وہ بھی ان ہیلر کے بغیر۔" اس نے بڑی نرمی سے کہا تھا۔

"ارے بیٹا اکیلی کہاں تھی، ڈرائیور ساتھ تھا۔ اسے گروسری کے سامان کی لسٹ پکڑائی کہ تم یہ خریدو میں اپنے بیٹے کے لیے کچھ نئے ڈریس دیکھنے تمہاری شاپ میں آئی تھی اور وہیں پر طبیعت خراب ہو گئی۔ لیکن ان ہیلر بیگ میں نہ ہونا میرے لیے بھی اچنبھے کی بات ہے۔ شاید کہیں گر گیا، لیکن اچھا ہی ہو ورنہ مجھے تم جیسا اچھا بیٹا نہ ملتا۔" وہ مسکرا کر بات کرتی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

"آنٹی یہ آپ کا بیگ، میں نے آپ کے گھر والوں کو انفارم کرنا تھا لیکن آپ کے بیگ میں فون بھی نہیں ہے۔ آپ نمبر بتائیں تاکہ میں انہیں انفارم کر سکوں۔" اس نے موبائل نکالتے ہوئے کہا تھا۔ اور وہ اپنے بھلکو پن پر ہنستے ہوئے اسے نمبر بتانے لگیں۔

اور پھر اس کے فون کرنے کے بعد تقریباً آدھے گھنٹے میں ہی ان کا بیٹا اور شوہر ہاسپٹل میں موجود تھے۔ سعد حیرانی سے اس لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ جو اپنی ماں سے ایسے مل رہا تھا جیسے برسوں بعد ملا ہو۔ اس خوب صورت اور مکمل منظر میں اسے اپنا آپ بڑا غیر ضروری لگا تھا۔ وہ چپکے سے وہاں سے باہر آ گیا۔

"اگر میرے پاس بھی ماں باپ جیسی نعمت ہوتی تو میری زندگی میں بھی ایسے ہی خوب صورت اور مکمل منظر ہوتے۔" آج دل میں بڑے انوکھے سے احساس نے انگڑائی لی تھی۔ اگر "ماں" کا احساس اتنا خوب صورت اور خوش کن ہوتا ہے تو اس کی تعبیر کتنی خوش کن ہوتی ہوگی۔ وہ دل سے مسکراتے ہوئے اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

"ایکسکیوز می، کل یہاں پہ ایک خاتون کی طبیعت خراب ہوئی تھی اور آپ کی شاپ سے شاید کسی ورکر نے ان کی مدد کی تھی۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔"

سعد کے کانوں نے یہ فقرہ اس وقت سنا جب وہ کسی کسٹمر سے ڈیلنگ کر رہا تھا۔ اور جب اس نے آواز کی سمت دیکھا تو اسے ان خاتون کا بیٹا نظر آیا جو کل ہاسپٹل میں آیا تھا۔ جو اسی کے بارے میں خرم بھائی سے پوچھ رہا تھا۔ پھر اس نے اس لڑکے کو اپنی طرف آتے دیکھا تھا۔

"ہیلو میں دانیال احمد یزدانی ہوں۔ کل آپ نے میری ماما کی جان بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔ میں نے شاپ اونر سے بات کر لی ہے۔" بڑی شائستگی سے بولتا وہ اسمارٹ سا لڑکا سعد کو بہت اچھا لگا۔ امارت تو اس کی ہر ہر ادا سے جھلک رہی تھی لیکن غرور کا شائبہ تک نہ تھا۔ تب ہی وہ بڑی سادگی سے بات کر رہا تھا۔

"میرا نام سعد ہے۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ آپ چھوٹی سی بات کو لے کر بڑا تکلف برت

معیاری مختصر، معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ
Emale: id@khawateendigest.com

اپریل
2019
کے شمارے کی
ایک جھلک

سلطان محمد فاتح
ملت اسلامیہ کے لازوال کردار "سلطان محمد فاتح" کے کارہائے
نمایاں کی سبق آموز داستان
محترمہ شاہدہ لطیف کی سلسلہ وار کہانی کی ایک اور کڑی،

فسانۂ عجائب
ایک شقی القلب شوہر کی کہانی جس نے اپنی اپاہج بیوی پر رحم نہیں کھایا،
ایم الیاس کی سوچنے پر مجبور کر دینے والی تحریر،

قاتل چہرے
ہر واردات کے بعد پکڑا جاتا، ایک نوجوان کی مشکلات جو قتل کی
واردات کا عینی شاہد تھا،
صائمہ عروج کا منفرد انداز،

مراد عالی
انسان جو بوتا ہے وہی فصل کاٹنی پڑتی ہے،
جاوید راہی کے قلم سے تخلیق پانے والی یادگار کہانی،

یقین کیوں نہ ہوا
ایک یتیم بچہ جسے ایک مجسمے کی حسین آنکھوں کی پھوٹتی ہوئی
محبت کی شعاعوں نے مسحور کر دیا تھا،
صدف بنت راحت کے قلم کی روانی،

کاش کہ
زلزلے کے دوران اپنے والدین سے بچھڑے ہوئے ایک بچے کے احساسات،
سلیمان حبیب کے قلم کا جادو،

اس کے علاوہ دیس بدیس کی رومینس، سسپنس اور تجسس سے
بھرپور 9 مشہور و معروف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

اپریل 2019 کا تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

رہے ہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ جواب میں اپنی عادت کے مطابق بڑی نرمی سے بولا تھا۔

''میں آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لوں گا۔ پلیز آپ تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ چلیں۔'' اس کے اس طرح منت بھرے انداز پر سعد شرمندہ سا ہوا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

دانیال نے بڑے احترام سے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا تھا۔

''سعد! آپ کو اندازہ نہیں میری مما آپ کو کتنی شدت سے یاد کر رہی ہیں۔ آپ کے لیے ان کے لہجے میں وہی پیار چھلک رہا ہے جو میں اپنے لیے محسوس کرتا ہوں اور اب وہ جلد از جلد آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔'' وہ بڑے خوشگوار موڈ میں بات کر رہا تھا۔

''دیکھیں آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ میری جگہ اگر کوئی بھی وہاں موجود ہوتا تو یہی کرتا۔'' سعد کو اس رویے کی عادت جو نہیں تھی۔

''ہرگز نہیں، اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میری مما کو اگنور بھی کر سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ میری مما کا کریڈٹ کارڈ اور بیگ اڑا لے جاتا۔ لیکن آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ آپ نے اتنے مہنگے ہاسپٹل کا بل بھی اپنی جیب سے ادا کیا۔ ہمیں انفارم کیا۔ لیکن شکریہ کا موقع دیے بغیر وہاں سے غائب ہو گئے۔'' وہ جیسے اس سے شکوہ کر رہا تھا۔

''اوہو، تو آپ یقیناً بل کی پے منٹ کے لیے مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔'' اس نے دانیال کی باتوں کا یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔

''نہیں، میں اس شخص سے ملنا چاہتا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے میری مما کی جان بچانے کا وسیلہ بنایا ہے۔'' بڑی خوب صورت بات کہہ کر اس نے گاڑی بہت شان دار گھر کے سامنے روکی تھی۔ لمحے بھر میں گیٹ کھلا ہوا اور گاڑی پورچ میں آ کر رک گئی۔

سعد مبہوت سا گاڑی سے باہر آیا۔ ایسا خوب صورت گھر سعد نے اتنے نزدیک سے اور حقیقت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ دانیال کی معیت میں اس محل جیسے گھر میں داخل ہوا تھا۔ اور مسز یزدانی تو جیسے اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ سعد بڑی عقیدت سے اس پرشفیق خاتون کے سامنے سلام کرنے کے لیے جھکا تھا۔ جنہوں نے اسے ماں جیسے خوب صورت رشتے سے روشناس کرایا تھا۔ انہوں نے بھی بڑے پیار سے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔

''اگر تم نہ آتے تو میں ناراض ہو جاتی۔'' وہ بڑے مان سے کہہ رہی تھیں۔ سعد بس ہولے سے مسکرا دیا۔

اس کے بیٹھنے کی دیر تھی، اس کی خاطر مدارت کے لیے انواع و اقسام کی چیزیں اس کے سامنے رکھ دی گئیں اور مسز یزدانی خود اس کی تواضع کرنے لگیں۔ وہ نروس ہو رہا تھا۔ جب ایک گریس فل سا شخص سلام کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

''سوری جینٹل مین، مجھے دیر ہو گئی۔ مجھے احمد یزدانی کہتے ہیں۔'' وہ اس سے گلے ملتے ہوئے اپنا تعارف کرا رہے تھے۔ اور سعد اتنے پرتکلف ماحول میں اتنے سادہ مزاج لوگوں سے مل کر حیران ہو رہا تھا۔ جو نہ جانے اس کے ساتھ ایسا ہی ہو کر رہے تھے یا حقیقتاً سادہ مزاج تھے۔ یقیناً وہ مسز یزدانی سے بہت پیار کرتے تھے جو انہوں نے اس کی چھوٹی سی نیکی کو اتنا بڑا احسان مان لیا تھا۔

اس کے مختصر سے تعارف پر وہ تینوں ہی چند لمحوں کے لیے ششدر رہ گئے۔ اس نے تو بات برائے بات کی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ بات اس کی زندگی بدل دے گی۔ اسے چاہنے والی ماں ملی، باپ ملا اور ایک مخلص بھائی جیسے اسی کے ملنے کا انتظار کر رہا تھا۔

احمد یزدانی نے اسے اپنے آفس میں بغیر کسی تجربے کے اچھی پوسٹ پر بٹھا دیا۔

''لیکن انکل! میں اس قابل نہیں ہوں۔'' کے جواب میں دانیال نے اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ میں تمہیں سب کچھ سکھا دوں گا اور جب لگژری فلیٹ اور کار کی چابی اس کے ہاتھ میں پکڑائی تو اس کے کچھ بولنے سے پہلے کہا گیا کہ اس پوسٹ کے لیے یہ مراعات مخصوص ہیں۔ وہ لوگ یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھے کہ وہ اس پر مسلسل احسان کیے جا رہے ہیں۔

زندگی کے اس موڑ پہ آ کے وہ دنگ تھا۔ اسے اس کی اوقات سے بڑھ کر ملا تھا۔ اتنے کی تو اس نے چاہت بھی نہ کی تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتا، جس نے اسے جھولی بھر بھر نوازا تھا۔ وہ اب بہت خوش رہنے لگا۔ دانیال کی سنگت میں اس کی ذات میں خوش گوار تبدیلیاں آئیں۔ اس کی ہر شام دانیال کے گھر مسز یزدانی کے ساتھ گزرتی تھی۔ جنہیں ان کی خواہش پر وہ دانیال کی طرح مما کہتا تھا۔

وہ صبح ناشتہ اپنے فلیٹ میں کرتا تھا۔ لنچ وہ دانیال کے ساتھ کرتا جو مما بڑے پیار سے بھیجتی تھیں اور ڈنر بھی مہینے میں دو تین دفعہ وہ اس پیاری سی فیملی کے ساتھ کرتا تھا۔ صرف یہی نہیں، ہفتے میں ایک دن مما خود اس کے فلیٹ میں آتی تھیں۔ ان کا مشفقانہ رویہ بالکل حقیقی ماؤں جیسا تھا۔ ملازم سے کہہ کر اس کے فلیٹ کی مکمل صفائی کرواتیں۔ اچھے کھانے فریز کرتیں۔ اور وہ خواب کی سی کیفیت میں انہیں دیکھے جاتا۔ بھلا دنیا میں کسی کے ساتھ یوں بھی ہوا ہوگا۔

اور پھر ایک دن آفس میں دانیال نے اس کی ملاقات اپنی کزن کائنات حسن سے کرائی جو کہ ان ہی کی فرم میں — لیگل ایڈوائزر کے طور پر کام کرتی تھی۔ سعد کو اس گڑیا جیسی نازک لڑکی کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کیسے وہ اتنی بڑی فرم کی یہ پوسٹ سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کا اظہار اس نے دانیال سے بھی کیا جس کے جواب میں وہ مسکرا دیا۔

''ارے ان کا گھر وکیلوں کا گڑھ ہے۔ تم نے ایڈووکیٹ حسن سرفراز کا نام تو سن رکھا ہوگا، موصوفہ ان ہی کی صاحبزادی ہیں۔ دونوں بیٹے محسن سرفراز اور احسن سرفراز بھی وکیل ہیں اور یہ محترمہ بڑی منتوں سے اس فرم کو جوائن کرنے پر راضی ہوئی ہیں۔ میری بہت اچھی دوست بھی ہے۔''

کائنات کے ذکر پر اس کے چہرے پر بڑا خوش گوار سا تاثر ابھرا تھا۔

''لیکن مجھے تو دوستی سے زیادہ کچھ اور محسوس ہو رہا ہے۔'' سعد شرارت سے بولا تھا۔

''ہاں یار! مما کہہ رہی تھیں کہ وہ میری شادی اسی سے کریں گی اور تجھے تو معلوم ہے کہ میں مما کا کتنا فرماں بردار ہوں۔''

اس بات پر دونوں نے خوب زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ لیکن آنے والے دنوں میں کائنات کے رویے نے سعد کو چونکا دیا۔ اسے لگا کہ وہ اس کی ذات میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لیتی ہے۔

وہ اور دانیال جہاں ہوتے اس کا وہاں ہونا لازمی تھا۔ شروع میں تو اس نے اپنا وہم جانا کہ ہو سکتا ہے وہ صرف اسے دانیال کا دوست سمجھ کر اس سے اتنی بے تکلف ہو لیکن نہیں، یہ اس کا وہم ہرگز نہ تھا بلکہ حقیقت تھی اور یہ اس نے تب جانا جب کائنات نے اس سے کھل کر اظہار کیا۔

وہ ایک آزاد معاشرے میں پلنے والی باشعور لڑکی تھی جسے اپنی زندگی کا ہر فیصلہ خود کرنے کی عادت تھی تب ہی اس نے انتظار نہ کیا اور اظہار میں پہل کر دی۔ لیکن سعد جیسے محتاط بندے کو اس کا انداز اچھا نہ لگا دوسری طرف وہ دانیال کی پسندیدگی سے بھی واقف تھا۔ اس لیے اس نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن وہ کافی مستقل مزاج واقع ہوئی اور اس کی یہ مستقل مزاجی سعد پر اثر کرنے لگی۔

آخر وہ بھی گوشت پوست کا انسان تھا۔ سعد بھی آہستہ آہستہ پگھلنے لگا۔ اس کا دل بھی کائنات کے ساتھ کے لیے ہمکنے لگا۔ اب بات یک طرفہ نہ رہی۔ سعد بھی پیار جیسے جذبے کے آگے ہار گیا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ضروری نہیں کہ اس ہار کا انجام کسی کو پانے پر ہی منتج ہو۔ اس نے خود پر کڑے پہرے لگا لیے۔ اپنے دل میں پنپنے والے ان جذبوں کی خبر اس نے

دانیال اور کائنات کو کبھی نہ ہونے دی۔

یہ اس کا اور اس کے دل کا معاملہ تھا۔ تیسرا کوئی راز دار نہ تھا۔ اس کے لیے یہ احساس ہی حاصل زندگی تھا کہ کائنات جیسی لڑکی اس کو چاہتی ہے۔ اس احساس کو اس نے قیمتی سیپ کی طرح اپنی مٹھی میں بند کر لیا۔ لیکن حیران وہ اس بات پر تھا کہ کائنات اس سے مایوس کیوں نہیں ہوتی۔ وہ کیوں بار بار اس کے پاس آتی ہے۔ اور اس کے لیے اذیتوں کے در کھول کر چلی جاتی ہے۔

وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی خود کو دانیال کا مجرم سمجھتا تھا اور اس مسئلے کا حل وہ سوچ سوچ کر تھک چکا تھا۔

☆☆☆

رات بھر کی آوارہ گردی اور بے آرامی کی وجہ سے اس کی طبیعت کافی خراب تھی۔ اور دانیال نے پہلی ہی نظر میں اس کا نوٹس لیا تھا۔

"سعد! خیریت، تمہاری آنکھیں اتنی سرخ کیوں ہو رہی ہیں؟"

"میرے خیال میں رات کی سردی کا اثر ہے۔ سر میں درد بھی ہے شاید اسی وجہ سے۔" وہ خواہ مخواہ فائلیں ترتیب سے رکھنے لگا۔

دانیال اس کی لاپروائی سے واقف تھا۔ اسی لیے اس نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھامی تھی۔ جو انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔

"سعد! تمہیں اتنا سخت بخار ہے اور تم پھر بھی آفس آ گئے ہو۔ چلو اٹھو ابھی ڈاکٹر کے پاس اور میڈیسن لے کر گھر جاؤ اور آرام کرو۔" وہ فکرمندی سے بولا تھا۔

"اب اتنا تیز بخار بھی نہیں جتنا تم فکر مند ہو رہے ہو۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے بابا جان کے ساتھ سجاول گردیزی کے آفس جانا ہے۔ بڑی امپورٹنٹ میٹنگ ہے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے ٹائم دیا ہے۔ ادھر سے فارغ ہو کر گھر چلا جاؤں گا۔ تم مجھے چائے پلا دو۔" کنپٹیوں کو مسلتے ہوئے اس نے لاپروائی سے کہا تھا۔

دانیال اسے خفگی سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پرتکلف ناشتے کی ٹرے تھی۔

"دانیال! تم خود کیوں لائے۔ کسی ملازم کے ہاتھ بھجوا دیتے۔" وہ شرمندہ ہوا تھا۔

"ہاں ملازم کے ہاتھ بھجواتا۔ تاکہ تم خیالوں میں گم رہتے اور میٹنگ کا ٹائم ہو جاتا۔" میرے سامنے کھاؤ اور یہ ٹیبلٹ لو تا کہ میری تسلی ہو سکے۔"

پیار کے ایسے مظاہرے اب سعد کی زندگی میں روزانہ ہوتے تھے۔ لیکن وہ ابھی بھی ان رویوں کا عادی نہ ہو سکا تھا۔ اسی لیے اب بھی ٹرانس کی سی کیفیت میں اسے دیکھنے لگا۔

"ویسے سعد! تم بیٹھے بیٹھے کہاں کھو جاتے ہو۔" بریڈ پر جام لگا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"حیران ہوتا ہوں کہ تمہیں مجھ جیسے انسان میں ایسا کیا دکھا کہ تم مجھ سے اتنا پیار کرتے ہو۔" سعد مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"ہاں کبھی کبھی تو میں بھی سوچتا ہوں کہ اتنے برے انسان کو میں نے کیوں دوست بنایا جو ابھی تک مجھ پر یقین نہیں کرتا۔" دانیال چڑ کر بولا تو سعد قہقہہ لگا کر مسکرا دیا۔

"اچھا یار برا کیوں مانتے ہو ابھی تو میں نے تم سے ایک بات شیئر کرنا تھی۔ کل جب میں تمہارے گھر سے باہر نکلا تو تمہارا ٹائیگر ایک کیوٹ سے بچے کو ہراساں کیے کھڑا تھا، بڑی مشکل سے اس کی جان بچائی۔ ہانی نام تھا اس کا تم جانتے ہو گے؟"

دانیال کے رویے نے جیسے ٹانک کا کام کیا تھا۔ اب وہ سب کچھ بھلائے کل والا واقعہ اس سے شیئر کر رہا تھا۔

"ہاں جانتا ہوں، کرنل حیدر کا نواسا ہے۔ بڑا شرارتی ہے اپنی مما اور نانو کو خوب تنگ کرتا ہے۔" دانیال بھی اس کے ذکر پر مسکرا دیا۔

"میں اسے گھر چھوڑنے گیا تھا بتا رہا تھا کہ اس کے بابا کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اس بچے کی ماں بھی بڑی کم عمر سی تھی۔ وہ تو میرڈ بھی نہیں لگتی کجا کہ ایک پانچ چھ سالہ بچے کی ماں ہو۔" وہ اپنی چائے ختم کرتے ہوئے بولا تھا۔

"ہاں یار، ایسا ہی ہے۔ ہمارے کرنل حیدر کی فیملی کے ساتھ بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ بصیرت ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ بی، اے کے فوراً بعد شادی کر دی۔ لیکن بدقسمتی سے ایک سال بعد ہی وہ بیوہ ہو کر پھر سے میکے آ گئی۔ ہانی بھی ننھیال میں ہی پیدا ہوا ہے۔ بیٹی کے غم کو کرنل صاحب نے اتنا دل پہ لیا کہ ایک دن ایسا ہارٹ اٹیک ہوا کہ وفات پا گئے۔ لیکن بصیرت نے خود ہمت سے کام لیا۔ ایوننگ کلاسوں میں اپنا ایم، بی، اے کیا۔ چھوٹی موٹی جابز کیں لیکن تعلیم مکمل ہونے کے بعد اب وہ ایک اچھی پوسٹ پر کام کر رہی ہے۔ لیکن ایک بات تو بتا، تم جیسا ریزرو بندہ یہاں پہ اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ بچے کے کیوٹ ہونے تک تو بات ٹھیک ہے۔ لیکن تمہیں اس کی مما کم عمر بھی لگی، دکھ بھی ہوا، اصل معاملہ کیا ہے؟" دانیال شرارت سے بولا تھا۔

"تمہارے ذہن کا فتور ہے۔ ورنہ اتنے پاکیزہ حسن کے بارے میں کوئی غلط کیسے سوچ سکتا ہے۔"

اس کی شرارت کے جواب میں وہ بھی شرارت سے بولتے ہوئے بریف کیس اٹھا کر اسے مزید بات کرنے کا موقع دیے بغیر باہر نکل گیا اور دانیال اس کے انداز پر مسکرا دیا۔

☆☆☆

ان دنوں کائنات کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ سعد نے بھی اسے منانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسے کسی بھی قسم کی امید نہیں دلانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس کی ناراضی کو مکمل نظر انداز کیے ہوئے تھا۔

آج بھی وہ بیزار سا آفس سے اٹھا تھا۔ دانیال کو کوئی کام تھا وہ اس سے پہلے ہی آفس سے چلا گیا تھا۔ اسی لیے وہ اکیلا تھا۔ گھر بھی جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ اسی لیے وہ وقت گزاری کرنے کے لیے ریستوران میں چلا آیا۔ چائے کا آرڈر دے کر وہ فراغت سے ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب اچانک اس نے ہانی کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ جو بڑے جوش سے اس کے ساتھ لپٹ گیا۔

"ارے ہانی بیٹا آپ یہاں، کس کے ساتھ آئے ہو؟" وہ اس کو اٹھا کر اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے بڑے خوش گوار لہجے میں بولا تھا۔

"انکل آج میرا برتھ ڈے ہے۔ میں اپنی مما کے ساتھ آئس کریم کھانے آیا تھا۔" اس کے اشارہ کرنے پر سعد نے دیکھا تو اتنے میں بصیرت قریب آ چکی تھی۔

"السلام علیکم، کیسی ہیں آپ؟" نہ جانے اس لڑکی میں ایسا کیا تھا کہ احترام کرنے کو دل کرتا تھا۔

"سوری، آج پھر ہانی نے آپ کو ڈسٹرب کیا ہے۔" سلام کا جواب دینے کے بعد وہ بڑی شائستگی سے بولی تھی۔

"ارے نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں بلکہ مجھے تو بہت خوشی ہو رہی ہے۔ آپ کا بیٹا ماشاءاللہ بہت کیوٹ ہے۔" وہ ہانی کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"انکل آج تو میری برتھ ڈے ہے، آپ ہمارے گھر آئیں نا۔" وہ بڑی آس سے پوچھ رہا تھا۔

"آؤں گا۔" منہ سے یہ دو لفظ بلا ارادہ ہی ادا ہوئے تھے۔

"چلو بیٹا! گھر چلو، نانو ویٹ کر رہی ہوں گی۔" وہ یقیناً نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا یوں کسی اجنبی سے فرینک ہو۔

"انکل! آپ پرامس کریں، آپ آئیں گے۔" ہانی کو سعد کچھ زیادہ ہی اچھا لگا تھا۔ "بلکہ آپ ایسا کریں کہ اپنا سیل نمبر دے دیں۔ میں آپ کو یاد کرا دوں گا۔"

جہاں بصیرت اس کی بات پر جز بز ہوئی وہیں سعد اس کے معصوم انداز پر مسکرا دیا اور اس سے پہلے

کہ اس کی مما اس پر غصہ ہوتی، اس نے جلدی سے اسے اپنا نمبر دیا اور پیار کر کے جانے کے لیے کہا تھا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد بھی وہ ان ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ چائے پینے کے بعد وہ جلد ہی ریستوران سے اٹھ آیا اور کسی خیال کے تحت گاڑی کھلونوں کی دکان کے آگے روک دی۔

”کیا ہوا جو میں ہانی کے گھر نہیں جا سکتا۔ میرا گفٹ تو جا سکتا ہے۔“ یہی سوچتے ہوئے اس نے بڑے پیارے کھلونے پیک کرائے تھے۔ ساتھ والی بیکری سے چاکلیٹ کیک پیک کرایا۔ اور کوریئر سروس کے ذریعے یہ گفٹس ہانی کے ایڈریس پر بھیج دیے۔

اس ساری ایکٹویٹی میں اس کا وقت بڑے خوش گوار طریقے سے گزرا تھا۔ اسی لیے اس کا موڈ بھی بہت اچھا ہو گیا اور اس نے گاڑی گھر کے راستے پہ ڈال دی۔

☆☆☆

سعد اس وقت اپنا فیورٹ کارٹون دیکھ رہا تھا جب اس کا سیل بجا تھا۔ دوسری طرف اجنبی نمبر سے جو آواز اس نے سنی تھی وہ اس کی توقع ہرگز نہیں کر رہا تھا۔

”میں بصیرت بول رہی ہوں، ہانی کی مما، دیکھیں جو کچھ آپ کر رہے ہیں وہ ہرگز مناسب نہیں، گفٹ دینے سے آپ کو معلوم ہے، ہانی پہ کتنا بڑا اثر پڑ سکتا ہے۔“ ناگواری میں ڈوبا لہجہ سعد کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔

”گفٹ دینے سے بھلا برا اثر کیسے پڑ سکتا ہے؟“ وہ اس کے سخت لہجے پر شرمندہ ہو گیا۔

”ہانی ابھی بچہ ہے، بہت ناسمجھ ہے۔ وہ کسی بھی اجنبی سے ایسے ہی بی ہیویر کی توقع کر سکتا ہے۔ جو میں ہرگز افورڈ نہیں کر سکتی۔ آپ پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“ آخر میں وہ ملتجی لہجے میں بولی تھی۔

”اس دفعہ معاف کر دیں۔ آئندہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ میں نے واقعی بغیر سوچے سمجھے ہی وہ گفٹ بھیج دیا۔ لیکن آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہو گی۔ آپ پلیز میری ہانی سے بات کرا دیں، میں اس کو سمجھا دوں گا۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو؟“ اس کی باتوں سے وہ بہت شرمندہ ہوا تھا۔

”بات تو کرانی پڑے گی۔ ورنہ وہ خواب میں بھی آپ کو یاد کرتا رہے گا۔“ اس کے اس طرح غلطی ماننے پر وہ نرم پڑی تھی۔ اور فون ہانی کو پکڑا دیا۔

سعد نے اس سے صرف پانچ منٹ بات کی تھی اور اسے لگا تھا کہ یہ وقت اس کی زندگی کا خوب صورت ترین وقت ہے۔ نجانے کیوں اس لمحے اس کے دل نے خواہش کی تھی کہ وہ اس معصوم بچے کے ہر دکھ کو اپنا بنا لے۔ اور اس کی ادھوری زندگی کو مکمل کر دے۔ اس کی ہر محرومی کو ختم کر دے۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ خواہش تعبیر پا سکے۔

وہ اپنی سوچ پہ سر جھٹکتے ہوئے مسکرا دیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہ آئندہ کے لیے محتاط ہو گیا۔ نہ کوئی گفٹ نہ کوئی فون کال، وہ اس اچھی سی لڑکی کے لیے کوئی بھی مشکل پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن صرف ایک ہفتے بعد ہی اس کے سیل پہ اسی نمبر سے فون آیا تھا۔ اور وہ بھی رات کے گیارہ بجے مندی مندی آنکھوں سے گھڑی دیکھتے ہوئے اس نے بڑی حیرانی سے کال ریسیو کی تھی۔ لیکن دوسری طرف ہانی کے رونے کی آواز پہ وہ ایک دم الرٹ ہوا تھا۔

”ہانی بیٹا! کیا ہوا؟ آپ کیوں رو رہے ہیں؟“ وہ از حد پریشان ہوا تھا۔

”انکل! نانو بیمار ہو گئی ہیں، میں اور مما انہیں ہاسپٹل لے کر آئے ہیں۔ آپ پلیز آ جائیں۔ مما کو بھی بہت ڈر لگ رہا ہے۔ وہ بہت رو رہی ہیں۔ آپ آئیں گے نا؟“ سعد کی آواز سنتے ہی وہ بڑی آس سے بولا تھا۔

”بیٹا آپ کس ہاسپٹل میں ہو؟“

”ہمارے گھر کے پاس جو ملٹری ہاسپٹل ہے ہم وہیں پہ ہیں۔“

”ٹھیک ہے آپ فون رکھیں۔ میں آ رہا ہوں۔“ اس نے فون رکھ کر جلدی سے جیکٹ پہنی تھی۔ اپنا موبائل، والٹ اور گاڑی کی چابی اٹھا کر اس نے ایک پل کی بھی دیر نہ کی تھی۔ وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ وہ لڑکی اس وقت بے بسی کی انتہا پر ہے ورنہ اپنے بیٹے کو وہ کبھی فون نہ کرنے دیتی۔ اسے صرف بیس منٹ لگے تھے اور وہ ان کے پاس تھا۔

”آنٹی کو کیا ہوا ہے؟“ ہانی کو اٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے وہ بصیرت سے پوچھ رہا تھا جس کی آنکھیں رونے سے سوج رہی تھیں۔

”امی کا شوگر لیول ڈاؤن ہو گیا تھا۔ شاید میں نے آنے میں دیر کر دی۔ اسی لیے طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ آئی سی یو میں ہیں۔ ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں کہ صبح ان شاءاللہ روم میں شفٹ کر دیں گے۔“

وہ سعد کو ایسے تفصیل بتا رہی تھی جیسے اس سے بہت قریبی تعلق ہو۔ زندگی میں کبھی کبھی ایسے لمحے آتے ہیں جب ہمیں کسی اپنے کی شدت سے ضرورت ہوتی ہے۔ کسی پہ اعتبار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ آج بصیرت کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اتنے کونشس ہونے کے باوجود اس نے ہانی کے کہنے پہ سعد کو فون کروایا تھا۔ بغیر کسی وہم، بغیر کسی خدشے کے، اسے جیسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا اور سعد نے اس یقین کو جھٹلایا بھی نہیں تھا۔

”آپ کو اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا۔ گھر سے کسی ملازم کو لانا چاہیے تھا۔“ سعد کو اس وقت وہ بہت اکیلی لگی تھی۔

”گھر میں ملازم تو دو ہیں۔ ایک گارڈ اور گھر کے کاموں کے لیے اسی کی بیوی۔ وہ دونوں کچھ دنوں کی چھٹی لے کر گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ معاف کیجیے گا۔ آپ کو اس وقت ڈسٹرب کیا۔ ہانی نجانے کیوں بار بار آپ کو یاد کر رہا تھا۔ میں منع نہ کر سکی۔“ وہ ہاتھوں کو مسلتے ہوئے جیسے صفائی دے رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں، میں ڈسٹرب نہیں ہوا۔“ وہ مسکرایا تھا۔

بصیرت نے نوٹ کیا تھا یہ مسکراہٹ اس کے وجود کا جیسے مستقل حصہ تھی۔ وہ بغیر وجہ کے بھی مسکرا دیتا تھا۔ جیسے اپنے اندر کے کسی درد کو چھپانا چاہتا ہو۔ یا واقعی وہ اتنا ہی خوش رہتا تھا۔ وہ پوری رات انہوں نے اس کاریڈور میں گزاری تھی۔ ہانی سعد کی گود میں تھا اور اس نے اپنی جیکٹ اتار کر ہانی کے اوپر ڈالی ہوئی تھی۔ وہ خود بھی آنکھیں موند کر بیٹھا تھا۔ اس نے بصیرت سے اور کوئی بات نہیں کی۔ تسلی کا ایک لفظ بھی نہیں۔ شاید اس کو یقین تھا کہ اس کا ہونا ہی بصیرت کے لیے تسلی کا باعث تھا۔ وہاں پہ موجود تینوں فرد اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے۔

☆☆☆

صبح بڑی خوش گوار تھی۔ مسز حیدر کو ہوش آ گیا تھا۔ سعد ان سے مل کر اپنا تعارف کرا کے بہت سی دعائیں سمیٹ کر جا چکا تھا۔ وہ بڑے اچھے موڈ میں آفس پہنچا تھا۔ لیکن دانیال کا بگڑا ہوا منہ دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

”خیریت تو ہے نادانی، کیوں منہ پھلایا ہوا ہے؟“ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا تھا۔

”سعد! تم مجھے بتاؤ، مجھ میں کوئی کمی ہے۔ اچھی خاصی شکل و صورت ہے۔ ویل آف ہوں۔ کردار بھی مشکوک نہیں۔ تمہارے خیال میں کوئی مجھے ریجیکٹ کر سکتا ہے؟“

سعد اس کے انداز پہ مسکرا دیا۔ ”ہرگز نہیں، میرے یار جیسا تو دوسرا مجھے نظر ہی نہیں آتا۔ تم بتاؤ کس نے تمہیں ریجیکٹ کیا ہے؟“

”سعدی تم جانتے ہو نا میں کائنات کو کتنا چاہتا ہوں۔ بہت کم عمری سے میں نے اس کے ساتھ کے خواب دیکھے ہیں۔ اور اب مما نے جب خالہ جانی سے میری اور کائنات کی شادی کی بات ہے تو وہ بھی خوش ہوئی ہیں۔ لیکن نجانے کیوں کائنات ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے۔ وہ کہتی ہے مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔ تم ہی اسے سمجھاؤ، اس سے کھل کے بات کرو۔ اس کی ساری زندگی میرے سامنے گزری ہے۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو۔“ آخری بات جیسے اس نے اپنے آپ سے کی

تھی۔ سعد کے مسکراتے ہوئے لب ایک دم سکڑے تھے۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں کائنات سے بات کروں گا۔ تم خود ہی تو بتاتے ہو وہ بہت لاڈلی ہے۔ ایسی لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ شادی کے بعد وہ پابند ہو جائیں گی۔ اسی خیال سے وہ شادی سے منع کر رہی ہوگی اور بھلا کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ ورنہ پسند تو وہ تمہیں کرتی ہے۔ اس کی باتوں میں صرف تمہارا ہی ذکر ہوتا ہے۔ تم فکر کیوں کرتے ہو۔ مان جائے گی۔" اس نے اپنے دوست کی تسلی کے لیے کائنات کی صفائی بھی دے دی اور جھوٹ بھی بول دیا۔

"اگر پسند کرتی تو میرے پروپوزل پہ جھٹ سے ہاں کہہ دیتی۔ انکار نہ کرتی اور وہ میری خالہ زاد ہے۔ مجھے اور میرے گھر والوں کو اچھی طرح جانتی ہے۔ وہاں کوئی روک ٹوک کوئی پابندی نہیں۔ تم اس سے صاف صاف بات کرو۔ انکار کی وجہ پوچھو میں اس کا یہ رویہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

وہ یہ کہہ کر رکا نہیں اور سعد مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ اس نے دانیال کو کہہ تو دیا تھا کہ وہ کائنات سے بات کرے گا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ کائنات سے کبھی بات نہیں کر سکتا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جب تک وہ خود شادی نہیں کرے گا وہ اس سے مایوس بھی نہیں ہوگی۔

"اس کا مطلب ہے مجھے جلد از جلد شادی کرنا ہوگی۔ مگر کس سے؟" وہ نجانے کب تک خیالوں میں گم رہتا جب دروازے پہ دستک نے اسے چونکا دیا۔

"یس کم ان۔"

"آپ کو سر آفس میں بلا رہے ہیں۔" آفس بوائے کے میسج پر تمام خیالوں کو جھٹکتے ہوئے کام کی طرف متوجہ ہوا لیکن پورا دن اس کے ذہن میں کشمکش چلتی رہی۔ دانیال کی باتیں بار بار یاد آ رہی تھیں لیکن کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور جب وہ شام کو گھر پہنچا تو چائے پیتے ہوئے اس نے ہانی کی کال ریسیو کی تھی۔ فون سننے کے بعد ایک خیال بجلی کی طرف اس کے ذہن میں کوندا تھا۔ اور اسے لگا کہ کب سے یہ خیال اس کے لاشعور میں تھا۔ بس دماغ کی بریفنگ کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ جلد بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس معاملے کو ہر زاویے سے پرکھ کر فیصلہ کرنا چاہتا تھا اور پھر صرف دو دن بعد اس نے اپنے فیصلے کو او کے کر دیا۔

اس نے دانیال کو فون ملایا تھا۔ "ہیلو دانیال کہاں ہو؟"

"میں گھر جا رہا ہوں، راستے میں ہوں خیریت تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" دانیال کو تشویش ہوئی تھی۔

"تم جلدی سے میرے پاس آ جاؤ۔ تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" سعد نے سنجیدگی سے کہہ کر فون رکھ دیا۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر میں دانیال اس کے پاس تھا۔

"ایسی کیا خاص بات ہے جو تم نے یوں ایمرجنسی میں بلایا ہے۔" دانیال نے آتے ہی پوچھا تھا۔

"ارے تم آرام سے بیٹھو تو سہی، میں تمہیں بتاتا ہوں۔" سعد نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے سامنے بٹھایا تھا۔

"دانیال! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اب یہ بات میں ڈائریکٹ مما سے نہیں کہہ سکتا اسی لیے تمہیں بلایا ہے کہ پہلے تم سے بات کروں تاکہ تم یہ بات مما سے کہہ سکو۔" اس کی بات پر دانیال خوشی سے چیخ پڑا۔

"سعد تم سچ کہہ رہے ہو۔ جلدی سے بتاؤ کون ہے وہ خوش نصیب جس پہ تمہاری نظر ٹھہری ہے۔" وہ بڑے جوش سے اس کا ہاتھ پکڑے پوچھ رہا تھا۔

"میں بصیرت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے سعد کی زبان لڑکھڑائی تھی۔ کائنات کا چہرہ ایک دم آنکھوں کے سامنے آیا اور جسم جیسے بے جان ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ لیکن وہ زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے دانیال کو دیکھنے لگا۔ جو اس کی بات سن کر خوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"سعد! تم جانتے ہو وہ ایک بچے کی ماں ہے اور بیوہ ہے۔ وہ تمہیں اور تمہارے گھر کو کبھی بھی مکمل توجہ اور پیار نہیں دے سکتی۔ اس کے جذبات کسی اور کے ہو چکے ہیں۔ وہ تمہیں خوش نہیں رکھ سکتی اور میں جانتا ہوں تم یہ سب کچھ اس چھوٹے بچے کی وجہ سے کر رہے ہو۔ تمہیں اس میں اپنا آپ دکھتا ہے۔ تم اس کی محرومی کو دور کرنے کے لیے خود کو پوری زندگی کے لیے خوشیوں سے محروم کر رہے ہو۔ تم میری باتوں سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ میں خود تمہارے لیے اچھی سی لڑکی ڈھونڈوں گا۔ جو تم سے پیار کرے گی۔ جس کا دل تمہارے لیے دھڑکے گا۔ جس کے تمام جذبے ان چھوئے ہوں گے اور تمہارے نام ہوں گے۔ جس کی زندگی تم سے شروع ہو کر تم پر ختم ہوگی۔ جو تمہارے جیسی ہوگی نہ کہ بصیرت جیسی، میں مانتا ہوں وہ اچھی لڑکی ہے لیکن میرے دوست کے قابل نہیں۔"

دانیال اس کی دوستی میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ اور سعد بھی دل سے مسکرا دیا۔ وہ اپنے اس پیارے دوست کو کیسے بتاتا کہ اس کے جذبے بھی تو ان چھوئے نہیں ہیں۔ اس کا دل بھی تو کسی اور کے لیے دھڑکتا ہے۔ اس کی زندگی بھی تو کسی اور سے شروع اور ختم ہوتی ہے۔ وہ تو بس خود کو ہانی اور بصیرت کی زندگی میں مصروف کرنا چاہتا ہے۔ اپنا غم بھلانا چاہتا ہے۔

"اب صرف مسکراتا رہے گا۔ یا میری باتوں پر دھیان بھی دے گا۔" دانیال نے اسے خیالوں کی دنیا سے باہر نکالا تھا۔

"دانیال! کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ بصیرت اور ہانی میری خوشی ہیں۔" اس کے اس سادہ سے جملے پہ دانیال چپ سا ہو گیا۔

"میں مما سے بات کروں گا۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔" اتنا کہہ کر وہ رکا نہیں اور چلا گیا۔ سعد نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ وہ دل سے مطمئن تھا کہ وہ یہ سب کچھ دانیال اور کائنات کی خوشی کے لیے ہی تو کر رہا ہے۔

یہ سوچتے ہوئے ایک سرکش سا آنسو آنکھ سے نکل کر ہاتھ کی پشت پہ آ ٹکا۔ جیسے اسے احساس دلا رہا ہو کہ اس تمام معاملے اس کی خوشی کا ذکر تو کہیں بھی نہیں۔ سعد نے بے بسی سے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

☆☆☆

اور پھر سب کچھ اس کی توقع کے مطابق ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہ ہو لیکن اس کا پروپوزل جب احمد یزدانی اور آمنہ یزدانی لے کر جائیں گے تو انکار ممکن ہی نہیں۔ سعد کی ساری ذمہ داری انہوں نے خود لی تھی۔ اسی لیے رسمی سا وقت لینے کے بعد اس کا پروپوزل قبول کر لیا گیا۔

سعد اس وجہ سے بھی خوش تھا کہ مما اور بابا نے دانیال کے برعکس اس کے فیصلے کو سراہا تھا۔ اور اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ ابھی شادی کی تاریخ طے نہیں ہوئی تھی۔ اسی سلسلے میں آج بصیرت کی امی نے ان سب کو اپنے ہاں ڈنر پہ انوائٹ کیا تھا اور وہ سب بصیرت کے گھر میں تھے۔

سعد نے محسوس کیا تھا کہ اس منظر میں سب خوش ہیں سوائے بصیرت کے، وہ اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریزاں تھی۔ سعد چاہتا تھا وہ اس سے بات کرے اس کی ہر الجھن کو دور کرے۔ اسے تسلی دے لیکن موقع ہی نہ ملا اور سعد نے بھی کوشش نہ کی یہ سوچ کر کہ جب بھی موقع ملا وہ اس کو مطمئن کرے گا اور پھر ہوا بھی ایسے ہی۔

اگلے ہی دن وہ آفس میں بزی تھا جب اسے بصیرت کی کال آئی تھی۔ "مجھے آپ سے ملنا ہے۔ ضروری بات کرنی ہے۔" سلام کے بعد وہ بڑے سرد لہجے میں بولی تھی۔

"میں شام کو گھر آ جاؤں گا۔ پھر بات کر لیں گے۔" لہجے میں اپنائیت خود بخود در آئی تھی۔

"نہیں میں گھر میں نہیں ملنا چاہتی۔ کہیں بھی باہر جہاں آپ ملنا چاہیں۔" وہ جلدی سے بولی تھی کہ

کہیں وہ گھر ہی نہ آ جائے۔

"آپ میرے آفس آ جائیں۔ پھر مل کے کہیں باہر چلتے ہیں۔" اس نے ایڈریس بتا کر فون رکھ دیا اور جلدی جلدی کام سمیٹنے لگا کیونکہ دو تین دنوں سے بہت سا کام التوا میں پڑا ہوا تھا اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اس کے آفس میں تھی۔ اسکن اور سیاہ امتزاج کے سادہ سے قمیص شلوار میں بڑے سے دوپٹے کے ساتھ وہ ہمیشہ کی طرح بڑی پُروقار لگ رہی تھی۔

"آپ کیا لیں گی؟ چائے یا کافی؟" وہ اس کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں کچھ نہیں، دل نہیں چاہ رہا۔" وہ بہت بے چین لگ رہی تھی۔ اور سعد اس کی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلیں پھر کہیں باہر چلتے ہیں۔"

اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتا کائنات آندھی طوفان کی طرح آفس میں داخل ہوئی تھی۔

"سعد! یہ میں کیا سن رہی ہوں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ غصے میں بصیرت کو دیکھ ہی نہ سکی جو حیرانی سے اس خوب صورت سی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔

"شکر ہے کائنات تم آ گئیں۔ اسی بہانے تم بصیرت سے مل لوگی۔ یہی بصیرت ہیں اور بہت جلد ہماری شادی ہونے والی ہے۔" سعد نے ایک دم صورت حال کو سنبھالا تھا۔

"اور بصیرت! یہ کائنات ہیں۔ میری کولیگ اور بہت اچھی دوست بھی۔" اس کے تعارف کرانے کا طریقہ کائنات کو بہت کچھ باور کرا گیا۔

"اگر دانیال میرا پوچھے تو بتا دینا میں بصیرت کے ساتھ ہوں۔ آئیں بصیرت!" وہ دونوں کائنات کو حیران پریشان چھوڑ کر جا چکے تھے۔

"لگتا ہے آپ کی دوست کو مجھ سے مل کے خوشی نہیں ہوئی۔" بصیرت نے کائنات کے رویے سے یہی اخذ کیا تھا۔ اسی لیے جب وہ قریبی ریستوران میں پہنچے تو اس نے سب سے پہلے یہی بات کی تھی۔

"ہاں وہ کچھ اپ سیٹ ہے۔ دانیال سے جھگڑا چل رہا ہے۔ شاید اسی وجہ سے وہ آپ سے صحیح طور پر مل نہ سکی۔ دانیال کی کزن ہے۔ آپ یقیناً جانتی ہوں گی۔ عنقریب ان کی شادی ہونے والی ہے۔ خیر آپ اپنی کہیں، کیا کہنا چاہتی ہیں۔"

سعد جانتا تھا کہ کائنات کے آج کے رویے کو دیکھ کر بصیرت کے ذہن میں کئی سوال اٹھ سکتے ہیں۔ اسی لیے اس نے ایسی بات بنائی کہ کسی سوال جواب کی گنجائش ہی نہ بچے اور اس کی توجہ بھی اپنی طرف کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

"سعد! آپ نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔ مجھ سے بات کیے بغیر آپ نے انکل اور آنٹی کو بھیج کر اچھا نہیں کیا۔ کیونکہ میں آپ سے تو کیا کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ یقیناً آپ کہیں گے کہ یہ بات مجھے اپنی امی سے کہنا چاہیے تھی۔ لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ سوچتی ہیں کہ ان کے بعد میرا اس دنیا میں کوئی بھی سہارا نہیں۔ اس لیے وہ کب سے ایسے ہی پروپوزل کے انتظار میں تھیں۔ میرا انکار یا اقرار ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ میں آپ کو اندھیرے میں نہ رکھوں اور آپ سے بات کروں۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

وہ جو بہت بااعتماد لگتی تھی اس لمحے سعد کے سامنے بالکل بھی نہیں لگ رہی تھی۔

"شادی نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ؟" سعد نے اس کی کشادہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے عام سے انداز میں پوچھا تھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں بیوہ ہوں۔ ایک بچے کی ماں ہوں۔ میرے لیے زندگی کا مفہوم صرف میرا بیٹا ہے۔ میں آپ کی توقعات پہ پورا نہیں اتر سکتی۔ میں آپ کو خوش نہیں رکھ سکتی۔ آپ کا ساتھ یقیناً کسی بھی لڑکی کے لیے خوشی کا باعث بن سکتا ہے۔ لیکن میں آپ کے لیے مناسب نہیں۔ میں آپ کو کچھ بھی نہیں دے سکتی۔"

ٹیبل کی سطح پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ جیسے اپنی بات سمجھا نہیں پا رہی تھی۔ سعد کو لگا تھا جیسے وہ بالکل دانیال کی طرح بول رہی ہے۔

"آپ مجھے کتنا جانتی ہیں۔ جو آپ نے خود ہی ڈیسائیڈ کر لیا کہ آپ میرے لیے مناسب نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں آپ کو زیادہ نہیں جانتی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ آپ بہت اچھے ہیں۔ اور میں آپ کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتی۔ میں کب سے آپ کو کہہ رہی ہوں کہ میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتی۔ ہر شخص کو ایک گھر، ایک فیملی اور بچوں کا ساتھ چاہیے ہوتا ہے جبکہ ہانی کی پیدائش پہ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اب میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔"

اس کی بات سن کر سعد بالکل خاموش ہو گیا۔ اسے لگا کہ جیسے خود کو عیاں کرنے کے بعد وہ پُرسکون ہو گئی ہو۔

"ابھی شادی کی ڈیٹ کنفرم نہیں ہوئی۔ مجھے یقین ہے آپ کی طرف سے انکار ہو جائے گا۔ سعد! میری آپ سے جب بھی ملاقات ہوئی ہے آپ نے میرے لیے آسانی ہی پیدا کی ہے۔ اور خاص کر اس رات جب میری امی بیمار تھیں، میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ میں دعا کروں گی آپ کی زندگی میں اچھی سی لڑکی آئے جو آپ کو پیار اور خوشیوں سے بھرپور رفاقت دے سکے۔"

اس کے بعد وہ رکی نہیں تھی اور سعد تو جیسے وہاں تھا ہی نہیں۔ وہ تو ابھی وہیں تھا۔ کائنات کے پاس۔ وہ رو رہی ہو گی۔ اس تصور سے آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

"کاش میں تمہیں ملا ہی نہ ہوتا۔ کاش دانیال میرا دوست نہ ہوتا۔ کاش میں اتنا بے وقعت نہ ہوتا۔ اتنا مضبوط اور پرسکون نظر آنے والا سعد اندر سے کتنا بے سکون اور کھوکھلا ہے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنا دکھ کسی سے شیئر نہیں کر سکتا۔"

وہ اندر ہی اندر گھلتا جا رہا تھا۔ اور اسی گھٹن میں اسے جو صحیح لگ رہا تھا وہ کر رہا تھا۔ ابھی بھی وہ بصیرت کی باتوں کا جواب سوچتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

آج وہ صبح سے دانیال کے ساتھ سائٹ پر تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ لنچ کرنے کے بعد آفس لوٹے تھے۔ سعد کا موڈ بھی خوشگوار تھا۔ وہ جب بھی دانیال کی معیت میں وقت گزارتا تھا اسے احساس ہوتا تھا اس دنیا میں کوئی اس کا اپنا بھی ہے اور وہ جب بہت اچھا وقت گزار کر آفس میں داخل ہوا تھا تو اسے ہرگز توقع نہ تھی کہ اس کا سامنا کائنات سے ہوگا۔ جو نجانے کب سے یہاں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیسی ہو کائنات؟" خود کو سنبھالتے اور اس سے نظریں چراتے وہ اپنی سیٹ کی طرف بڑھا تھا۔

"تمہارے خیال میں کیسا ہونا چاہیے؟" بڑے ہی تیکھے لہجے میں کائنات نے پوچھا تھا۔

"مجھے اندازہ ہے تم ناراض ہو گی۔ کل میں تمہیں ٹائم نہیں دے سکا۔ لیکن یقین جانو بصیرت کے ساتھ جانا بڑا ہی ضروری تھا۔" اس نے کائنات کی بات کو جان بوجھ کر دوسرا رنگ دیا۔

"سعد! میرے ساتھ اکیلے جانے سے تو تم ہمیشہ کتراتے ہو اور بصیرت نے کچھ ہی دنوں میں تم پہ اتنا جادو کر دیا ہے کہ تم اس کے ساتھ ہوٹلنگ کرتے ہو۔" عجیب حسرت زدہ لہجہ تھا جو نوکیلی میخ کی طرح سعد کے سینے میں گڑا جا رہا تھا۔

"کم آن کائنات! تم صرف میری دوست ہو اور وہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ تو پھر رویوں میں فرق تو فطری سی بات ہے۔"

وہ بمشکل خود کو نارمل رکھے ہوئے تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ وہ بصیرت کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ نہ تھا۔

"سعدی! ایسا کیا ہے بصیرت میں جو مجھ میں نہیں۔ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے۔ امیر ہے۔

تمہیں مجھ سے زیادہ چاہتی ہے۔ کیا ہے اس میں جو تم مجھے ریجیکٹ کر رہے ہو۔"

ہمیشہ کی طرح آنسوؤں کی نمی آواز پہ غالب آنے لگی تھی اور سعد بے بس ہوا جا رہا تھا۔

"پیار کرتا ہوں میں اس سے وہ میری محبت ہے کیا یہ کافی نہیں؟" سعد نے جیسے خود کو چھپانے کے لیے اپنا لہجہ سخت کیا تھا۔

"کیوں تم اس سے پیار کرتے ہو۔ کیا دے سکتی ہے وہ تمہیں۔ اپنی بیوی اور ایک عدد بچہ، یہی نا۔" غصے سے بولتے ہوئے وہ پھٹ پڑی۔

"تم بھی تو پیار کرتی ہو مجھ سے۔ کیا دے سکتا ہوں میں تمہیں، اپنی یتیمی، محرومی اور احساس کمتری۔ پیار اور محبت میں دل صرف دینے پر آمادہ ہوتا ہے۔ لینا تو اس کا اصول ہی نہیں۔ میں بصیرت سے پیار کرتا ہوں اور میرے لیے یہی کافی ہے، اور تم بھی پلیز مجھے بھول جاؤ یہ تمہارا صرف ایک جذباتی فعل ہے۔ جو تم کو کبھی خوش نہیں ہونے دے گا۔"

سعد جلد از جلد بات سمیٹنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دانیال کسی کام سے یہاں آ جائے اور کائنات کو یوں روتا ہوئے دیکھے۔

"سعد تمہاری یہ کھوکھلی لفاظی میری تسلی نہیں کر سکتی۔ تم خود پہ جبر کر کے مجھے دکھ دے رہے ہو صرف دانیال کے لیے، لیکن میں تمہاری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہونے دوں گی۔ اگر میں خوش نہیں تو پھر تمہیں اور دانیال کو کیوں خوش ہونے دوں، اپنے کسی بھی فعل سے پہلے میری یہ بات یاد رکھنا۔"

بے دردی سے اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے وہ رکی نہیں اور سعد کو لگا تھا کہ اس لگژری زندگی سے تو بہتر وہ جوڑ توڑ والی زندگی اچھی تھی۔ کم از کم اگر سکھ نہ تھے تو دکھ بھی تو نہ تھے۔ اتنی اذیت اور اتنی بے بسی تو نہ تھی۔ نجانے اس کا کیا انجام ہوگا۔ اگر دانیال کو معلوم ہو گیا تو وہ تو مر ہی جائے۔ اسے کتنا دکھ ہوگا کہ میں نے اسے یوں دھوکا دیا۔ اس نے تو میری اور کائنات کی پہلی ملاقات میں ہی مجھ سے یہ شیئر کیا تھا کہ وہ کائنات سے پیار کرتا ہے۔ تو پھر میں نے اس راہ پہ چلتے اپنے قدم کیوں نہ روکے۔ مجھے اپنا دوست، اس کی بچپن کی محبت کیوں نظر نہ آئی۔ کوئی مجھ جتنا بھی احسان فراموش اور دھوکے باز ہوگا۔ سب کچھ جانتے بوجھتے اپنے ہی بھائی جیسے دوست کے لیے دکھوں کا سامان کر دیا۔ میں نے یہ غلطی کی ہے اور میں ہی اسے سدھاروں گا۔

یہی سوچتے ہوئے وہ سارے کام چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا رخ بصیرت کے گھر کی طرف تھا۔

☆☆☆

وہ جیسے ہی سلام کرتا لاؤنج میں داخل ہوا، ہانی سب کام چھوڑ کر بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا اور اس کی ٹانگوں سے آ کر لپٹ گیا۔ سعد نے اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ اور اس کی فیورٹ چاکلیٹس اس کے سامنے کی تھیں۔

"تھینک یو انکل۔" خوشی سے کہتے ہوئے ہانی نے بانہیں اس کے گلے میں ڈالی تھیں۔

"اچھا ہوا سعد بیٹا تم آ گئے۔ ہانی تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔ اگر مصروفیت نہ ہو تو کبھی کبھی چکر لگا لیا کرو۔" بصیرت کی امی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

"ارے آنٹی! کبھی کبھی کیوں، بہت جلد ان شاء اللہ میں ہانی کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

وہ مسکراتے ہوئے بصیرت کی طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ جو شاید ہانی کو ہوم ورک کروا رہی تھی۔ اس کے آگے ہانی کا بیگ اور کاپیاں پڑی تھیں۔ وہ جز بز ہوتے ہوئے کاپیاں سمیٹنے لگی۔

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے اور تمہیں تمہاری نیک نیت کا اجر ملے۔ ایسا لگتا ہے جیسے تمہارے آنے سے میری ہر پریشانی دور ہو گئی ہے۔ اس گھر کے مکینوں پر تمہارا بڑا احسان ہے۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

طاہرہ حیدر کی آنکھیں یہ بات کہتے ہوئے اشک بار ہو گئیں۔ سعد نے ہانی کو گود سے اتار کر صوفے پر بٹھایا اور خود ان کے سامنے نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

"بیٹا بھی کہتی ہیں اور میرے عمل کے لیے لفظ احسان بھی استعمال کرتی ہیں۔" ان کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے ہوئے وہ بڑی نرمی سے بولا تھا۔

"ارے بیٹا! مجھے تو لگتا ہے کہ میں نے زندگی میں بہت بڑی نیکی کی ہے، جس کا اجر تمہاری صورت میں ملا ہے۔ اور بیٹے کی کمی پوری ہو گئی ہے۔ میری تو ہر سانس تمہارے لیے دعا کرتی ہے۔" انہوں نے بڑی شفقت سے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔

"آنٹی آپ کو معلوم ہے۔ آپ کی فیملی سے تعلق جڑنے سے میری کتنی بڑی محرومی دور ہوئی ہے اور آپ کے صرف بیٹا کہنے سے مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ لیکن پلیز ایسے روئیں نہیں، مجھے دکھ ہوتا ہے اور آنٹی آپ ایک بات تو بتائیں کیا آپ کے ہاں چائے وغیرہ کا نہیں پوچھا جاتا۔" وہ شرارت سے بصیرت پہ چوٹ کرتے ہوئے بولا جو حیرانی سے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"بالکل چائے ملتی ہے۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" طاہرہ کے جانے کے بعد سعد نے اپنا رخ بصیرت کی طرف کیا تھا۔

"آپ کو میری امی سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔ اور آپ کو آنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ آپ فون پہ ہی منع کر دیتے۔" وہ ہانی کو دیکھتے ہوئے آہستہ آواز میں بولی تھی جو کچھ فاصلے پہ بیٹھا گیم کھیل رہا تھا۔

"بصیرت! اگر میں چاہتا تو اسی وقت تمہاری باتوں کا جواب دے دیتا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اس وقت تم میری باتوں کو جذباتیت سے تعبیر کرتیں۔ اسی لیے میں آج آیا ہوں تم سے یہ کہنے کہ میں شادی تم سے ہی کروں گا۔ کیونکہ میں نے سوچا کہ اگر میں تمہاری باتوں کو مانتے ہوئے انکار کرتا ہوں تو کسی نہ کسی لڑکی سے تو ضرور شادی کروں گا تو ہو سکتا ہے کہ اس لڑکی کو بھی وہی پرابلم ہو جو تمہارے ساتھ ہے۔ تو میں خدا کی مرضی کے آگے کیا کر سکتا ہوں۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ شادی تم سے ہی کرنی چاہیے۔ تم اپنے دل سے ہر وسوسہ نکال دو۔ کیونکہ ڈاکٹرز کی بات خدانخواستہ حرف آخر نہیں ہوتی۔ پانچ سال پہلے اگر کوئی پیچیدگی تھی بھی تو اللہ کی رحمت سے وہ دور بھی ہو سکتی ہے۔ اور مجھے اپنے رب پر پورا یقین ہے ان شاء اللہ ہمارے پیارے پیارے بچے ہوں گے جن پر ہانی اپنا رعب جمایا کرے گا۔"

اس کو بے تکلفی سے تم کہتا وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا تھا اور بصیرت جو اس کی باتوں پر لاجواب ہو چکی تھی آخر میں اس کی بات سن کر اس کے گالوں پہ سرخی دوڑ گئی۔ سعد نے بڑی دلچسپی سے اس کو دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتے طاہرہ چائے لے کر آ گئیں۔

"سعد بیٹا تم سے ایک اور بات بھی کرنا تھی لیکن اگر تمہیں بری لگے تو پلیز بیٹا مجھے معاف کر دینا۔" طاہرہ بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ سعد کے ساتھ بصیرت نے بھی ان کو سوالیہ انداز میں دیکھا تھا۔

"آنٹی آپ پلیز بات کریں۔ تمام معاملات اگر پہلے سے ڈسکس کر لیے جائیں تو زیادہ اچھا ہے۔" اس کے نرم لہجے سے طاہرہ کو حوصلہ ہوا تھا۔

"بصیرت کے بابا نے اس گھر کو بڑے شوق اور پیار سے بنوایا تھا۔ اپنی زندگی کی تمام جمع پونجی اس پہ لگا دی۔ میرا دل کرتا ہے یہ گھر ہمیشہ آباد رہے۔ بیٹا تو ہے نہیں جو یہ خواہش پوری ہو، اور بیٹی تو ہوتی ہی مہمان ہے۔ تم لوگوں کے جانے کے بعد یہ گھر ویران ہو جائے گا۔ لیکن اگر تم چاہو تو اس گھر کی رونق برقرار رہ سکتی ہے۔ اگر تمہیں برا نہ لگے تو شادی کے بعد اگر یہیں شفٹ ہو جاؤ تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ ویسے بھی یہ گھر تم لوگوں کا ہی ہے۔ یہ ایک ماں کی خواہش سمجھ لو...... کوئی شرط یا زبردستی نہیں تم میرے بیٹے ہو۔ اگر تم میری بات مانو تب بھی میں خوش ہوں، نہ ماننے کی

صورت میں بھی کوئی ناراضی نہیں۔"

ان کی بات سن کر سعد چپ سا ہو گیا۔ بصیرت کو بھی اندازہ نہ تھا کہ امی یہ بات کریں گی۔ اس نے محسوس کیا کہ سعد کی مستقل رہنے والی مسکراہٹ غائب تھی اور ماتھے پہ شکنوں کا جال سا بن گیا۔ طاہرہ اس کی چپ پر شرمندہ سی ہو گئیں۔ انہیں دکھ ہوا کہ کیوں انہوں نے اتنے اچھے شخص کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور وضاحت دیتیں سعد بول پڑا۔ بولنے سے پہلے شکنیں غائب اور مسکراہٹ لوٹ آئی۔

"آنٹی میں آپ کی بات ماننے کے لیے تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔ ہم پراپرٹی ڈیلر کو بلائیں گے۔ اس گھر کا کرایہ لگوائیں گے اور وہ میں پے کروں گا۔ آپ وہ رقم اپنے یا ہانی کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیجیے گا، پلیز۔" آخر میں وہ انہیں تائیدی انداز میں دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"بیٹا یہ گھر تمہارا ہے۔ تمہیں دل کی تسلی کے لیے کرایہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" انہیں اس کی بات پہ الجھن ہوئی تھی۔

"تبھی آنٹی میں نے آپ کی بات مانی ہے تو آپ کو بھی میری ماننا پڑے گی۔" پہلی دفعہ وہ ضدی لہجے میں بولا تھا اور طاہرہ مسکرا دی۔

"تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ تم نے میرا کتنا مان بڑھایا ہے۔" بات کرتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"مجھے لگتا ہے آنٹی کہ اب مجھے چلنا چاہیے کیونکہ اگر میں یہاں بیٹھا رہا تو آپ نے بات بات پہ رونا ہے۔" وہ ان کی طرف شرارت سے دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ امی اور ہانی سے مل کر چلا گیا تھا۔

اب طاہرہ بصیرت سے کچھ کہہ رہی تھیں لیکن وہ تو حیرت کی زیادتی سے جیسے مل بھی نہیں پا رہی تھی۔ یہ شخص کیا ہے۔ جسے صرف مسیحائی آتی ہے۔ جو صرف دوسروں کو خوشی دینا جانتا ہے۔ اپنی ذات کو نظر انداز کیے، نہ دن کا خیال نہ رات کا، کیسے پلک جھپکنے میں دوسروں کو مطمئن کر دیتا ہے۔ کیا دنیا میں ایسے انسان بھی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو نجانے اس کی کون سی ادا پسند آئی ہے جو سعد جیسے فرشتہ صفت انسان کو اس کا نصیب بنا دیا۔ نجانے کیوں آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ آنسو چھپاتے کام کے بہانے وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

سعد نے جو کہا تھا ایسا ہی کیا، اس نے یہ سوچے بغیر کہ لوگ اس کے یوں بصیرت کے گھر شفٹ ہونے پر کتنی باتیں بنائیں گے، جو فیصلہ کیا تھا اس پر عمل بھی کیا۔ اس کے لیے بس یہی کافی تھا کہ اس کا دل مطمئن ہے اور اس کا اس عمل سے اس گھر کے تین لوگ خوش ہیں، جن سے وہ جڑنے والا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہوا کہ ماما، بابا اور دانیال نے اس کو ضرور سراہا۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ صرف اس کی خوشی چاہتے تھے اور پھر ایک دن بڑی سادگی سے سعد اور بصیرت نکاح جیسے پاکیزہ بندھن میں بندھ گئے۔

شادی میں صرف سعد اور بصیرت کے آفس کے لوگ تھے۔ دانیال تو بہت ہلہ گلہ کرنا چاہتا تھا لیکن سعد نے سلیقے سے اس کو منع کر دیا۔

"ہم سارے شوق تمہاری اور کائنات کی شادی میں پورے کریں گے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" سعد نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

"پتا نہیں سعد اس کو کیا ہو گیا ہے۔ بہت بدل گئی ہے۔ تم سے بھی اس کی کتنی دوستی ہے لیکن دیکھو میرے کتنے اصرار پر بھی تمہاری شادی میں نہیں آئی۔" وہ کائنات کے رویے سے بہت دکھی دکھائی دے رہا تھا۔

"اچھا یار! اب میری شادی پہ اتنا منہ بسور کے تو نہ شامل ہو۔ لوگ کہیں گے کہ جیلس ہو رہا ہے کہ میری شادی پہلے کیوں نہیں ہوئی۔"

سعد شرارت سے کہتا ہوا اسے کھانے کی ٹیبل پہ لے آیا۔ یقیناً وہ دانیال کے ساتھ ساتھ اپنا دھیان

بھی بٹانا چاہتا تھا۔

اور پھر آنے والے دنوں میں اسے لگا کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو رہا ہے۔ اب اسے بھی اور لوگوں کی طرح گھر آنے کی جلدی ہوتی تھی۔ جو کہ شادی سے پہلے ہرگز نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ اس وقت اسے معلوم تھا کہ اس کے فلیٹ پہ کوئی انتظار کرنے والا نہیں۔ لیکن اب وہ ہر روز ایک انوکھے احساس سے گزرتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اس دنیا میں اس کا بھی ایک گھر ہے۔ جہاں اس سے پیار کرنے والے اور اس کا گھر لوٹنے کا انتظار کرنے والے ہیں۔

وہ ہانی سے باتیں کرتا تو اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ اس نے سچ مچ بصیرت اور ہانی کی زندگی میں رنگ بھر دیے اور اس نے ہانی کا ہر کام خود بخود اپنے ذمے لے لیا اور بصیرت اس کو ہانی کے ساتھ بچہ بنے دیکھ کر حیران ہوتی رہتی۔

☆☆☆

"سعد آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔"

وہ ابھی ابھی ایک پارٹی سے لوٹے تھے جو سعد کے آفس والوں نے ان دونوں کی شادی کی خوشی میں ارینج کی تھی اور یہ دونوں وہاں سے بہت اچھے موڈ میں لوٹے تھے۔ بصیرت اب اس کے اور ہانی کے صبح کے لیے کپڑے پریس کر رہی تھی اور سعد نیوز چینل لگائے بیٹھا تھا۔ جب بصیرت نے اسے مخاطب کیا تھا اور سعد ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا دانیال بھائی اور کائنات کی ابھی تک صلح نہیں ہوئی؟" بڑا سادہ سا لہجہ تھا لیکن سعد کو چونکانے کے لیے کافی تھا۔

"تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"مجھے لگا کائنات کا موڈ آج بھی اچھا نہیں تھا اور وہ پارٹی سے جلد ہی چلی بھی گئی تھی۔ تو مجھے لگا کہ ابھی تک ان کا جھگڑا چل رہا ہے۔" وہ اب کپڑے پریس کر چکی تھی۔ اسی لیے اس کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"دراصل میں مجھے لگتا ہے کہ جو بھی بات ہے، وہ دونوں ہی مجھ سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتے تو میں نے بھی زیادہ انٹرفیئر نہیں کیا۔ لیکن تمہارے توجہ دلانے پر مجھے لگ رہا ہے کہ مجھے ان سے بات کرنی چاہیے۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ شادی سے پہلے ساری لڑکیاں یونہی ایٹی ٹیوڈ دکھاتی ہیں۔"

زندگی میں کبھی جھوٹ جو نہیں بولا تھا اسی لیے بات بدلنی پڑی۔

"اس بات سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" وہ حیرانی سے بولی تھی۔

"اب تم خود کو ہی لے لو، شادی سے پہلے تمہارا رویہ میرے ساتھ کتنا سخت تھا۔ تب ہی تو مجھے اپنا آپ بھی مشکوک سا لگنے لگا تھا۔" وہ اس کو شرارت سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ اس کی بات پر بصیرت چپ سی ہو گئی۔

"میں مذاق کر رہا تھا تمہیں شاید برا لگا۔" وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

"میں پہلے ایسی نہیں تھی۔ میں تو امی بابا کی بہت لاڈلی اور نرم مزاج سی بیٹی تھی۔ بہت زیادہ شرارتی، میرے لیے زندگی کا مفہوم شاید خوشی اور کھیل کود کے سوا کچھ نہ تھا۔ بابا جانی نے بہت کم ایج میں میری شادی کر دی تھی۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تھے۔ اسی لیے انہیں جلدی تھی کہ میری شادی ان کی زندگی میں ہی ہو جائے۔ لیکن میرے نصیب میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔ حنان بحرین میں ہوتے تھے۔ شادی کے ایک ماہ بعد ہی واپس لوٹ گئے اور پھر چند ماہ بعد ایک حادثے میں ان کی ڈیتھ ہو گئی۔ بابا میرے غم میں شریک ہونے گئے تھے۔ لیکن حنان کے پیرنٹس نے بابا سے کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جائیں۔ اب سسرال میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس وقت ہمارے گھر میں کسی سوگ کی سی کیفیت تھی شاید دنیا کا کوئی لفظ بھی اس کے بیان کے لیے کافی نہیں۔ پھر ہانی میری زندگی میں آیا اور بابا جیسے اسی انتظار میں تھے۔ ہارٹ اٹیک اتنا شدید تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے اور مجھے لگا کہ میری زندگی ختم ہو گئی ہے۔ اتنا بڑا حادثہ مجھے تو بے جان ہی کر گیا۔ لیکن یہ صرف میرا احساس تھا۔ میں ابھی زندہ تھی۔ بے جان نہ تھی۔ مجھ سے

منسلک دو زندگیاں میری امی اور میرا بیٹا میرے منتظر تھے۔‘‘

یہاں پہ بصیرت کا لہجہ رندھ گیا اور اس کی آواز اندر ہی جیسے گھٹ گئی۔

سعد نے اس کو روکا نہیں تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ ایک دفعہ وہ اپنی ساری گھٹن باہر نکال دے۔ وہ باہر سے سخت نظر آنے والی لڑکی حقیقت میں ہرگز مضبوط نہ تھی۔ وہ تو اندر کی بڑھتی ہوئی گھٹن سے جیسے کھوکھلی ہوتی جا رہی تھی۔ سعد اسے واپس زندگی کی طرف لانا چاہتا تھا۔ اس نے بصیرت کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ جیسے اپنے ہونے کا یقین دلانا چاہتا ہو۔

’’سعد آپ کو پتا ہے جب میں جاب کے لیے باہر نکلی تو مجھے لگا میں ہرگز سروائیو نہیں کر سکوں گی۔ اور لوگ بھی جیسے مشکلات میں اضافے کے لیے مستعد کھڑے تھے۔ لیکن میں نے جاب ہر حال میں کرنا تھی۔ اپنی ماں اور بچے کو اچھی زندگی دینے کے لیے مجھے ساری تکلیفیں برداشت کرنا تھیں اور پھر نجانے کیسے وہ لاڈلی اور ہنس مکھ بصیرت اتنی سخت مزاج ہو گئی۔ کیسے اتنی مضبوط ہو گئی کہ نہ صرف مختلف جگہوں پر جاب حاصل کر کے تجربہ حاصل کر لی گئی بلکہ ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی مکمل کی۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔‘‘

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے سعد کی طرف دیکھا تھا اور سعد کو لگا تھا کہ جیسے ان کالی آنکھوں کا سارا اضطراب آنسوؤں میں بہہ گیا۔ اب شفاف منظر بہت خوب صورت تھا۔

’’سوری سعد میں نے آپ کا بھی اچھا بھلا موڈ خراب کر دیا۔ لیکن نجانے کیوں آپ سے سب کچھ شیئر کرنے کو دل کرتا ہے۔‘‘ وہ تھوڑا سا مسکرائی تھی۔

’’بصیرت اگر میں کہوں کہ مجھے وہ پہلے والی بصیرت چاہیے تو کیا تم میری بات مانو گی۔‘‘ سعد اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا تھا۔

’’اگر آپ کا ساتھ رہا تو ان شاء اللہ بہت جلد وہ بصیرت لوٹ آئے گی۔‘‘ اس نے جیسے سعد کو تسلی دی تھی۔

’’اس وقت تمہارا سب سے بڑا مسئلہ ہے وقت کی کمی۔ تم شاید ہم سب کو وقت دے دیتی ہو لیکن خود کو اگنور کر جاتی ہو۔ تمہیں نہ اپنے آرام کا خیال ہے۔ نہ کھانے پینے کا، نہ آج کل کی لڑکیوں کی طرح ڈریسنگ کی فکر ہے۔ بس دوسروں کے لیے جینا ہی تو زندگی نہیں۔ تم کچھ عرصے کے لیے جاب چھوڑ دو۔ اس طرح تم گھر کے ساتھ ساتھ خود کو بھی ٹائم دے سکو گی۔ آنٹی بیمار رہتی ہیں۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے۔ تم گھر پہ رہو گی تو انہیں اچھا لگے گا۔ اور تمہیں بھی اپنی ساری تھکن اتار کر فریش اور پرسکون ہونا چاہیے۔ تاکہ مزید خوب صورت نظر آؤ۔ مجھے وہ لاڈلی اور ہنس مکھ بصیرت واپس چاہیے۔‘‘ آخر میں وہ مسکرایا تھا۔

’’لیکن سعد میں آپ کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ ہم دونوں کام کریں گے تو بہتر رہے گا۔ بجائے اس کے کہ ایک فرد پر سارا بوجھ ڈال دیا جائے۔‘‘

سعد کی اس طرح فکر کرنا اسے اچھا لگا تھا۔

’’بصیرت میری تو یہ ذمہ داری ہے۔ اور میں اپنی ذمہ داری اچھی طرح سنبھال سکتا ہوں۔ تم آزما کر تو دیکھو اگر تمہیں لگے کہ میں تمہاری امیدوں پہ پورا نہیں اترا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں خود تمہیں جاب دلواؤں گا۔‘‘ اس کی بات پر بصیرت نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

’’یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سعد کسی کی امیدوں پر پورا نہ اترے۔‘‘ وہ بڑے یقین سے بولی تھی۔

اس کا سر تھپکتے ہوئے ایک خیال سعد کو چھو کر گزرا تھا۔ اس کے مسکراتے لب ایک دم سمٹے تھے۔ چاہے سب کی امیدوں پر پورا اتروں لیکن ایک ہستی کی شکوہ کناں نظریں کبھی نہیں بھولوں گا۔ کائنات کا تصور آتے ہی نجانے کیوں من بھٹکنے سا لگا اور اس تصور سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے سختی سے اپنی آنکھیں بند کی تھیں۔

☆☆☆

زندگی بڑی سبک روی سے گزرنے لگی۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا۔ لیکن سعد کے من کی خلش ابھی بھی ویسے ہی تھی۔ کیونکہ جس مقصد کے لیے اس نے اپنی شادی کا جلدی فیصلہ کیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا۔ اس کی شادی کو تقریباً چھ مہینے ہو چکے تھے۔ لیکن کائنات اور دانیال کی شادی کا مسئلہ ہنوز تھا۔ اس کے حل کے لیے وہ کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ کیونکہ نہ تو اس میں کائنات سے بات کرنے کی ہمت تھی اور نہ ہی وہ موقع دیتی تھی۔ بلکہ ہفتوں تو وہ نظر ہی نہ آتی اور کبھی سامنا ہو جاتا تو بڑا الیا دیا سا انداز ہوتا تھا۔

ہانی کی شرارتوں اور بصیرت کی رفاقت میں یہ بات تھوڑی دیر کے لیے محو ضرور ہو جاتی لیکن بھول تو نہیں سکتا تھا۔

اس دن بھی وہ صبح صبح تیار ہو رہا تھا۔ آج بڑی ضروری میٹنگ تھی اور اس نے دل لگا کر اس پریزنٹیشن کی تیاری کی ہوئی تھی۔ جب آمنہ یزدانی کا فون آیا تھا۔

’’خیریت ماما آج آپ نے صبح صبح ہی اپنے بیٹے کو یاد کر لیا؟‘‘

وہ حیران ہوا تھا کیونکہ ہر روز وہ آفس سے آتے ہوئے ان سے مل کے آتا تھا۔

’’آفس جاتے ہوئے مجھ سے مل کے جانا۔ تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔‘‘ وہ فکرمند لگ رہی تھی۔

’’آپ فون رکھیں۔ میں آتا ہوں۔‘‘ وہ جلدی گھر سے نکل آیا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ ان کے سامنے تھا۔

’’خیریت تو ہے نا ماما، آپ پریشان لگ رہی ہیں۔‘‘ وہ فکر سے بولا تھا۔

’’ارے اب ایسی بھی کوئی بات نہیں جو یوں تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ناشتہ لگواؤں کرو گے نا؟‘‘ انہوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

’’نہیں ناشتہ میں نے کر لیا تھا۔‘‘ وہ ہولے سے مسکرایا تھا۔

’’سعد تم دانیال کے دوست ہو۔ اسے سمجھاؤ کہ اپنی زندگی یوں برباد نہ کرے۔ اب ہم کسی شخص کو اپنے ساتھ کے لیے مجبور تو نہیں کر سکتے۔ جب کائنات اس کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی تو وہ کیوں اپنی جان کا روگ لگا کے بیٹھ گیا ہے۔ اس کے کہنے پر میں کتنی دفعہ نائمہ (کائنات کی ماما) سے بات کر چکی ہوں۔ لیکن میری طرح وہ بھی بے بس ہے۔ کیونکہ کائنات نے کسی سے بھی شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ نجانے کیوں وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ لیکن میں تو دانیال کو یوں گھلتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ میری تو سنتا نہیں، لیکن تمہاری ضرور مانے گا۔ تم اسے سمجھاؤ ایک سے ایک لڑکی ہمارے سرکل میں ہے۔ جس سے وہ کہے گا میں شادی کرا دوں گی۔ لیکن میں اسے یوں گھلتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔‘‘

بات کرتے کرتے وہ رو دی تھیں اور سعد کو لگا تھا کہ وہ آنسو اس کے دل پر گر رہے ہیں۔ وہ ایک دم اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھا۔

’’پلیز مما اس طرح نہ روئیں۔ مجھے دکھ ہو رہا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں سمجھاؤں گا دانیال کو بھی اور کائنات کو بھی۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا آپ پریشان نہ ہوں۔‘‘

وہ ان کے ہاتھوں کو بڑی عقیدت سے چومتے ہوئے بولا تھا اور پھر وہ رکا نہیں تھا۔ آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ اگر نہ بھی ہو رہی ہوتی تو بھی اس سے وہاں بیٹھا نہ جاتا۔ کیونکہ اسے لگا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ان آنسوؤں کی وجہ تو بنا ہے۔ ڈرائیونگ کے دوران بھی ذہنی رو بھٹک بھٹک جا رہی تھی۔ اس وقت اس سے ڈرائیونگ نہیں ہو رہی تھی لیکن آفس جانا بہت ضروری تھا۔ وہ بڑی مشکل سے آفس پہنچا تھا۔ لیکن وہاں اس کا سامنا سب سے پہلے دانیال سے ہوا تھا۔ جو شاید کسی اور کو نہیں لیکن اسے ڈسٹربڈ ضرور لگ رہا تھا۔ یقیناً آج کل گھر میں یہی مسئلہ زیر غور تھا۔ تب ہی وہ پہلے کی طرح فریش نہیں تھا۔

اس کا موڈ سعد کی ٹینشن بڑھانے کے لیے کافی

تھا۔ وہ دانیال سے کچھ بھی پوچھے بغیر یا کہے بغیر سلام کرتا اپنے آفس کی طرف آ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ خود کو کمپوز کرتا احمد یزدانی کی کال آ گئی۔ وہ اسے آفس میں بلا رہے تھے۔ کیونکہ میٹنگ شروع ہونے والی تھی۔ فی الحال وہ ذہن سے سب کچھ جھٹکتے ہوئے اپنی فائلز وغیرہ سمیٹنے لگا۔ میٹنگ ہال تک پہنچتے، پہنچتے وہ اپنی پریزنٹیشن کے پوائنٹس ذہن نشین کرنے لگا۔ لیکن نہیں، وہ فوکس نہیں کر پا رہا تھا۔ حالانکہ اس نے بڑی اچھی تیاری کی ہوئی تھی۔ لیکن اس لمحے اسے لگا تھا اس کا ذہن بالکل بلینک ہو چکا ہے۔

یہ اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی کہ وہ چھوٹی چھوٹی پریشانی کو سر پہ سوار کر لیتا تھا۔ ہاں سامنے والے احساس نہیں ہونے دیتا تھا۔ لیکن آج مسئلہ چھوٹا نہ تھا۔ شاید اسی لیے اس کی پریشانی میٹنگ روم میں موجود سب لوگوں پر عیاں ہو رہی تھی۔ وہاں موجود کسی شخص کو بھی اس کی صلاحیتوں پر شبہ نہ تھا چاہے وہ ان کی کمپنی کے حریف ہی کیوں نہ ہوں لیکن آج وہ خود کو ثابت نہ کر سکا تھا۔ اور ٹینڈر بڑی آسانی سے حریف کمپنی کو مل چکا تھا۔ سعد کا اس لمحے جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ وہ احمد یزدانی سے نظریں ہی نہیں ملا پا رہا تھا۔ جو ہمیشہ کی طرح اس پر اعتبار کر بیٹھے لیکن اس دفعہ وہ ان کی امیدوں پر پورا نہ اترا تھا۔ وہ چھوٹے بچوں کی طرح نادم سا ان سے معافی مانگ رہا تھا۔

اس کے اس انداز پر احمد یزدانی کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"بچے یہ تمہاری غلطی سے نہیں ہوا۔ وہ ٹینڈر ہمارے نصیب میں ہی نہیں تھا۔ اس میں ضرور اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔ نجانے اس پروجیکٹ کی وجہ سے آئندہ چل کر کتنا نقصان ہوتا تو اچھا ہے نا آج ہی جان چھوٹی۔ تم پریشان نہ ہو۔ یقیناً اس سے بھی بہت اچھا کام ہمارا منتظر ہوگا۔"

اسی لمحے ان کا موبائل بجا تھا اور وہ اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اور سعد کا من اور بوجھل ہو گیا۔

"کاش بابا آپ مجھ پہ غصہ ہوتے، مجھے شرمندہ کرتے تو میرے رویے کی کچھ تلافی ہو جاتی۔" وہ بوجھل قدموں سے آگے بڑھا تھا۔ اس کا رخ کائنات کے کیبن کی طرف تھا شاید آج بات کرنے کا موقع مل جائے۔ اور یہ گتھی سلجھ جائے۔ لیکن آج تو لگ رہا تھا سارے کام خراب ہی ہونے ہیں۔ اس کی اسسٹنٹ بتا رہی تھی کہ وہ آج چھٹی پر ہے۔ اور وہ خود سے الجھتا ہوا اپنے کیبن میں آ گیا۔

☆☆☆

آفس میں کام ہونے کے باوجود وہ سرِ شام ہی گھر آ گیا تھا۔ کیونکہ اس سے کوئی کام بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ سلام کرتا ہوا لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ ہانی اپنی نانو کے پاس بیٹھا تھا۔ شاید کارٹون دیکھ رہا تھا اور بصیرت کچن میں کام کر رہی تھی۔ اس نے سعد کے کہنے پر جاب چھوڑ دی تھی اور گھر پر ہی ہوتی تھی۔ وہ تھوڑی دیر ہانی کے پاس بیٹھا اور پھر کمرے میں آ گیا۔ اتنے میں بصیرت اس کے لیے چائے لے آئی۔

"آپ نے چینج نہیں کیا، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" بصیرت نے اسے کسلمندی سے بیٹھا دیکھا تو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"ہوں میں ٹھیک ہوں۔" وہ جیسے یہاں تھا ہی نہیں۔ "تم چائے رکھو، میں چینج کر کے آتا ہوں۔" وہ غائب دماغی سے بولتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"سعد سنیں، آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟" بصیرت اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔

"کیا جھوٹ بولا تھا؟ وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

"یہی کہ دانیال بھائی اور کائنات کی منگنی ہوئی ہے۔ اور عنقریب شادی ہونے والی ہے۔" سعد کے لیے اس کے بات کرنے کا انداز بالکل نیا تھا آج لگتا ہے سب کو ایک ہی موضوع ملا ہے مجھے زچ کرنے کے لیے۔ وہ یہ بات صرف سوچ سکا۔

"آج میں شاپنگ کرنے گئی تھی۔ اور وہاں مجھے کائنات ملی تھی۔" اس کی یہ بات سن کر وہ ایک دم الرٹ ہوا تھا۔ "ایسے ہی باتوں باتوں میں، میں نے اس سے شادی کا پوچھا تھا کہ اس کی اور دانیال بھائی کی شادی کب ہو رہی ہے تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ ایسی کوئی بات سرے سے ہے ہی نہیں۔ اس کی اور دانیال کی منگنی بھی نہیں ہوئی تو میں نے آپ کا نام لیا کہ آپ نے ہی مجھے بتایا ہے۔ تو وہ مسکرا دی اور کہنے لگی کہ مجھے آپ سے ہی پوچھنا چاہیے کہ آپ نے جھوٹ کیوں بولا۔ سعد آپ نے ایسا کیوں کیا۔ کوئی لڑکی تو اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

وہ ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"ارے ایسے ہی اس نے مذاق کیا ہوگا۔" وہ لاپروا سے انداز میں کہتے ہوئے آگے بڑھا تھا۔ جب بصیرت نے اس کا بازو بڑی سختی سے پکڑ کر روکا تھا۔

"نہیں سعد، کوئی بھی لڑکی مذاق یا غصے میں ایسی بات نہیں کہتی۔ آپ مجھ سے کیا چھپا رہے ہیں۔ کیوں مجھ سے نظریں چرا رہے ہیں۔ اس معاملے میں ایسی کیا چیز ہے جو کھٹک رہی ہے۔ کہیں میرا اندازہ درست تو نہیں جو میں نے آپ کے آفس میں پہلی ہی نظر میں نوٹ کیا تھا۔ اور اگر وہ اندازہ ٹھیک ہے تو آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ اس سارے معاملے کے پیچھے آپ کا اصل مقصد کیا ہے؟ آپ میرے اور ہانی کی زندگی میں کیوں آئے؟"

سعد کے بازو پر اس کے ہاتھ کی گرفت اور سخت ہوئی تھی۔ اور اس کی مشکوک نظروں اور لہجے نے تو سعد کو جیسے مار ہی دیا تھا۔

"پلیز بصیرت! میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اس موضوع پہ پھر کبھی بات کریں گے۔" اور یہ سچ تھا سارا دن خود سے لڑتے لڑتے وہ بالکل نڈھال ہو چکا تھا۔ اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

"نہیں سعد اتنا مجھ میں صبر نہیں۔ کہ کوئی مجھ سے اور میرے بیٹے کی زندگی سے کھیل رہا ہو اور میں اس کے بات کرنے کے موڈ کا انتظار کرتی رہوں۔ آپ ابھی اور اسی وقت ساری بات کلیئر کریں گے۔"

اگر وہ اس وقت غم و غصے کی کیفیت میں تھی سعد کی بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت اسے مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ بصیرت کے سخت لب و لہجہ پر اسے بھی غصہ آ گیا۔

"بصیرت جب میں کہہ رہا ہوں کہ پھر بات کریں گے تو خدا کے واسطے مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔" ایک جھٹکے سے وہ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے آگے بڑھا تھا۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کے اس سخت جھٹکے سے وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکی۔ اور ڈریسنگ ٹیبل سے ٹکراتے ہوئے وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اب نجانے ڈریسنگ ٹیبل کی ضرب زیادہ سخت تھی یا سعد کا رویہ اذیت ناک تھا کہ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔

☆☆☆

سعد جب فریش ہو کر واش روم سے باہر آیا تو بصیرت کو یوں کارپٹ پر بے سدھ پڑا دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک لمحے کی بھی دیر کیے بغیر وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔ اسے سختی سے اپنا بازو چھڑانا اور اسے جھٹکا دینا یاد آیا اور اس کا جی چاہا کہ وہ اپنا منہ نوچ لے۔ اس نے جلدی سے اسے بیڈ پہ لٹایا تھا اور اس کے گال تھپتھپانے لگا۔

"بصیرت پلیز ہوش میں آؤ پلیز بصیرت۔"

اس کے سرد پڑتے ہاتھوں کو اس نے زور زور سے مسلا تھا۔ لیکن اس کا وجود جیسے سرد ہی ہوتا جا رہا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے اسے بازوؤں میں اٹھایا اور بھاگتا ہوا باہر پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی تک آیا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ امی اور ہانی ان کی یوں غیر حاضری پر کیا سوچیں گے۔ انہیں بتائے بغیر وہ گاڑی کو اڑائے لے جا رہا تھا۔

☆☆☆

"مسٹر سعد آپ یونہی پریشان ہو رہے تھے۔ ایسی حالت میں عموماً اس طرح ہو جاتا ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ آپ کی مسز ڈائٹ کم اور اسٹریس زیادہ لیتی ہے۔ تبھی کمزوری زیادہ ہے۔ وہ ماں بننے والی ہیں۔ اس لیے آپ کو ان کا بہت خیال رکھنا ہوگا۔" لیڈی ڈاکٹر اپنے پیشہ ورانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اسے

جو خبر سنا رہی تھی اسے خوشی سے زیادہ حیران کر گئی۔

"لگتا ہے آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔" اس نے سعد کے گم صم سے انداز سے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔

"میری مسز کو پہلی ڈلیوری کے بعد کہا گیا تھا کہ اب وہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی اس لیے میں حیران ہو رہا ہوں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"ہم ڈاکٹرز تو ظاہری کنڈیشن کو دیکھ کر اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔ فیصلے کا اختیار تو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔ جس کے معجزے ہمیں ہمارے محدود علم کا احساس دلاتے ہیں۔ آپ لکی ہو۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اپنی مسز کا خیال رکھیے گا۔ میں نے ڈرپ لگا دی ہے۔ کچھ دیر بعد آپ انہیں ساتھ لے جا سکتے ہیں۔" ڈاکٹر چلی گئی تھی۔

وہ ہولے ہولے چلتا ہوا کوریڈور کی سیڑھیوں پر آ بیٹھا۔ بڑا خوش کن سا احساس رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کے تمام خیالات جیسے زائل ہو چکے تھے۔ تمام منظر جیسے بدل سا گیا ہو۔ وہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوا تاروں بھرے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے یہ چمکتے ان گنت ستارے اس کی خوشی میں شامل ہیں۔ ٹھنڈی ہوا کی سرسراہٹیں اسے جیسے مبارک باد دے رہی ہوں۔ وہ اکیلے بیٹھ کر بڑے دل سے مسکرا رہا تھا۔

اس نے اپنا موبائل نکالا اور نمبر پریس کرنے لگا۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں اس کی توقع کے مطابق کائنات اس کے سامنے تھی۔

"سعد تم ٹھیک تو ہو نا؟ تم نے تو میرا دم نکال دیا۔ فوراً ہاسپٹل پہنچو، اتنا کہا اور ایڈریس بتا کر فون بند کر دیا۔ کچھ خبر بھی ہے آتے ہوئے مجھے کتنے وسوسے ستا رہے تھے۔"

آج بہت دنوں بعد وہ اس سے پہلے کی طرح بات کر رہی تھی۔

"اس طرح نہ کہتا تو کون سا تم نے آنا تھا۔ سارے تعلق ناتے توڑ جو بیٹھی ہو۔" وہ ہمیشہ کی طرح مسکرایا تھا۔ جو کائنات کو ہمیشہ نئی سی لگتی تھی۔

"سعد تعلق تو تم نے توڑے ہیں میں تو ابھی بھی تمہارے لوٹ آنے کی امید پہ بیٹھی ہوں۔" وہ اس کے پاس سیڑھیوں پہ بیٹھتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بولی تھی۔

"بصیرت کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے ڈرپ لگی ہے۔ ابھی کافی ٹائم تھا تو میں نے سوچا تم سے بات کر لی جائے کیونکہ تم چند دنوں یا ہفتوں سے نہیں بلکہ چند مہینوں سے مجھے اگنور کر رہی ہو اور میں تو کسی عام سے شخص کی ناراضی بھی برداشت نہیں کر سکتا کجا کہ اتنے اچھے اور خاص دوست کی۔ اسی لیے تمہیں اس طرح بلانا پڑا ورنہ تم نے تو صاف انکار کر دینا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ تمہارا رویہ اور انکار مجھے کتنا دکھ دے گا۔" وہ بڑی نرمی سے اسے دیکھتے ہوئے بڑے سادہ سے لہجے میں بولا تھا۔

"سعد تم نے بھی تو نہیں سوچا تھا کہ تمہارا انکار اور رویہ مجھے کتنا دکھ دے گا۔" ایک ہی فقرے میں آواز کی لرزش نمایاں تھی۔

"کائنات تمہیں میں ایک بات بتاؤں۔" اس نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ "مجھ جیسے لوگ جو یتیم خانے میں پلتے اور بڑھتے ہیں نا یہ رشتوں کے معاملے میں خود کو بڑا ان سکیور سا فیل کرتے ہیں۔ ایک ڈر، ایک وہم، ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ خوش قسمتی سے اگر کوئی میرا بن گیا ہے تو وہ کہیں کھو نہ جائے، روٹھ نہ جائے۔ کہیں یہ رشتہ ختم نہ ہو جائے۔ ایک بھوک سی ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کہ میرے اردگرد لوگوں کا ایک ہجوم ہو اور اس ہجوم میں تمام لوگ میرے اپنے ہوں۔ وہ مجھ سے پیار کرتے ہوں۔ میرے دکھ سکھ میں شریک ہوں۔ میرے مسکرانے پہ مسکرائیں۔ میرے دکھی ہونے پہ دکھی ہوں۔ جن کے لیے میرا جینا مرنا کوئی معنی رکھتا ہو۔ بس ایک کسک سی ہے اور تمہیں پتا ہے کہ یتیم خانے سے نکلنے کے بعد میرا سارا وقت اس بھوک اور کسک کو مٹانے کی جدوجہد میں گزرا ہے۔ میں اس کوشش میں بہت زیادہ تو نہیں لیکن کافی حد تک کامیاب ہوا ہوں اور اس بات کی تم گواہ بھی ہو اور میرے دکھ سکھ میں شریک ہونے والوں میں شامل بھی ہو۔ اسی لیے تو میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔ تم مجھ سے ناراض ہو یہ بات مجھے سکون سے جینے نہیں دیتی۔ اسی لیے یہ بات میں تم سے شیئر کر رہا ہوں۔ تم جس معاملے کو لے کر مجھ سے ناراض ہو، سوچو اس کی ذرا سی بھنک مجھ سے وابستہ لوگوں کو پڑ جائے تو قصور نہ ہوتے ہوئے بھی میں ان کی نظروں میں وہی مقام پا سکوں گا جواب ہے۔ کیا دانیال جو بھائیوں سے بڑھ کر میرا دوست ہے وہ میرا دوست رہ پائے گا، کیا احمد یزدانی اور آمنہ یزدانی جنہیں میں بڑے مان سے اور اس سے بڑھ کر ان کی فرمائش پر ان کو ماما، پاپا کہتا ہوں کیا وہ میرا خیال اپنے بیٹے کی طرح رکھ پائیں گے؟ کیا بصیرت اور ہانی کی زندگی میں جو میری اہمیت ہے وہ قائم رہے گی۔ میرے اسٹاف کے لوگ کیا ان کی نظروں میں میرا مقام برقرار رہے گا۔ ان سب سوالوں کا جواب نہیں کے علاوہ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نہیں کا مطلب تو یہی ہے نا کہ میں جہاں سے چلا تھا وہیں پہ پہنچ جاؤں گا۔ میں ویسا ہی تہی دست ہو جاؤں گا۔ اور میرے تہی دست ہونے کا سب سے زیادہ نقصان اور دکھ تمہیں ہو گا۔"

وہ ٹانگیں پسارے، اپنے سینے پہ ہاتھ باندھے ایسے بات کر رہا تھا جیسے اسے کوئی کہانی سنا رہا ہو۔

"تم کہہ رہی ہو کہ تم میرے لوٹ آنے کا انتظار کر رہی ہو۔ فرض کرو اگر میں لوٹ آؤں تو تمہارے والدین مجھ جیسے شخص کو کبھی اپنی بیٹی نہیں دے سکتے۔ اور میں یہ جانتا ہوں کہ تم ہر چیز کو ٹھوکر مار کر مجھ سے کورٹ میرج پر تیار ہو جاؤ گی۔"

کائنات کو لگا تھا جیسے سعد نے اس کے منہ کی بات چھین لی ہو۔ اسی لیے وہ خاموشی سے اسے سنتی گئی۔ "تو کائنات مجھے نہیں لگتا کہ اتنے لوگوں کی نظروں میں گر کر اور اتنے لوگوں کی محبتوں سے محروم ہو کر اور ان سے کٹ کر ہم زندگی گزار سکتے ہیں...... اور خاص کر کے تم جو اپنے والدین اور بھائیوں کی لاڈلی ہو، تم نے آنکھ محبتوں کے سائے میں کھولی ہے اور میں چاہوں گا کہ محبت کا یہ سایہ دن گزرنے کے ساتھ گھنا ہی ہو نہ کہ میں اس کو ختم کرنے کا باعث بن جاؤں اور کائنات میں تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں اگر تمہاری اس ہنستی مسکراتی زندگی سے سہ حرفی لفظ سعد کو مٹا دیا جائے تو تمہاری زندگی مزید سہل اور خوش گوار ہو جائے گی۔"

وہ نرمی سے مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"سعد حیرت ہے۔ تم بہت بڑے بزنس مین تو نہیں لیکن پھر بھی سود و زیاں کا اندازہ بڑی اچھی طرح لگا سکتے ہو۔ کتنے وثوق سے کہہ رہے ہو کہ ہمارا ملنا سراسر نقصان ہے اور علیحدہ رہنا ہماری خوشیوں کا ضامن ہے۔ مجھے خود پہ غصہ آتا ہے کہ میں تمہاری ایسی بات سن کر بھی تم سے نفرت کیوں نہیں کر پاتی۔"

اس نے بے دردی سے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔ سعد نے بمشکل اس کے نم گالوں اور پلکوں سے نظریں چرائی تھیں۔ وہ کبھی خود کو اتنا بے بس محسوس نہیں کرتا تھا جتنا وہ کائنات کے سامنے ہوتا تھا۔ اس کی اتنی دلیلوں کے بعد بھی وہ اس کی بات ماننے کو تیار ہی نہ تھی۔ اور بس روئے جا رہی تھی۔ نجانے کتنے لمحے خاموشی کی نذر ہوئے تھے۔ جیسے دونوں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ ہو۔

کائنات کے جب آنسو تھمے تو اس نے سعد کی طرف دیکھا تھا۔ یہ شخص جس کا ظاہر اور باطن بہت خوب صورت تھا۔ آج وہ اسے بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں وہ صرف اپنا عکس دیکھنا چاہتی تھی لیکن وہاں تو عجیب سے خدشے اور واہمے لہرا رہے تھے۔ اس کو اتنے دھیان اور عقیدت سے دیکھتے ہوئے کائنات کے دل نے عرصے سے دبی ایک فرمائش کی تھی اور کائنات کے لبوں پہ بڑی خوب صورت مسکراہٹ بکھر گئی۔

"سعد اگر میں تمہاری ہر بات مان لوں۔ دانیال سے شادی بھی کر لوں تو کیا تم میری ایک بات

مانو گے؟“

سعد حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

”ایسی کیا بات ہے جس کے بدلے میں تم میری ہر بات مانو گی۔“ یوں اس کے پرجوش ہونے پر وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”تم ایک دفعہ یہ سچ مان لو کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔ تو پھر میں تمہاری راہ میں کبھی نہیں آؤں گی۔“ اس کی اس حسرت زدہ لہجے میں کی گئی فرمائش پر سعد کا دل ہمکا تھا۔ لب بے اختیاری میں ہوا ہوئے۔ لیکن زبان نے دل اور لبوں کا ساتھ نہ دیا۔ وہ تو دماغ کی معمول تھی۔ دل کے تقاضوں سے بے خبر، بے حس اور کٹھور۔ اگر آج یہ سچ سعد کہہ دے تو کائنات اسے کبھی بھول نہیں پائے گی۔ وہ کبھی خوش نہیں رہ پائے گی۔ لیکن اگر وہ اس بات سے منکر ہوتا ہے تو وہ بہت جلد اس سے بدظن اور بددل ہو کر اپنی دنیا میں محو ہو جائے گی۔ چاہے دیر سے ہی سہی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں یہ بات سوچتے ہوئے بڑی دقتوں سے ہی سہی لیکن وہ مسکرا دیا۔

”عجیب بات کرتی ہو کائنات تم بھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہنے والی۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تمہیں دنیا میں سب سے زیادہ محبت کس سے ہے تو میں فٹ سے دانیال کا اور تمہارا نام لوں گا۔ دنیا میں مجھ سا خوش نصیب اور کوئی نہ ہو گا جس کے دوست دانیال یزدانی اور کائنات حسن جیسے بے لوث اور مخلص ہیں۔“

بڑا نرم اور سادہ سا لہجہ جو کائنات کے تمام ارمانوں پر اوس بکھیرتا چلا گیا۔ وہ کسی ہارے ہوئے انسان کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سعد تم نہ سہی لیکن کائنات حسن تم سے بے انتہا محبت کرتی ہے اور اس محبت کے صدقے میں ہی سہی میں تمہاری بات مان رہی ہوں بہت جلد تمہیں میری اور دانیال کی شادی کا کارڈ مل جائے گا۔ لیکن میری ایک بات یاد رکھنا تم اتنی قربانیاں دے کر لوگوں پر جو احسان کر رہے ہو، اس کے بدلے میں تمہیں ممنونیت اور شکر گزاری کے جذبات تو مل جائیں گے لیکن محبت جیسا انمول جذبہ کبھی نہیں ملے گا۔ یہ جذبہ جتن سے نہیں نصیب سے ملتا ہے۔ جسے تم کسی اور کی جھولی میں ڈالنے کے لیے مصر ہو۔ تم بہت جلد تھک جاؤ گے سعد اور تھکا ہوا انسان کبھی خوشی کو نہیں پا سکتا۔ کبھی نہیں۔“

اور اس کے بعد وہ رکی نہ تھی۔ قدم قدم اس سے دور ہوتی گئی۔ اور سعد کو لگا جیسے ایک نادیدہ سا بوجھ اس سے ہٹتا جا رہا ہو۔ ہاں دل کا ایک کونا اور آنکھیں بھیگنے سی لگیں۔ لیکن وہ یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ اس کے اس فیصلے سے بہت سے لوگوں کو خوشی ملنے والی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر کائنات کے لیے بہت سی خوشیاں منتظر تھیں۔ اب بصیرت کی طرف لوٹنا تھا۔ اسے خوش خبری سنانی تھی۔ یہ روشنی کی ایسی نوید جو ان کی زندگیوں کو منور کرنے والی تھی۔

کائنات کہہ رہی تھی کہ ”احسان کرنے سے محبت نہیں ملتی وہ تھک جائے گا۔“ لیکن آج بصیرت کا جو روپ اس نے دیکھا تھا۔ اس کا باز پرس کرنے کا انداز اس کا حسد زدہ لہجہ اسے باور کرانے کے لیے کافی تھا کہ وہ صرف اس کی ممنون نہیں بلکہ اس سے پیار کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اس نے اپنے لیے پیار کی واضح جھلک دیکھی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ان آنکھوں کی روشنی اسے کبھی تھکنے نہیں دے گی۔

یہی سوچتے ہوئے اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے تھے جہاں ایک پرسکون زندگی اس کی منتظر تھی، جہاں دل پہ کوئی بوجھ نہ تھا وہ سرخرو ہو چکا تھا۔ اب صرف بصیرت کی بدگمانی دور کرنا تھی جو زیادہ مشکل نہ تھی۔ اس کے لبوں پہ پھیلی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

میں دھوپ بن نہیں سکتا وسی کسی کے لیے
میرے لیے کوئی ابر بہار ہو کہ نہ ہو

* * *

صائمہ اکرم چوہدری

شہزاد

شہزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا، اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تا کہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں اتابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

چوبیسویں اور آخری قسط

حمزہ اور ہادی، سکھر سے اسلام آباد کی فلائٹ لے کر واپس پہنچے تو ان کے ساتھ صدیوں کی تھکن تھی۔۔

دونوں کے سامنے اس تلخ حقیقت کا راز فاش ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اس دن معیز احمد سے ملاقات کے بعد پہلی فلائٹ پر سکھر جا پہنچے تھے جہاں سے ملنے والی معلومات نے ہادی کے دل و دماغ میں ایک قیامت بپا کر دی تھی۔

واجد صاحب، ہادی کی اصلیت بہت سال پہلے ہی جان چکے تھے اور یہ راز ان کے سینے میں دفن تھا اور شاید وہ لوگ اگر وہاں نہ جاتے تو اس بھید کو کوئی بھی نہ جان سکتا۔ وہ اس رات بچے کی باسکٹ سے ملنے والے برتھ سرٹیفکیٹ سے اس ہاسپٹل تک پہنچے، جہاں پر ہادی کی پیدائش ہوئی تھی اور وہاں اس کا نام محمد احمد درج تھا اور وہیں سے انہیں خدیجہ کا ایڈریس ملا اور جب وہ اس علاقے میں پہنچے تو وہاں ایک اور دردناک داستان ان کی منتظر تھی۔ جب انہیں اس بچے کی ماں اور اس کے خاندان پر ٹوٹنے والی قیامت کے پیچھے میر حاکم کا مکروہ اور طاقت کے نشے میں چُور چہرہ نظر آیا تو ان کی ہمت وہیں ٹوٹ گئی۔

انہیں اس بات کا بھی ادراک ہو گیا تھا کہ ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ اس بچے کی زندگی کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں، کیونکہ ان دنوں میر حاکم کا طوطی اس علاقے میں بولتا تھا اور اس بچے کا باپ بھی لاپتا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے جب میر حاکم کے ظلم کی داستانیں انہیں سنائیں تو اسی دن واجد صاحب نے خود سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس راز سے ساری زندگی پردہ نہیں اٹھائیں گے۔

ویسے بھی انہیں تسلی تھی کہ وہ بچہ، بہت محفوظ ہاتھوں میں ہے اور اس کے بعد انہوں نے دوبارہ اس موضوع پر کسی سے بات نہیں کی، لیکن اس بچے کو ایک بھرپور نوجوان کی حیثیت سے اپنے سامنے دیکھ کر وہ زیادہ دیر تک اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکے اور انہوں نے ایک ایک لفظ کھول کر انہیں بتا دیا تھا۔

اس اذیت ناک حقیقت کو جاننے کے بعد ہادی صدمے کی کیفیت کے ساتھ گنگ تھا اور حمزہ کے پاس ان الفاظ کی شدید قلت تھی جس سے وہ اپنے عزیز جان دوست کو تسلی دے سکتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس دکھ اور تکلیف کا مداوا دنیا کے سب الفاظ مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ لوگ وہیں سے واپس لوٹ جائیں۔ واجد صاحب نے بھی انہیں حاکم علی سے دور رہنے کی تلقین کی تھی۔

میر حاکم اس کے دادا اور میر محتشم اور میر خاقان اس کے تایا تھے، یہ بات جاننے کے بعد اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اسے جلتی بھٹی میں دھکا دے دیا ہو، یا اسے ننگے پاؤں جلتے شعلوں پر چلنے پر مجبور کر دیا ہو۔ وہ اذیت کے پل صراط پر تنہا تھا غنیمت یہ تھا کہ حمزہ اس کی دلی کیفیت سے آگاہ تھا۔ ہادی بالکل چپ تھا لیکن اس کی خاموشی میں پنہاں کرب اس کے چہرے کے ہر نقش سے عیاں تھا۔

اس کا دل و دماغ اس حقیقت کو ماننے سے انکاری تھا، کہ جس خاندان سے وہ سب سے زیادہ نفرت کرتا ہے، اسی خاندان کا خون اس کی رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے اور یہ شاید نفرت کا ہی وہ تعلق تھا جو اس کی ماں نے اپنے وجود سے اس کے اندر منتقل کیا تھا جس کی وجہ سے اسے کبھی بھی میر حاکم کی فیملی کو دیکھ کر اچھا احساس نہیں ہوا تھا۔ آج اس احساس کے پیچھے چھپی اصل وجہ کھل کر اس کے سامنے آچکی تھی۔

دونوں اسلام آباد ایئرپورٹ پر پہنچے تو دھواں دھار بارش نے ان کا استقبال کیا، حمزہ کا ڈرائیور چھتری لیے پہلے سے وہاں موجود تھا۔

”تم میرے ساتھ میرے گھر چلو گے، اور صبح میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گا۔۔“ بارش کی تیز بوچھاڑ سے بچتے ہوئے حمزہ نے اسے کہا۔

وہ تو ویسے ہی اپنے حواسوں میں نہیں تھا، اس لیے چپ چاپ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

بارش ان کی گاڑی پر طوفانی انداز میں برس رہی تھی، اور تیز ہوا کے جھونکے جب سڑک پر لگے پیڑوں سے ٹکراتے تو ایک خوف ناک سا تاثر فضا میں پھیل جاتا، لیکن اس سے بھی زیادہ ہولناک حقیقت وہ تھی، جس کا پردہ آج محمد ہادی کے سامنے چاک ہوا تھا۔

اس کا دماغ سن ہو چکا تھا، اتنا دکھ تو اسے یہ جان کر نہیں ہوا تھا کہ وہ مسز عالیہ قریشی اور عبداللہ صاحب کا بیٹا نہیں ہے، جتنی تکلیف اسے یہ جان کر ہوئی تھی کہ اس کے والدین کون تھے اور ان کا تعلق کس خاندان سے تھا، اور اس کے والدین کے ساتھ ہونے والے ظلم نے اس کے بھی رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔ قدرت نے اس کے ماں باپ پر ہونے والے ظلم کے ثبوت بھی در شہوار کے ذریعے اس تک پہنچائے تھے۔

گاڑی بہت سرعت سے حمزہ کے گھر ایف سیون سیکٹر کی طرف بھاگ رہی تھی، موسلادھار بارش میں ڈرائیور بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا، اچانک کشمیر ہائی وے پر ان کی گاڑی ایک دم چلتے چلتے رکی اور وہ دونوں چونک گئے۔ باہر گھپ اندھیرا اور طوفانی بارش کا راج تھا اور سڑک پر گاڑی چلنے سے انکاری تھی۔ ڈرائیور پریشانی سے نیچے اترا، سرد ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ وہ بونٹ پر جھک کر فالٹ ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ کچھ منٹ کے بعد وہ مایوس ہو کر دوبارہ گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔

”حمزہ صاحب! لگتا ہے بیٹری میں کوئی مسئلہ ہو گیا ہے، گھر سے دوسری گاڑی منگوانی ہو گی۔۔“

حمزہ نے رات کے اندھیرے میں گاڑی کے شیشے سے باہر جھانکنے کی کوشش کی، لیکن بارش اور تیرگی میں باہر کے سارے مناظر دھندلے تھے۔ حمزہ نے گھر فون کر کے دوسری گاڑی اور ڈرائیور کو وہاں فوراً پہنچنے کی تلقین کی۔ اسی لمحے ہادی کو ایک دم ہی گاڑی میں گھٹن کا احساس ہوا، اسے لگا جیسے اس کا سانس رک رہا ہو۔ وہ بلا ارادہ گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ ڈرائیور نے پریشانی سے اپنے برابر میں بیٹھے حمزہ کی طرف دیکھا، جو خود بھی ہادی کی اس حرکت پر حیران ہو رہا تھا۔

سرد ہوا نے محمد ہادی کے جسم کو ہلکی سی کپکپاہٹ میں مبتلا کیا، لیکن وہ طوفانی بارش کی پروا کیے بغیر سڑک پر چلنے لگا۔ اس کے وجود کے اندر اتنی تپش تھی کہ باہر کا سرد موسم اس پر کوئی اثر نہیں کر رہا تھا۔

”ہادی کیا ہوا؟ گاڑی سے کیوں اتر گئے تم؟“ حمزہ بھی گھبرا کر اس کے پیچھے بارش کی تیز بوچھاڑ میں اترا۔

تیز ہوا سے ہونے والی درختوں کے پتوں کی شائیں شائیں ماحول کو عجیب ہولناک بنا رہی تھی، حمزہ کا لباس بھی چند منٹوں میں بھیگ گیا، وہاں بارش سے بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ حمزہ انتہائی دکھ سے ہادی کو دیکھ رہا تھا جو رات کے اس پہر، برستی بارش میں کشمیر ہائی وے پر اکیلا چلا جا رہا تھا جبکہ ہڈیوں میں اترتی خنکی نے حمزہ کو باقاعدہ کانپنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ گاڑی میں جا کر بیٹھو۔“ حمزہ نے پریشانی سے اس کا بازو پکڑا۔

ہادی کو نہ جانے کیا ہوا، وہ دونوں ہاتھوں کو اپنے سر پر رکھے، سڑک پر اکڑوں بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کے رونے لگا، حمزہ کو لگا جیسے کسی نے اس کے کلیجے پر ہاتھ ڈال دیا ہو وہ سردی کی شدت، برفیلی ہواؤں اور طوفانی بارش سے بے نیاز ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور اسے اس حالت میں دیکھ کر حمزہ کو لگا جیسے کسی نے نشتر سے اس کا بھی دل چیر کر رکھ دیا ہو۔

ہادی کو ننھیالی خاندان پر کیا ہوا ظلم رلا رہا تھا۔ اسے آگ کے شعلوں میں ان لوگوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

اسے اپنی ماں خدیجہ کی بے قدری اور اپنے باپ ذوالکفل کی بے بسی تکلیف دے رہی تھی۔

اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کی روح کو کھینچ کر نکال رہا ہو۔

اس نے شدت سے اپنے مرنے کی دعا کی، وہ اس اذیت ناک حقیقت کو جاننے کے بعد زندہ رہنے کا خواہش مند نہیں تھا۔

"ہادی پلیز اٹھو یار، کچھ نہیں ہوا ایسا، میں ہوں تمہارے ساتھ، ہم دونوں مل کر اس ظلم کا حساب لیں گے، ان کو پھانسی کے پھندے تک پہنچائیں گے۔"

وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔

"اٹھو میری جان، ہمت کرو، ایسا کچھ نہیں ہوا۔" حمزہ اسے بہلا رہا تھا، اس نے اسے کبھی ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔

حمزہ اسے زبردستی اپنے بازوؤں کی گرفت میں لے کر گاڑی تک آیا، ڈرائیور نے گھبرا کر دروازہ کھولا اور اسے اندر بٹھانے میں مدد کی۔ ہادی کا چہرہ اذیت کی انتہا سے سرخ تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ لوگ جب حمزہ کے گھر پہنچے تو ہادی کا جسم بخار کی حدت سے جل رہا تھا۔ اس سرد موسم میں بھی اس کی پیشانی پر نمودار ہونے والی پسینے کی بوندیں حمزہ کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہ سکیں۔ وہ کمرے میں آ کر بیڈ پر یوں گرا تھا جیسے اس کے تن سے روح نکل گئی ہو۔

☆☆☆

"تم نے زندگی میں بہت کیس لڑے ہیں شہرزاد لیکن ہادی کا کیس تم صرف میری خاطر لڑو گی۔"

وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس سے وعدہ لے رہا تھا۔ شہرزاد نے چونک کر حمزہ کی طرف دیکھا، وہ اس کے چہرے پر موجود تاثر کو سمجھ نہیں پائی۔ وہ آج جیسے ہی آفس پہنچی تو وہ بھی اس کے پیچھے بغیر بتائے پہنچ گیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے میں اپنی پروفیشنل لائف کے ہر کیس کو بہت ایمان داری سے لڑتی ہوں، اور میں اس وقت تک کبھی کسی کیس میں ہاتھ نہیں ڈالتی جب تک مجھے اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ میرا کلائنٹ حق پر ہے۔" وہ اپنی فائلیں میز پر ترتیب سے لگاتے ہوئے اسے سنجیدگی سے بتا رہی تھی۔

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم یوں سمجھو، یہ کیس تمہارے لیے اتنا ہی اہم ہے، جتنا میں تمہاری زندگی کے لیے۔"

شہرزاد چونکی۔ اس کی آنکھوں میں موجود ہادی کے لیے جذباتیت دیکھ کر وہ مسکرائی، وہ جانتی تھی اس کا تعلق اپنے دوست کے ساتھ کتنا گہرا ہے۔

"مجھے ہادی سے جیلسی فیل ہو رہی ہے۔" شہرزاد نے اسے مطمئن کرنے کے لیے یونہی چھیڑا۔

"اور مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔" حمزہ نے بھی دوبدو جواب دیا۔

"میں ہادی کا دکھ اور تکلیف جان سکتی ہوں، کیونکہ وہ بھی اسی کرب سے گزر رہا ہے، جس سے میں گزری تھی۔"

"تمہیں جاننا بھی چاہیے کیونکہ تم دونوں فرسٹ کزنز ہو، اور میری مانو تم میں سے ایک آدھ خودکش بمبار جیکٹ پہن کر میر ہاؤس پر حملہ کر دے، بہت سے لوگوں کی زندگیاں سکون میں آجائیں گی۔" وہ ابھی تک غیر سنجیدہ تھا۔

"بے فکر رہو، میر حاکم کی گرفتاری بھی ان کے خاندان پر کسی خودکش حملے سے کم نہیں ہو گی۔" شہرزاد سنجیدہ ہوئی۔

"اور مجھے ڈر ہے کہ تم کہیں کسی پوائنٹ پر جا کر کمزور نہ پڑ جاؤ، کیونکہ خون کا تعلق کبھی کبھی تمام چیزوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔"

"اگر تم مجھے ایسا سمجھتے ہو، تو مجھے اس محبت پر افسوس ہے جو میں اتنے سالوں سے تم سے کرتی آ رہی ہوں۔" وہ خفا ہو کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگیں۔

"اور میں تم سے محبت کا اظہار کروانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔ اگر تم بھی یہ بات نہیں سمجھتیں تو مجھے بھی ان گزرے سالوں پر ندامت ہے، جو میں نے ایک پروفیشنل لڑکی سے نان پروفیشنل طریقے سے محبت کرتے ہوئے گزارے۔" حمزہ کو ہرانا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"میرا ٹائم ضائع مت کرو، مجھے آج کافی کام نبٹانے ہیں، اب نکلو یہاں سے۔" اس کی بے مروتی پر وہ بھی کھل کر مسکرایا۔

"تم سے اچھا تھا، تمہارے آفس کی اس دیوار سے محبت کر لیتا، قسم سے ان ساری باتوں کے بعد وہ بھی میرے گلے سے آ کر لگ جاتی۔" حمزہ کے معنی خیز انداز پر وہ سرخ ہوئی۔ اس نے سامنے رکھی فائل اٹھا کر اس کے کندھے پر دے ماری تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"اگر ایک منٹ کے اندر اندر تم نہیں اٹھے تو میں اسی دیوار میں تمہیں چنوا دوں گی۔" اس نے شرارتی لہجے میں دھمکی دی۔

"سنو، یہ تم، تم، کرنا بند کرو، مجھے اچھا نہیں لگے گا جب تم میرے گھر والوں کے سامنے یوں شادی کے بعد بدتمیزی سے بات کرو گی۔" اس کے لہجے کی شوخی گواہ تھی کہ وہ اب کافی پرسکون ہو چکا ہے۔

"اور مجھے بھی یہ اچھا نہیں لگے گا کہ میں شادی سے پہلے اپنے آفس کے پیون کو بلا کر دھکے مار کے تمہیں اس آفس سے نکلواؤں، کل کو یہ لوگ بھی تمہاری ریسپیکٹ نہیں کریں گے۔" شہرزاد کی اس شرارت پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور اپنے سیل فون پر آنے والی کال کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

ہادی آنکھیں موندے بستر پر دراز تھا، جب اس نے کسی کے اندر آنے کی آہٹ سنی۔

قدموں کی چاپ کمرے کی کھڑکیوں کے پاس آ کر رک گئی اور کسی نے بھاری کرٹن جیسے ہی ہٹائے، ہادی کا کمرہ سورج کی شعاعوں سے بھر گیا۔ اس نے پلکوں کی جھری سے حریم کو دیکھا۔ اس کی کنپٹیاں درد سے بھری ہوئی تھیں اور روشنی کسی تیز دھار چھری کی طرح اس کے وجود کو کاٹ رہی تھی۔

"پلیز کرٹن مت ہٹائیں، آنکھوں کو روشنی اچھی نہیں لگ رہی۔" ہادی نے اپنا بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

"روشنی کا برا لگنا قنوطیت کی نشانی ہوتی ہے۔" اس نے جالیوں کے پردے سرکا کر کھڑکیوں کے آگے کر دیے جبکہ ویلوٹ کے بھاری پردوں کو ویسے ہی رہنے دیا، ہادی اٹھ کر بیٹھ گیا، بخار تو اتر چکا تھا لیکن اس کے بعد کی نقاہت اس کے پورے وجود پر طاری تھی۔ وہ پچھلے دو دن سے حمزہ کے گھر میں تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ بمشکل ٹیک لگا کر بیٹھا۔

آج بہت عرصے بعد وہ دشمن جان عین اس کے سامنے تھی، جسے اس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ چاہا تھا، لیکن اس کے سامنے کبھی اس چیز کا اظہار نہیں کیا تھا اور شاید حریم تو اس کے ان جذبات سے آگاہ بھی نہیں تھی اور اب تو ویسے بھی اس کا نام کسی اور کے ساتھ جڑ چکا تھا تو وہ کیوں اس کے سامنے کمزور پڑتا، لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ آج پہلی بار اس کا دل اس لڑکی کو دیکھ کر بے ربط انداز میں نہیں دھڑکا۔ شاید وہ زندگی کی جو سب سے بڑی تکلیف جھیل چکا تھا اس کے بعد ہر خوشی اس کے لیے بے تاثر ہو چکی تھی۔

"تھینکس گاڈ، آپ نے مکمل طور پر آنکھیں تو کھولیں، حمزہ بھائی بہت اپ سیٹ تھے آپ کے لیے۔"

حریم کے پیچھے ملازمہ ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی جس میں ہادی کے لیے پرہیزی کھانا تھا۔ ملازمہ

نے سائیڈ میز پر وہ ٹرے رکھی اور خود کمرے سے نکل گئی، کمرے میں اب حریم اور ہادی تھے۔

”نکاح مبارک ہو آپ کو۔“ ہادی نے نظریں چرا کر محتاط انداز میں کہا۔

”تھینک یو، اب آپ اور حمزہ بھائی بھی اپنے بارے میں کچھ سوچیں، کب تک یونہی گھومتے رہیں گے۔“ وہ بے تکلف انداز میں گویا ہوئی تو ہادی کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اسی وقت حمزہ مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

”فار گاڈ سیک ہادی، عالیہ آنٹی سے فون پر بات کر لو، ورنہ وہ میرے خلاف اغوا کا پرچا کٹوا دیں گی۔“ حمزہ کے ہلکے پھلکے انداز پر وہ چونکا، اس نے فوراً سیل فون اٹھا کر دیکھا جس کی بیٹری ڈاؤن تھی۔

”میرے سیل فون سے بات کر لو، اور حریم تمہیں بابا بلا رہے ہیں۔“ حمزہ شاید اسے پرائیویسی دینا چاہتا تھا، وہ فوراً ہی ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی اور ہادی نے جیسے ہی مسز عالیہ قریشی کا نمبر ملایا، وہ اس کی آواز سن کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں تو وہ گھبرا گیا۔

”ہادی تم کہاں ہو بیٹا؟ گھر کیوں نہیں آ رہے ہو؟ نمبر کیوں بند کر رکھا ہے اپنا۔ تمہیں احساس ہے کچھ اپنی ماں کے جذبات کا؟ کیوں قطرہ قطرہ زہر دے کر مارنا چاہتے ہو مجھے۔“ وہ جذباتی انداز میں ایک دفعہ پھر رو پڑیں۔

”ماما، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اچھا، آپ ٹینشن مت لیں، میں ابھی اور اسی وقت گھر آ رہا ہوں۔“ وہ کمبل ایک طرف پر کر کے فوراً جانے کے لیے کھڑا ہوا اور دو دن کے بخار نے اسے اچھی خاصی نقاہت کا شکار کر دیا تھا، اس لیے جیسے ہی اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی، وہ چکرا کر دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”پہلے اپنے پیروں پر کھڑے تو ہو جاؤ، پھر گھر بھی چلے جانا۔“ حمزہ نے محبت بھرے انداز میں اسے ڈانٹا۔

”یار، ماما پریشان ہو رہی ہیں۔ تمہیں ان کی حالت کا اندازہ تو ہے، وہ خواہ مخواہ اوٹ پٹانگ سوچنا شروع کر دیں گی اور آج کل تو ویسے ہی وہ جذباتیت اور حساسیت کی انتہا پر ہیں۔“

”تو تم کون سا ان سے کم ہو؟ زندگی میں اس سے بڑی بڑی چیزیں ہو جاتی ہیں یار، اور میں کم از کم تمہیں کمزور اعصاب کا حامل نہیں سمجھتا، ابھی تو بہت جنگیں تمہیں اور شیری کو مل کر لڑنی ہیں۔“ حمزہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تم نے بتا دیا شہزاد کو؟“

”اتنی بڑی بات میں کیسے اس سے چھپا سکتا تھا اور ویسے بھی تم اور وہ دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر ہو، اور اب تو اتنی گہری رشتے داری بھی نکل آئی۔ اس لیے تم دونوں کو ہی ایک دوسرے کی طاقت بننا ہے۔“ حمزہ نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہم دونوں کے ساتھ ہی قسمت نے بہت بُرا کیا ہے حمزہ۔“ وہ خود ترسی کا شکار ہوا۔

”قسمت ظالم لوگوں کو بھی نہیں بخشتی، تمہارے دادا جان جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ چکے ہیں اور شہزاد قسم کھا چکی ہے کہ ان کو تختۂ دار تک پہنچا کر ہی دم لے گی اور تم جانتے ہو، وہ جو ٹھان لیتی ہے کر کے ہی دم لیتی ہے۔“ اس کے لہجے میں شہزاد کے لیے محبت تھی۔

”میرا اس شخص سے بلکہ اس پورے خاندان سے کوئی لینا دینا نہیں، میں صرف اپنے باپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“ وہ بیزاری سے گویا ہوا۔

”اور اس کے لیے ہمیشہ کی طرح ایک ہی لڑکی تمہاری ہیلپ کر سکتی ہے اور وہ ہے در شہوار بخشتم علی۔“ وہ سنجیدگی سے مزید گویا ہوا۔

”تم ساری زندگی اس خاندان سے نفرت کرتے رہے لیکن خدا کی قدرت دیکھو، اسی خاندان کی ہی ایک لڑکی نے تمہارے والدین کے اوپر ہونے والے ظلم کے ثبوت، تمہارے ہاتھوں میں دیے، اس بات کا مطلب جانتے ہو، تقدیر نے تمہیں کس لیے بچایا تھا؟ اس کی مصلحت کیا تھی۔؟ اسی خاندان کا ایک بچہ ان کے ظلم کا حساب لینے کے لیے کھڑا ہوگا اور ان کو تختۂ دار تک پہنچائے گا۔“

”ہاں ان سب کے تابوت میں آخری کیل تو میں ہی ٹھونکوں گا۔“ وہ پُرعزم ہوا۔

”لیکن پلیز اس لڑکی کے ساتھ کچھ بُرا مت کرنا۔“ حمزہ نے اسے تلقین کی۔

”کیوں تمہارے ماموں کی بیٹی ہے وہ۔“ وہ چڑ کر گویا ہوا۔

”نہیں، تمہارے اور میری ہونے والی مسز کے سگے تایا کی بیٹی ہے اور اس حوالے سے تو تم میرے بھی ”سالے“ لگتے ہو۔“ حمزہ شرارت سے ہنسا۔

”بکواس بند کرو، دوبارہ یہ لفظ ”سالا“ مت کہنا۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا تو حمزہ نے مسکراتے ہوئے کھانے کی ٹرے اس کے سامنے رکھی، اس کے بعد اسے ہادی کو اس کے گھر بھی پہنچانا تھا۔

☆☆☆

”داجی کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

ارسل نے اپنے فلیٹ کے امریکن کچن میں داخل ہوتے ہوئے پریشانی سے رومیصہ کو اطلاع دی۔

وہ کچھ دن پہلے برونائی کے دارالحکومت بندر سری بگوان میں شفٹ ہوئے تھے اور ارسل یہاں پر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا اور یہ گھر کی سہولت بھی اسے کمپنی کی طرف سے مہیا کی گئی تھی۔

یہاں ارسل اور رومیصہ کی زندگی انتہائی پُرسکون تھی، لیکن اکثر و بیشتر پاکستان سے آنے والی خبریں ان دونوں کے لیے پریشانی کا موجب ضرور بنتی تھیں۔

”کس جرم میں ان کو گرفتار کیا گیا ہے؟“

رومیصہ فکر مند انداز میں اس کے پاس آن بیٹھی۔ جوں جوں اس کی ڈلیوری کے دن قریب آ رہے تھے، اس کو یونہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ٹینشن ہونے لگتی اور یہ تو اچھی خاصی بریکنگ نیوز تھی۔

”اس بات کی تفصیل تو تمہاری بہن شیری ہی بتا سکتی ہے لیکن میری جو میرو سے فون پر بات ہوئی ہے اس کے مطابق بابا جان پر کئی افراد کے قتل کا مقدمہ ہے، جن میں زلفی ماموں کی بیوی کے خاندان کے ممبرز بھی شامل ہیں۔“

”اگر یہ کیس شیری کی طرف سے کیا گیا ہے تو تم اس بات کی تسلی رکھو، وہ ناحق کسی پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔“ رومیصہ کو شہزاد پر اپنے آپ سے بھی زیادہ بھروسا تھا اور اب تو اس کی ٹینا بیگم کے ساتھ بھی صلح ہو گئی تھی اور وہ اکثر ان سے بھی رابطے میں رہتی۔

”میں سوچ رہا ہوں میرہ اور ندرت امی کو بھی یہیں بلا لوں، بابا جان کی گرفتاری کے بعد پتا نہیں وہاں کس قسم کے حالات ہوں، اور پھر ایسی کنڈیشن میں تمہیں بھی کسی اور کی ضرورت ہوگی، اس لیے ان لوگوں کا یہاں آ جانا بہتر ہوگا۔“ رومیصہ کو اس کی اپنے سے وابستہ لوگوں کی فکر اچھی لگی۔

”میرے خیال میں تمہیں جلد از جلد انہیں بلا لینا چاہیے، کیوں کہ یہ ان کے اور ہمارے حق میں واقعی اچھا ہوگا۔“

شادی کے بعد رومیصہ میں بہت مثبت تبدیلی آئی تھی اس کا احساس اس کے قریبی لوگوں کو بخوبی ہو رہا تھا۔ وہ اکثر اپنے ماضی کے چند واقعات پر شرمندہ ہوتی۔ پھر ارسل اسے یہ کہہ کر تسلی دیتا کہ اگر روحیل محمود والا

حادثہ نہ ہوتا تو شاید وہ زندگی میں کبھی ایک دوسرے سے مل نہ پاتے۔ اللہ نے ان دونوں کو بہت عجیب طریقے سے ملایا تھا لیکن خوش آئند بات یہ تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔

☆☆☆

شہزاد پر لگتا تھا جیسے کوئی بھوت سوار ہو گیا ہو۔

وکالت کی دنیا میں اب اس کا ایک نام اور مقام بن چکا تھا، وہ اب مسز عالیہ قریشی کی کسی قسم کی بھی مدد کے بغیر اس میدان میں جھنڈے گاڑ رہی تھی۔ اس نے چند ہی دنوں میں میر حاکم علی کے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری نکلوا لیے تھے اور جس دن ان کی گرفتاری ہوئی، اسے بہت دن بعد اپنے رگ و پے میں طمانیت کا احساس اترتا ہوا محسوس ہوا۔

میر حاکم علی کی گرفتاری کی اطلاع ملتے ہی رومیصہ نے اس سے رابطہ کیا تو اس نے آگے سے جو تفصیل سنائی، اسے سن کر ارسل تو کچھ لمحے گنگ کیفیت کے ساتھ سیل فون کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ان کا پڑوسی ہادی اس کا فرسٹ کزن تھا اور اس کے والدین اس کے سگے ماموں اور ممانی تھے، یہ بات کوئی چھوٹی نہیں تھی اور اس پر جب اسے یہ علم ہوا کہ شیری اور رومیصہ بھی اس کی کزنز ہیں، وہ یہ حقیقت جان کر ششدر رہ گیا۔

زندگی کا یہ بہت عجیب اور حیران کن رخ اس کے سامنے آیا تھا۔

رومیصہ کو جیسے ہی میر خاقان کے بارے میں علم ہوا، وہ انتہائی جذباتی انداز میں رونے لگی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ پاکستان پہنچ کر اپنے باپ کا گریبان پکڑ لے اور ان سے گزرے ہوئے سالوں کا حساب لے اور ان سے پوچھے کہ ان دونوں بہنوں کا کیا قصور تھا جو انہوں نے ساری زندگی مڑ کر ان کی طرف نہیں دیکھا، لیکن ارسل اور شہزاد کے سمجھانے پر وہ کافی حد تک سنبھل تو گئی لیکن دل ہی دل میں وہ ٹھان چکی تھی کہ وہ میر خاقان سے اس چیز کا حساب ضرور لے گی۔ انہیں بھی نہ کبھی آئینہ ضرور دکھائے گی۔ فون پر بات کرتے ہوئے وہ مزید جذباتی ہوئی۔

”تم یہ کیس مت لڑو شیری! امام بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

”یہ تم اپنی محبت میں کہہ رہی ہو یا یہ تمہارے شوہر کی طرف سے کوئی مطالبہ ہے؟“ شہزاد نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے چھیڑا۔

اسپیکر پر یہ بات سن کر ارسل تڑپ اٹھا اس نے فوراً سیل فون رومیصہ کے ہاتھ سے لیا۔

”بہت افسوس کی بات ہے شیری، اگر آپ مجھے ایسا سمجھتی ہیں اور میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں آپ کی پروفیشنل لائف میں کوئی دخل اندازی نہیں کروں گا، چاہے آپ میر ہاؤس کے ایک ایک فرد پر کیس کر کے انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیں، کیوں کہ میرا ماننا ہے کہ جو برا کرے گا اسے اس کا خمیازہ خود ہی بھگتنا ہوگا۔“ ارسل ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہوا۔

”ڈونٹ وری ارسل! میں محض، روی کو چھیڑ رہی تھی، ورنہ مجھے بہت اچھی طرح سے یاد ہے کہ آپ نے روی سے شادی کرنے سے پہلے کیا الفاظ مجھ سے کہے تھے اور میں جانتی ہوں کہ آپ جیسا شخص اپنے لفظوں کی پاسداری کے لیے کس حد تک جا سکتا ہے۔“

”تھینک یو شیری! جیسے ہی حالات ٹھیک ہوں، آپ میرے اور رومیصہ کے پاس ضرور برونائی میں چکر لگائیے گا، ویسے ابھی میری والدہ اور سسٹر نمیرہ بھی یہاں آرہی ہیں۔“ ارسل کی بات پر وہ مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے خلوص دل سے مدعو کر رہا ہے اس لیے اس نے بھی اس سے وعدہ کر لیا۔

”شیری، اگر تم کہو تو میں پاکستان آجاتی ہوں، مجھے اندازہ ہے تم اس وقت کتنی تنہا ہو گی۔“ وہ روی کی محبت پر مسکرائی۔

”ڈونٹ وری۔ حمزہ میرے ساتھ ہے اور تمہیں پتا ہے اس کی موجودگی میں مجھے کسی اور کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اور تم صرف اپنا اور ارسل کا خیال رکھو اور اس کی فیملی ممبرز کے ساتھ اچھے طریقے سے ملنا۔“ شہزاد نے محبت سے اسے سمجھایا۔

”میں پہلے کی طرح بے وقوف نہیں رہی شیری۔“ رومیصہ نے افسردگی سے اسے اطلاع دی۔

”یہ بات تم مجھے نہیں مام کو بتاؤ، کیونکہ وہ اس بات پر کبھی یقین نہیں کریں گی۔“ شہزاد نے ہلکے پھلکے لہجے میں اسے چھیڑتے ہوئے فون بند کر دیا، وہ اب رومیصہ کی طرف سے مکمل مطمئن ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ہادی ماں کی گود میں محبت سے سر رکھے ایک گھنٹے سے ایک ہی پوزیشن میں لیٹا ہوا تھا۔

مسز عالیہ قریشی پیار سے اس کے سلکی بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے چھوٹی چھوٹی کئی باتیں کر چکی تھیں۔ ہادی ان کو بھی تفصیل سے واجد صاحب سے ہونے والی ملاقات کا قصہ سنا چکا تھا، اور دونوں میاں بیوی کو جب سے ہادی کی حقیقت پتا چلی تھی، ان کا پریشان ہونا ایک فطری عمل تھا لیکن مسز عالیہ قریشی کو دل ہی دل میں کہیں یہ بھی تسلی تھی کہ ہادی اس خاندان سے بے تحاشا نفرت کرتا ہے اور ان کو چھوڑ کر کبھی ان کے پاس نہیں جائے گا۔

”میرے خیال میں تمہیں اپنے والد سے ضرور ملنا چاہیے۔“ انہوں نے ہلکا سا سوچ کر کہا۔

”میں حیران ہوں ماما! این سی اے کا پڑھا لکھا بندہ، کسی مزار پر ہوش و حواس سے عاری زندگی کیسے گزار سکتا ہے۔“ ہادی کو اتنا علم ہو چکا تھا کہ اس خاندان کا ایک شخص کسی مزار پر مجذوب کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہے اور پچھلے دنوں ٹی وی پر اس حوالے سے کوئی فوٹیج بھی اس کی نظروں سے گزری تھی۔

”ہوش والے لوگ بے خودی کی کیفیت کو نہیں سمجھ سکتے بیٹا، اور اس شخص کے ساتھ اس کے خونی رشتوں نے جتنا برا کیا، اس کے بعد اس کا سانس لینا ہی غنیمت ہے، میں اس شخص کی کیفیت کو سمجھ سکتی ہوں، لیکن وہ اب ہے کہاں۔؟“ مسز عالیہ قریشی کی تمام تر ہمدردیاں ذوالکفل کے ساتھ تھیں۔

”جس مزار کا پتا چلا تھا وہ وہاں بھی نہیں ہوتے، میں پتا کروا چکا ہوں۔“ ہادی کا ہوم ورک بھی مکمل تھا۔

”اس بارے میں درشہوار سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا تمہیں، وہ اچھی طرح سے جانتی ہو گی۔“ اپنی ماں کی بات پر وہ چونکا۔

”آپ کو میرے ان سے ملنے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔“ وہ بہت محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر ان سے پوچھ رہا تھا۔ مسز عالیہ قریشی کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”اپنی ماں کا دل اتنا چھوٹا سمجھتے ہو کیا۔“

”نہیں میری ماں کے دل میں تو پوری کائنات جتنی وسعت ہے لیکن میں انجانے میں آپ کو کسی بھی حوالے سے ہرٹ کرنا نہیں چاہتا۔“ وہ ان کے ہاتھ کا بوسہ لے کر محبت سے گویا ہوا، مسز عالیہ قریشی کو اپنے دل کے آخری کونے تک ٹھنڈک محسوس ہوئی۔

”تم درشہوار سے بھی ملو گے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ وہ دانستہ اسے چھیڑنے کو بولیں۔

اسی وقت عبداللہ قریشی صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور سامنے کا منظر دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے، ہادی ابھی تک ماں کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا اور یہ اس کا لاڈ اٹھوانے کا مخصوص انداز تھا۔

”عبداللہ صاحب کیا بنا ہادی کی پوسٹنگ کا؟“ مسز عالیہ قریشی کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پر وہ چونکا اور جھٹ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ہماری بیگم صاحبہ، کسی چیز کا آرڈر کریں اور ہم اس پر عمل درآمد نہ کروا سکیں، یہ اس زندگی میں تو ممکن نہیں، کیوں ہادی۔“ انہوں نے خاکی رنگ کا لفافہ بیڈ پر اچھالا، جس پر ہادی کی پوسٹنگ کے آرڈرز وہ اپنے سامنے نکلوا کرلائے تھے۔

”میری پوسٹنگ، لیکن کہاں؟“ اس نے الجھ کر اپنی ماں کا چہرہ دیکھا، جو اس سے نظریں چرا رہی تھیں۔

”پنڈی میں کروادی ہے تمہاری پوسٹنگ، بس بہت رہ لیا گھر سے دُور، اب میں تمہیں ایک رات کے لیے بھی گھر سے دُور رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“ وہ ان کے لہجے میں پوشیدہ خوف سمجھ کر افسردگی سے گویا ہوا۔

”ماما اپنی محبت پر یقین نہیں ہے یا مجھ پر کوئی شک ہے آپ کو؟“

اس کے شکوے پر وہ تڑپ اٹھیں اور بے ساختہ اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔ ہادی ان کی دلی کیفیت کو سمجھ رہا تھا اس لیے اس نے زیادہ ری ایکٹ نہیں کیا۔

”تم پر تو اپنی ذات سے بھی بڑھ کر بھروسا ہے لیکن میر فیملی پر نہیں، میں تمہیں ان کے پڑوس میں کسی قیمت پر نہیں رہنے دوں گی اب۔“ وہ جذبات سے مغلوب لہجے میں بولیں۔

”وہ لوگ کون سا جانتے ہیں میری اصلیت کو؟“ ہادی کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ دوڑی۔

”شہرزاد تمہیں حاکم صاحب کے کیس میں سب کے سامنے لانا چاہتی ہے اور میں اس سے پہلے تمہیں مری سے یہاں شفٹ کرنا چاہتی ہوں کیونکہ یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی۔“ انہوں نے اس بار کھل کر بتایا۔

”آپ کو جو مناسب لگتا ہے کرلیں ماما، لیکن فارگاڈ سیک اس کے علاوہ میرے حوالے سے کچھ مت سوچیے گا۔ میری زندگی آپ دونوں سے شروع ہو کر آپ دونوں پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ اور کہنا نہیں چاہتا۔“ اس کے لہجے میں کچھ تھا، جو مسز عالیہ قریشی کے ساتھ ساتھ عبداللہ صاحب کو بھی اپنا دل یکبارگی ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس بار عبداللہ صاحب بے اختیار اس کی جانب بڑھے اور وہ جذباتی انداز میں ان سے لپٹ گیا۔

☆☆☆

وہ اپریل کا ایک خوش گوار دن تھا۔

ارتضٰی حیدر اسے بغیر بتائے، اس کے چیمبر میں چلا آیا، کیونکہ مسز عالیہ قریشی پچھلے کئی روز سے چھٹی پر تھیں اور ان کی غیر موجودگی میں شہرزاد پر کام کا بوجھ کافی بڑھ گیا تھا۔ اسے اپنے ساتھ ساتھ ان کے بھی کافی کیسز کو نبٹانا پڑ رہا تھا، بیچ میں وہ ایک دو بار جا کے ان سے مل بھی آئی تھی اور اسے ان کا انداز خاصا بجھا بجھا سا لگا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے ہادی والے سانحے سے سنبھلنے کے لیے انہیں ایک طویل عرصہ درکار ہو۔

ارتضٰی نے کاسنی رنگ کے سوٹ میں ملبوس اس سادہ سی لڑکی کو حسرت بھرے انداز میں دیکھا اور اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے کام میں کافی مصروف تھی، لیکن اسے دیکھ کر وہ ہلکا سا مسکرائی۔

”ارے ارتضٰی بہت دن بعد آپ نے چکر لگایا، لگتا ہے کافی بزی تھے آپ۔۔۔“ وہ بہت دھیمے پن سے کلام کرتی تھی۔

”میرے آنے یا نہ آنے سے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔“ اس کے شکوے پر وہ ہلکا سا مسکرائی اور ہاتھ میں پکڑا بال پوائنٹ میز پر رکھ کر اس نے ارتضٰی کی طرف غور سے دیکھا، پولیس یونیفارم میں وہ اسے کچھ خفا خفا سا لگا۔ وہ اس کی خفگی کے پیچھے چھپی وجہ کو اچھی طرح سے جانتی تھی لیکن اس کو دُور کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

یہ وہ شخص تھا جس نے اس کے کیریر کے اسٹارٹ میں بے غرض ہو کر اس کا بھرپور ساتھ دیا اور اس کے لیے بعض دفعہ اپنی پروفیشنل ذمے داریوں کو بھی پس پشت ڈال دیا، اس لیے شہرزاد اس کی دل سے قدر کرتی تھی لیکن اس سے زیادہ کرنا اس کے اپنے اختیار میں نہیں تھا۔

”ارتضٰی! آپ کی کمی کا احساس ہوا ہے تو میں پوچھ رہی ہوں۔۔۔“ اس کی باتوں میں پیچیدگی تھی نہ لگاوٹ۔

”مر نہ جاتے خوشی سے گر اعتبار ہوتا۔“ ارتضٰی افسردہ انداز میں گویا ہوا، اپنے پرپوزل کے ریجیکٹ ہونے کے بعد پہلی بار وہ اس کے سامنے آیا تھا اور اپنے اندر یہ ہمت پیدا کرنے میں اسے کافی دن لگے تھے۔

”اینی ہاؤ، بہت بہت مبارک ہو، آپ نے حاکم صاحب کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا ہی دیا لیکن یاد رکھیے گا، زخمی شیر زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔“ وہ اسے ڈھکے چھپے الفاظ میں محتاط رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

”سلاخوں کے پیچھے موجود شیر اپنا سر پھوڑنے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا۔“ اس نے کافی کا آرڈر دے کر مسکرا کر کہا۔

”کچھ لوگوں کا حوالات کے اندر یا باہر ہونا ایک ہی بات ہے، ان لوگوں کے پالتو ملازم ان کے اشاروں پر کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، اور یہ بات کم از کم آپ کو سمجھانے کی ضرورت تو نہیں ہونی چاہیے۔“ ارتضٰی نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

”بعض باتیں اور بعض چیزیں کسی کو سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آتیں، وقت سب سے بڑا استاد ہوتا ہے، وہ خود سمجھا دیتا ہے۔“ شہرزاد نے اپنے سامنے رکھی فائل بند کی کیوں کہ ارتضٰی کی گہری نظروں کا ارتکاز اس کے کام کی رکاوٹ بن رہا تھا، وہ اس کے پرپوزل سے انکار تو کر چکی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے چھلکتی محبت کے آگے بند نہیں باندھ سکتی تھی، اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ چیز سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے بھی اپنے اختیار میں نہیں۔

”دعا کریں وقت مجھے بھی کچھ چیزیں سمجھا دے، ابھی تو اپنی بے وقعتی کا دکھ مارے جا رہا ہے۔“ اس نے اس بار کھل کر گلہ کیا۔

”میں آپ کی بات سمجھی نہیں۔“ وہ جان کر انجان بنی۔

”اگر آپ بھی نہیں سمجھیں تو پھر دنیا کا کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا۔“

”کم آن ارتضٰی! کھل کر بات کریں۔“ وہ بھی آج یہ قصہ نبٹانا چاہتی تھی۔

”شیری، خود کو ریجیکٹ کیے جانے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟ کیا اتنا بُرا ہوں میں؟ میں مانتا ہوں شاید آپ کو ڈیزرو نہیں کرتا، لیکن میں آپ کو خوش رکھ سکتا تھا، آپ ایک بار مجھے اس قابل تو سمجھتیں۔۔۔“ وہ اب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پُراعتماد انداز میں کہہ رہا تھا۔

”میں کون ہوتی ہوں ارتضٰی! کسی بھی انسان کو ریجیکٹ کرنے والی۔۔؟“ اس نے پیپر ویٹ اڑتے کاغذات پر رکھ کر ارتضٰی کو غور سے دیکھا، جس کے چہرے پر اس وقت ہزاروں شکوے تھے۔

”آپ ریجیکٹ تو کر چکی ہیں، مجھے مسز قریشی نے بتایا تھا۔“ وہ افسردگی سے گویا ہوا۔

”میں نے ریجیکٹ نہیں کیا تھا بلکہ ان کو یہ بتایا تھا کہ آپ آٹھ سال لیٹ ہو چکے ہیں۔“ اس کی بات پر ارتضٰی چونکا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آٹھ سال پہلے میں ایک شخص سے ملے بغیر اس کی آواز کے عشق میں گرفتار ہوئی تھی اور پھر اگلے آٹھ برس میں نے اس سے دُور رہ کر اپنی محبت کو آزمایا اور یقین کریں جب آٹھ سال بعد دوبارہ میں نے وہ آواز، وہ لہجہ اور وہ انداز سنا تو مجھے لگا بیچ میں یہ سال تو کبھی آئے ہی نہیں۔ اور آپ خود بتائیں میں کسی اور کی محبت کو دل میں رکھ کر آپ کا ہاتھ کیسے تھام سکتی تھی، میں زندگی کے کسی معاملے میں بددیانتی کی قائل نہیں۔“ شہرزاد نے اسے

لاجواب کیا۔

"آئی ایم سوری۔" ارتضیٰ حقیقتاً شرمندہ ہوا۔

"آپ میرے بہت اچھے دوست تھے، دوست ہیں اور رہیں گے، اور یقین مانیں ارتضیٰ اگر بیچ میں حمزہ خالد نہ ہوتا تو شاید آج صورت حال مختلف ہوتی، اس لیے اپنے دل سے وہ تمام فضول باتیں اور چیزیں نکال دیں، آپ کا ساتھ کسی بھی لڑکی کے لیے باعث اعزاز ہو سکتا ہے اور وہ لڑکی بہت خوش قسمت ہوگی۔" شہرزاد کی بات پر ارتضیٰ اس بار دل سے مسکرایا، کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی، اس لیے اس کے دل میں موجود آخری گلہ بھی دم توڑ گیا بس اپنی محبت کو نہ پانے کی ایک کسک تھی، جو شاید اس کے ساتھ ساری زندگی رہنے والی تھی۔۔

☆☆☆

میر ہاؤس میں آج گویا شام غریباں برپا تھی۔

حالات نے ایک دم ہی پلٹا کھایا اور میر حاکم کے اقتدار کا سورج ڈوب گیا۔ وہاج کی موت کے بعد محتشم تو ویسے ہی تمام چیزوں سے دستبردار ہو چکے تھے۔ اس لیے خاقان صاحب کو ہی سارے معاملات دیکھنے پڑ رہے تھے۔ اور یہ تقدیر کی سب سے بڑی آزمائش ہی تھی کہ ایک طرف ان کا سگا باپ تھا تو دوسری طرف سگی بیٹی، جو ان کے خلاف بھرپور طریقے سے میدان سجائے بیٹھی تھی اور المیہ یہ تھا کہ وہ یہ بات کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتے تھے۔

پورے گھر میں ایک سوگ کی سی کیفیت طاری تھی، برہان اپنی یونیورسٹی سے چھٹیاں لے کر آج کل خاقان کے ساتھ بھاگ دوڑ کر رہے تھے کیونکہ ارسل کسی کو بھی بتائے بغیر برونائی جا چکا تھا تو شاہ میر کی پوسٹنگ پشاور تھی، لیکن وہ آج کل چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا۔

آج بہت دن بعد سب لوگ کھانے کی میز پر موجود تھے لیکن گفت و شنید صرف خاقان صاحب اور برہان کے درمیان ہو رہی تھی۔

حاکم صاحب کی گرفتاری پر پورا خاندان پریشان تھا۔

ان کو ایک ہفتہ پہلے مونیکا کیس میں گھر سے گرفتار کیا گیا تھا اور خاقان صاحب کی کافی بھاگ دوڑ کے بعد بھی ان کی ضمانت نہیں ہو پا رہی تھی کیوں کہ کرسچن کمیونٹی میں ان کے خلاف پارلیمنٹ کے سامنے دھرنا دیا گیا تھا اور دلاور کو امریکن ایمبیسی بھرپور سپورٹ کر رہی تھی۔ اس لیے حکومت کے لیے کوئی بھی فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔

اگرچہ میر ہاؤس کی سیاسی زندگی میں اس سے بڑے معاملات ہو چکے تھے ان کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، لیکن حاکم صاحب اس گھر کا وہ ستون تھے، جس پر پوری عمارت کا بوجھ تھا اور ان کی موجودگی میں ان کی اولادوں نے کبھی کسی معاملے میں ٹینشن لینے کی ضرورت سمجھی ہی نہیں تھی۔

یہی وجہ تھی کہ حاکم صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کس طرح حوالات کی سلاخیں توڑ کر باہر نکل آتے۔ وہ ملاقات کے لیے آنے والے خاقان علی اور برہان کو دیکھتے ہی چیخنے اور چلانے لگتے، اور کسی کا بھی لحاظ کیے بغیر بلند آواز میں گالیاں دیتے۔ الیکشن ہارنے کے بعد اس گرفتاری پر ان کی حالت خاصی قابل رحم تھی اور ان تمام حالات میں محتشم صاحب کی لاتعلقی اور کسی حد تک بے حسی قابل دید تھی۔ وہ ان سارے حالات میں یوں پھر رہے تھے جیسے ان کا کسی سے کوئی لینا دینا نہ ہو۔ وہاج کی ناگہانی موت نے ان کو بالکل تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

دوسری طرف بیرسٹر شہرزاد کی فتوحات کا سلسلہ کافی دراز ہوتا جا رہا تھا، ہر گزرتے دن میں اس کے کریڈٹ پر ایک کامیاب کیس کا اضافہ اس کے اعتماد میں مزید اضافے کا موجب بن رہا تھا اور آج کل تو وہ مسز قریشی کا پورا چیمبر سنبھالے ہوئے تھی کیونکہ ہادی والے معاملے کے بعد مسز عالیہ قریشی جم کر کام نہیں کر پا رہی تھیں، اس لیے شہرزاد کی ذمے داریوں میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔

شہرزاد نے مینا بیگم کے ساتھ مل کر بے سہارا خواتین کے لیے ایک ٹرسٹ کی بھی بنیاد رکھ دی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ مینا بیگم شوبز، اور فیشن کی دنیا کو چھوڑ کر رفاہی کاموں کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس کوشش میں اسے کافی کامیابی ملی تھی۔

میر ہاؤس کے ڈائننگ روم میں اس وقت خاندان کے سب ہی افراد موجود تھے اور حاکم صاحب کی گرفتاری کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ پورا خاندان ایک ساتھ میز پر اکٹھا تھا ورنہ تو سب ہی کی بھوک پیاس اڑی ہوئی تھی۔

گھر کی خواتین تاجدار بیگم، شارقہ بیگم، انابیہ، طوبیٰ، نیمرہ اور درشہوار خاموشی سے کھانا کھا رہی تھیں اور ندرت بیگم نے ارسل کے جانے کے بعد اپنے کمرے سے نکلنا بالکل بند کر دیا تھا۔ وہ شدید قسم کے صدمے کا شکار تھیں، کیونکہ ارسل کو انہوں نے سگی اولاد کی طرح چاہا تھا اور وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ وہ اس طرح ان کو بغیر بتائے چھوڑ کر جا سکتا ہے۔

"چچا مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی بیرسٹر شیری کے پاس داجی کے اتنے اہم اور سیکرٹ ڈاکومنٹس گئے کیسے؟" شاہ میر نے کھانا کھاتے ہوئے ایک دم سوال کیا تو درشہوار کا رنگ اڑ گیا، وہ کن انکھیوں سے شاہ میر اور اپنے چچا خاقان کے چہرے کے تاثرات کو جانچنے لگی۔

"دنیا میں حرام خور لوگوں کی کمی تو نہیں اور مجھے تو یہ حویلی کے کسی خاص ملازم کا کام لگتا ہے، جس نے بابا جان کی پیٹھ میں خنجر گھونپ کر کسی پرانی دشمنی کا بدلہ چکایا ہے اور ان شاء اللہ اس کا پتا بھی نہ بھی تو چلے گا۔" خاقان کی بات سن کر درشہوار کا دل بری طرح کانپا، وہ اپنا کھانا ادھورا چھوڑ کر چپکے سے اٹھی اور ہال کمرے سے نکل گئی، طوبیٰ نے حیرانی سے اسے پچھلے لان کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

"میرے خیال میں چچا جان، ہمیں بیرسٹر شیری سے ملنا چاہیے، ہو سکتا ہے کوئی دوسرا راستہ نکل آئے۔" برہان کی بات پر میر خاقان کو کرنٹ لگا، جبکہ محتشم صاحب کی لاتعلقی تاجدار بیگم کو خاصی تسکین دے رہی تھی۔

"تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" خاقان علی نے اپنے شکستہ اعصاب کو پرسکون رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔

"پتا تو چلے وہ کیوں ہمارے خاندان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے، میں مانتا ہوں یہ اس کا پروفیشن ہے لیکن ایک کے بعد ایک کیس وہ صرف ہمارے ہی خاندان کے خلاف کیوں لڑ رہی ہے؟" برہان نے بیزاری سے مزید کہا۔

"اس کا مطلب تو یہی ہے کہ وہ اپنی کوئی بھاری قیمت لگوانا چاہتی ہوگی، اس فیلڈ میں زیادہ تر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔" برہان کی بات پر خاقان علی نے بے چینی سے پہلو بدلا اور محتشم علی ابھی بھی خاموش تھے۔

"اس لڑکی سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں برہان! اس کے بارے میں سب پتا کروا چکا ہوں، وہ کسی قیمت پر بکنے کو تیار نہیں، اس نے صرف ہمارے خاندان کو ہی نہیں بلکہ کچھ اور سیاسی فیملیز کو بھی ٹارگٹ کر رکھا ہے، کھوسہ صاحب کے بھتیجے کو سزا دلوانے اور شجاعت صاحب کی کرپشن کو بے نقاب کروانے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے اور میں نہیں چاہتا کہ ہم میں سے کوئی بھی اس سے رابطہ کر کے اسے یہ تاثر دے کہ ہم اس سے ڈر چکے ہیں۔"

خاقان صاحب نے فوراً برہان کی مخالفت کی، کیونکہ ایسا کرنا ان کی مجبوری تھی، وہ کسی بھی قیمت پر یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا شہرزاد کے ساتھ تعلق کھل کر ان کے خاندان کے افراد کے سامنے آئے کیونکہ ان حالات میں اس کے نتائج کافی منفی ثابت ہو سکتے تھے۔

"لیکن چچا جان اس طرح تو حالات بہت خراب ہو جائیں گے اور داجی بہت زیادہ اسٹریس میں ہیں۔"

برہان فکر مند ہوا۔

”زندگی میں جو بویا ہو بیٹا، وہ کاٹنا تو پڑتا ہے اور تم لوگ بُرا مت ماننا لیکن ابا جان نے اپنی زندگی میں ہمیشہ فرعون بن کر ہی فیصلے کیے ہیں، اپنی اولاد پر تو ان کا بس نہیں چلا اور دوسروں کو انہوں نے کبھی سکون سے بیٹھنے نہیں دیا۔“ تاجدار بیگم کے لہجے کی تلخی میں دن بہ دن اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ سب نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تو وہ مزید گویا ہوئیں۔

”ذوالکفل بھی تو ان کی سگی اولاد تھا، اسے چھوڑ کر انہوں نے مونیکا کے سارے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا کیونکہ اپنے کلیجے پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہوتا۔ ان سب جانوں کا حساب تو دینا ہی پڑے گا، یہاں بھی اور آخرت میں بھی۔“ وہ ایک سرد آہ بھر کر بولیں۔

”بھابھی! میں آپ کی ساری باتوں سے متفق ہوں، لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم بابا جان کو ان حالات میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے، یہ اب ہمارے خاندان کی عزت کا سوال ہے، مخالفین کی نگاہیں ہم پر جمی ہوئی ہیں۔۔“ خاقان صاحب کی بات پر ڈائننگ ہال میں سناٹے کا راج ہو گیا۔

”یہ سارے معاملات تو چلتے رہیں گے آپ لوگوں کو یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ فارحہ کی عدت ختم ہو چکی ہے۔“ شارقہ بیگم کی اس بے وقت کی راگنی پر خاقان صاحب کی پیشانی پر ناگواری کا تاثر ابھرا۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو شارقہ۔ ہم لوگ بابا جان کی ضمانت کو چھوڑ کر فارحہ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیں۔ دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟“ انہوں نے اپنا سارا غصہ ہمیشہ کی طرح شارقہ پر اتارا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا خاقان صاحب۔ میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی۔“ وہ گھبرا کر تاجدار بیگم کی طرف دیکھنے لگیں، جو فوراً ان کی مدد کو آ گئیں۔

”فارحہ کے لیے خاندان سے باہر ایک دو لوگوں نے نکاح کے پیغامات بھجوائے ہیں اور میرے خیال میں اب ہمیں اس فرسودہ رسم کو ختم کر دینا چاہیے کہ ہمارے خاندان کی لڑکیوں کے رشتے باہر نہیں ہو سکتے اور ویسے بھی دہاج کے حوالے سے وہ ہماری ذمے داری ہے اور ہم اس کے لیے جواب دہ ہیں۔“

تاجدار بیگم کے سامنے خاقان صاحب کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اس لیے خاموش ہو گئے۔

”تاجدار ٹھیک کہہ رہی ہے، ہمیں بابا کی ضمانت سے پہلے اس قصے کو نبٹا لینا چاہیے کیونکہ میں نہیں چاہتا بابا جان واپس آنے کے بعد پھر کسی بے جوڑ رشتے کی بنیاد رکھیں، کیونکہ ہمارا خاندان اب مزید کسی احمقانہ فیصلے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“ محتشم علی کی بات پر خاقان صاحب کو جھٹکا لگا کیونکہ انہیں اپنے بڑے بھائی سے قطعاً اس بات کی توقع نہیں تھی۔

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں بھائی، آپ کو شاید علم نہیں، بابا جان اس بات پر کتنا ہنگامہ کھڑا کریں گے۔“ خاقان پریشان ہوئے۔

”وہ واپس آئیں گے تو ہنگامہ کریں گے۔“ شاہ میر کی بڑبڑاہٹ اتنی بھی کم نہیں تھی کہ وہاں موجود لوگوں کی سماعتوں تک نہ پہنچتی۔ تاجدار بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے سب سے لاڈلے بیٹے کو خاموش رہنے کی تنبیہہ کی۔

”تم چھوڑو بابا جان کو، کل کو اس گھر کے فیصلے ہم لوگوں نے ہی مل کر کرنے ہیں اور میرے خیال میں فارحہ کے ساتھ ساتھ ہمیں طوبیٰ اور شاہ میر کے نکاح کے معاملے کو بھی دو چار دن میں نبٹا لینا چاہیے کیونکہ بابا جان والے کیس سے مجھے کوئی خاص امید نہیں، ان لوگوں کے پاس ثبوت پکے ہیں۔“ محتشم صاحب کی بات پر وہاں موجود سب ہی لوگوں کو خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔

محتشم علی نے بہت عرصے کے بعد نارمل انداز میں گھر کے معاملات میں حصہ لیا تھا اور شاہ میر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اٹھ کر باپ سے لپٹ جاتا اور اپنے تایا کے منہ سے یہ بات سن کر طوبیٰ شرما کر فوراً اٹھی اور شاہ میر جانتا تھا اس کے چہرے پر پھیلا ہوا گلابی پن اس کے نام کی مرہون منت ہے۔

”شکر ہے آپ نے بھی زندگی میں کوئی ڈھنگ کی بات کی۔“ تاجدار بیگم کو بھی اپنے اعصاب تھوڑے پرسکون محسوس ہوئے اور اپنے جیٹھ کی یہ بات سن کر شارقہ بیگم بھی کافی مطمئن نظر آ رہی تھیں کیونکہ آگے ان کی بیٹی کا معاملہ تھا۔

”دیکھ لیں بھائی جان، ان حالات میں ایسا کرنا کیا مناسب طرز عمل ہو گا؟“ خاقان علی شش و پنج کا شکار تھے۔

”مجھے تو اس میں ایسی کوئی قابل اعتراض بات نہیں لگ رہی اور ویسے بھی بیٹیوں کا فریضہ جتنی جلدی ادا ہو جائے بہتر ہوتا ہے۔“ شارقہ بیگم نے ایک دفعہ پھر اپنے شوہر کے سامنے بولنے کی جرأت کی، کیونکہ اب تو جیٹھ اور جیٹھانی دونوں ہی ان کے فیور میں تھے۔

”شارقہ ٹھیک کہہ رہی ہے خاقان! اور بابا جان والی بات کو کچھ دیر کے لیے دماغ سے نکال دو، کیونکہ یہ فیصلہ ہم دونوں خاندانوں کی بہتری کے لیے ہی ہے اور اس کے بعد شاید ہمیں اپنے غلط فیصلوں کو سدھارنے کا وقت نہ ملے۔“

”اگر آپ سب لوگوں کو یہی مرضی ہے تو مجھے اس چیز پر کوئی اعتراض نہیں۔“ خاقان صاحب نے بھی بالآخر سب کے سامنے سر جھکا دیا۔

☆☆☆

وہ موسم سرما کی شاید آخری بارش تھی۔

صبح سے ہونے والی کن من آج دل میں کوئی بھی خوش گوار احساس جگانے سے قاصر تھی۔ کل جمعے کی نماز کے بعد شاہ میر اور طوبیٰ کا اور فارحہ اور سلمان کا نکاح پڑھا دیا گیا تھا۔ سلمان، تاجدار بیگم کی بہت قریبی دوست کا بھانجا تھا، جس کی بیوی کا انتقال پہلے بچے کی پیدائش پر ہو گیا تھا۔ اس کے بچے کو تو ننھیال والوں نے رکھ لیا جبکہ سلمان ٹورنٹو چلا گیا اور وہاں اپنے بزنس کے سلسلے میں کافی عرصے سے مقیم تھا۔

فارحہ کے لیے یہ رشتہ تاجدار بیگم کو بالکل مناسب لگا تھا۔

حاکم صاحب کی گرفتاری کی وجہ سے دونوں تقریبات میں صرف گھر کے لوگ ہی مدعو تھے اور اس بات کوفی الحال حاکم صاحب سے بھی چھپایا جا رہا تھا، اور کوئی خاص انتظامات بھی نہیں کیے گئے تھے کیونکہ سب ہی کے دل بجھے ہوئے تھے۔

درشہوار اس افسردہ ماحول سے اکتا کر اپنا چائے کا کپ اٹھائے اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔

جیسے ہی اس نے اندر قدم رکھا، کمرے کی کھلی کھڑکی سے ہادی کے بیڈ روم سے آنے والی افغانی مغنیہ کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ کمرے میں گونجنے والا میوزک اس قدر تیز تھا کہ وہ اگر اپنی کھڑکیاں بند بھی کر لیتی تو آواز اس کی سماعتوں تک لازمی پہنچتی۔ آج پورے ایک ہفتے کے بعد ہادی کے گھر کی لائٹس آن ہوئی تھیں، وہ شاید جاب سے چھٹی لے کر اسلام آباد گیا ہوا تھا اور درشہوار نے اس کے انتظار میں اتنے دن سے اپنے کمرے کے پردے ہٹا کر کھڑکیاں کھول رکھی تھیں، فارسی شاعری اس کے دل پر اثر کر رہی تھی اور وہ اپنے بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

مغنیہ کی آواز میں محسوس کیے جانے والا سوز تھا، جس نے درشہوار پر عجیب سا سحر طاری کیا، بہت دن بعد اس

کے تھکن گزیدہ اعصاب کچھ پرسکون ہوئے۔

میں بندہ آزدم، عشق است امام من (میں آزاد بندہ ہوں، عشق میرا امام ہے)
عشق است امام من، عقل است غلام من (عشق میرا امام ہے اور عقل میری غلام ہے)
جان در عدم آسودہ، بے ذوق تمنا بود (روح عدم میں آرزو و تمنا کے ذوق سے خالی تھی)
مستانہ نوا ہا زد، در حلقہ دام من (جب وہ میرے قلب میں آئی تو مستانے ساز و نغمے چھڑے)
پیدا بہ ضمیرم، او پنہاں بہ ضمیرم او (وہ میرے باطن میں پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی)
ایں است مقام او، دریاب مقام من (یہ تو اس کا مقام ہے، اب میرا مقام دریافت کر)

جیسے ہی مغنیہ کی آواز بند ہوئی، وہ خود کو اپنے کمرے کی کھڑکیوں کے پاس آنے سے نہیں روک سکی، چند فٹ کے فاصلے پر ہادی کے بیڈ روم کی کھلی کھڑکیوں سے اس کے کمرے کا سارا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بیڈ روم میں شیشم کی لکڑی کے خوب صورت بھاری بیڈ پر ایک اٹیچی کیس کھلا ہوا تھا اور پاس ہی سلیقے سے تہ کیے کپڑوں کا ڈھیر تھا، درشہوار کی پیٹھ پر کسی نے خاردار کوڑا اینچا اور اسے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔

وہ کپڑوں اور سامان کی تعداد سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس گھر کا مکین یہاں سے کوچ کرنے والا ہے۔ اس سوچ نے اسے ایک دم بے چین کیا اور ہاتھ میں پکڑے گرم چائے کا کپ غیر متوازن ہوا اور کچھ چائے اس کے ہاتھ پر چھلک گئی اور اس کے منہ سے سی کی آواز نکلی۔ جسم کو کاٹتی ہوئی جلن اس کے روم روم میں بھر گئی اور اسے اپنے گلے کی رگوں میں کوئی پھندہ سا محسوس ہوا۔

ہادی اچانک اپنے کمرے میں آیا اور اس کی نگاہ کھلی کھڑکی سے درشہوار پر پڑی جو اپنے ہاتھ پر پھونکیں مار کر جلن کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اسے ہادی کی پیکنگ سے زیادہ تکلیف، ہاتھ کے جلنے کی وجہ سے ہو رہی ہے۔

اس کی آنکھوں سے آنسو ایک تواتر سے بہ رہے تھے، ہادی اپنے کمرے میں واپس آ چکا تھا اور اس وقت کھڑکی کے پاس دنیا بھر کی حیرانی اپنی آنکھوں میں سموئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، جو بار بار بازو کی پشت سے آنسوؤں کو بے دردی سے صاف کر رہی تھی۔

”کیا ہوا درشہوار؟ رو کیوں رہی ہو؟“ ہادی نے اچنبھے سے اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھا اور کھڑکی کے مزید قریب آ گیا۔

”کک...... کچھ نہیں، ہاتھ جل گیا تھا میرا۔“ اس نے روتے ہوئے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

”تم کہیں جا رہے ہو کیا؟“ درشہوار نے کمرے کے سامان کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں میری پوسٹنگ ہو گئی ہے پنڈی اور کل یہاں سے نکل جاؤں گا۔“ درشہوار کے بدترین شک کی تصدیق ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں ایک دم ہی تیزی آ گئی۔ ہادی کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔

”درشہوار! اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر دو ذرا۔“

وہ جو پلکیں جھپک کر اپنی آنکھوں میں جمع ہونے والے نمکین پانیوں کے آگے بند باندھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی، اس نے دھندلی بینائی کے ساتھ ہادی کو اپنے بیڈ کی سائیڈ میز کی دراز سے ایک ٹیوب نکال کر کھڑکی کی طرف آتے دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی، ہادی نے مضبوطی سے اپنے پاؤں کھڑکی میں جمائے اور اپنے اور اس کے کمرے کا چند فٹ کا درمیانی فاصلہ بڑی مہارت سے عبور کر کے درشہوار کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

درشہوار کا دل یکبارگی دھڑکا، اس نے خوف زدہ انداز میں بھاگ کر اپنے کمرے کا دروازہ اچھی طرح سے لاک کیا، جبکہ ہادی اس کی گھبراہٹ اور بے چینی کو دانستہ نظر انداز کیے ٹیوب کا ڈھکن کھول رہا تھا۔ درشہوار کو اپنے ہاتھوں کی جلن سے زیادہ اس کی جان کی فکر لاحق ہوئی۔

”پاگل ہو گئے ہو؟ مرنے کا ارادہ ہے کیا؟“ درشہوار پریشان ہوئی۔

”جب خود دندناتی ہوئی میرے گھر سے بیڈ روم تک پہنچ جاتی ہو، اس وقت کیا مرنے کا ارادہ ہوتا ہے تمہارا۔“ وہ بہت نرمی سے اس کے ہاتھ پر ٹیوب لگاتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ درشہوار کو یہ سارا منظر ایک خواب سا محسوس ہوا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس اس کے اندر اور باہر کی جلن کو کم کر رہا تھا۔

”پلیز ہادی! جاؤ، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ درشہوار نے خوف زدہ انداز میں بیڈ روم کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔

”تم بھی ڈرتی ہو، یہ نئی اطلاع ہے میرے لیے۔“ وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

”میں اپنے لیے نہیں، تمہارے لیے ڈر رہی ہوں۔“

”چھوڑو تم مجھے، یہ بتاؤ تمہارے ذوالکفل چچا کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“ ہادی کا انداز سرسری تھا لیکن درشہوار کا چونکنا بھی فطری تھا۔

”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ تم کیسے جانتے ہو زلفی چچا کو، ان کے بارے میں تو کوئی باہر کا بندہ نہیں جانتا۔“ وہ پریشان ہوئی۔

”میں باہر کا بندہ ہوں بھی نہیں۔“ ہادی نے تصحیح کی تو وہ سوالیہ انداز سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ”میں سمجھی نہیں، تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ وہ فادر ہیں میرے اور میں بیٹا ہوں ان کا۔“ ہادی کی بات پر درشہوار نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور دو قدم پیچھے ہٹ کے خوف زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی، جو دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھے بالکل نارمل انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا کیونکہ وہ اس قیامت کو جھیل چکا تھا، جو اب اس گھر کے ایک ایک فرد کو باری باری جھیلنی تھی۔

”کیا، کہا تم نے؟ تم کس کے بیٹے ہو؟“ درشہوار کو اپنی سماعتوں پر شک ہوا۔

”اس عورت کا، جس کے پورے خاندان کو حاکم علی نے اپنے ظلم کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔“

درشہوار کئی ثانیے پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتی رہ گئی، اسے لگا جیسے اس کا سارا وجود سن ہو کر رہ گیا ہو۔ الفاظ اس کے تالو سے چپٹ گئے۔

”میں محمد احمد ہوں، خدیجہ ذوالکفل کا بیٹا۔ جسے ایک ویران اسٹیشن پر چھوڑ کر اس کی ماں نے خودکشی کر لی تھی اور باپ ہوش و حواس سے بے نیاز ہو گیا تھا۔“ درشہوار کو لگا جیسے وہ کوئی پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل رہا ہو۔

”میں حاکم علی کے اپنی ہی اولاد پر ظلم کی جیتی جاگتی تصویر ہوں، میں تمہارے سامنے قسم کھا کر کہتا ہوں، میں اس شخص کو سولی پر لٹکا کر ہی دم لوں گا۔“

اس کے تلخ انداز پر درشہوار کا دل ڈوب کر ابھرا اور گلا سوکھنے لگا، وہ خوف زدہ نگاہوں سے ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اسے پہلی بار اس کے چہرے کے نقوش میں زلفی چچا کی شباہت محسوس ہوئی، وہ ان ہی کی طرح دراز قد تھا اور اس کی ناک اور ٹھوڑی بھی بالکل اپنے باپ پر تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ درشہوار نے تھوک نگل کر گلے کو تر کیا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو، تمہارا اس سارے معاملے میں کیا قصور ہے۔؟“ ہادی نے اس کی ڈوبتی ہوئی نبض کو سہارا دیا۔

”کیا تم مجھے اپنے زلفی چچا سے ملوا سکتی ہو؟“ اس کی آنکھوں میں خفیف سی سرخی اتر آئی۔

وہ آس بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ درشہوار کو کچھ ہوا، وہ جذباتی انداز میں اس کی جانب بڑھی اور اس کا بازو پکڑ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ اس کے جذبات کو سمجھ رہا تھا، وہ جانتا تھا یقیناً یہ بات اس کے لیے بھی کسی جذباتی دھچکے سے کم نہیں تھی۔

اس نے بھی بلا ارادہ درشہوار کو تسلی دینے کے لیے اپنے ساتھ لگا کر اس کے سر کو نرمی سے سہلایا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اسے ایک معصوم سی گڑیا لگی۔ اس کا دل پہلی بار مختلف ڈھب سے اس کے لیے دھڑکا۔ اسے زندگی میں جس لڑکی سے سب سے زیادہ نفرت تھی، اسی کے لیے اللہ نے اس کے دل میں نرمی ڈال دی تھی۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آرہا، میں تم سے کیا کہوں؟“ اس کی آواز ابھی تک کپکپا رہی تھی۔

وہ گویا ہوا تو درشہوار کا سارا جسم مجسم سماعت بن گیا۔

”میں ساری زندگی تمہارا یہ احسان نہیں بھول سکتا درشہوار! تم نے مجھے خرید لیا ہے۔ تم اگر نہ ہوتیں تو شاید میں ساری زندگی اپنے والدین کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو نہ جان پاتا، تم اگر نہ ہوتیں تو شاید میں ساری زندگی بدلے کی آگ میں جلتا رہتا اور مجھے اس بات کی حسرت رہتی کہ میں اپنے والدین کی خوشیوں کے قاتل کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھ پاؤں گا، اور تم اگر نہ ہوتیں تو شاید مجھے کبھی اس بات کا احساس نہ ہوتا کہ بعض محبتیں بے غرض ہو کر کی جاتی ہیں اور اللہ ان کو اپنی رحمت کے طور پر انسانوں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔“ ہادی کا لہجہ بھی نم ہوا۔

درشہوار نے ضبط کی کوشش میں انگارہ بنتی اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا اور ہادی کے بازو پر اس کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہوئی، وہ ابھی بھی رو رہی تھی۔

”صرف تم ہو جو مجھے میرے باپ سے ملوا سکتی ہو۔“ ہادی نے اس کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں پر چنتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے وعدہ کرتی ہوں ہادی، کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے میں تمہیں زلفی چچا کے پاس لے جاؤں گی۔“ درشہوار نے اپنے سرد ہاتھوں میں اس کا حدت سے بھرپور ہاتھ پکڑ کر کہا تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا، وہ جانتا تھا درشہوار ایسا کر گزرے گی۔

درشہوار نے ساری رات بے چینی سے گزاری، اگلے روز جیسے ہی اسے علم ہوا محتشم علی، برہان اور خاقان صاحب کے ساتھ پیشی کے لیے اسلام آباد نکل گئے ہیں اور شاہ میر کسی کام سے ایبٹ آباد گیا ہوا تھا، وہ اطمینان سے تاجدار بیگم کو اپنی ایک دوست کی عیادت کا کہہ کر گھر سے نکل آئی، جہاں پر کچھ فاصلے پر ہادی اپنے دوست سعد کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ سعد کو بھی ساری حقیقت کا علم ہو چکا تھا، اس لیے وہ ہراساں نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا، وہ جانتا تھا کہ میر ہاؤس میں کسی کو بھی اس بات کی بھنک پڑ گئی تو وہ درشہوار کو گولی سے اڑا دیں گے۔

”میں تمہیں کسی بھی قیمت پر اکیلا نہیں جانے دوں گا ہادی۔“ سعد نے دائیں بائیں دیکھ کر پریشانی سے گاڑی کی چابی پکڑی۔

”کیوں ٹینشن لے رہے ہو، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ ہادی نے اسے تسلی دینے کی ناکام کوشش کی۔

”تم جو بھی کہو، تمہارا اکیلے جانا خطرے سے خالی نہیں۔ چپ کر کے گاڑی میں بیٹھو۔“ وہ زبردستی ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا اور ہادی نے بے بس انداز میں گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر درشہوار کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سیاہ رنگ کی چادر میں اپنا سارا وجود چھپا رکھا تھا۔

آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ تینوں سید مراد علی شاہ کے مزار پر پہنچے تو درشہوار کو ایک ملازم نے پہچان لیا، اور درشہوار نے ہادی کا تعارف اپنی کسی دوست کے بھائی کی حیثیت سے کروایا تھا جو سائیں بابا سے ملنے کے لیے خصوصی طور پر آئے تھے۔

اسی ملازم سے ہی درشہوار اور ہادی کو علم ہوا تھا کہ سائیں بابا نے پچھلے تین ماہ سے خود کو صرف ایک کمرے تک محدود کر لیا تھا، اور جگر کی بیماری کی وجہ سے وہ اب کسی سے نہیں ملتے، اب بھی درشہوار اگر ساتھ نہ ہوتی تو مزار کی انتظامیہ میں سے کوئی بھی ان دونوں کو سائیں بابا کے پاس جانے نہ دیتا۔ ملازم ان کو مزار کے پچھلے احاطے میں ایک قطار میں بنے ہوئے تین کمروں کی طرف لے آیا۔ کمرے کے اندر سے اگلے کمرے کا راستہ تھا، جو تاریکی میں اٹا ہوا تھا۔

وہ انہیں لے کر قطار کے سب سے آخر والے کمرے کی طرف آگیا۔

ملازم نے جیسے ہی دروازہ کھولا، ہادی کو لگا جیسے خون اس کی شریانوں میں اچھلنے لگا ہو۔ اندر گھپ تاریکی کا راج تھا۔ وہ تینوں اندر داخل ہوئے۔

”لائٹ تو جلاؤ، اتنے اندھیرے میں کیوں رکھا ہوا ہے انہیں؟“ درشہوار کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری در آئی۔

ملازم نے بٹن دبا کر بلب روشن کیا۔

ہادی کو لگا جیسے ساری کائنات تھم گئی ہو۔ ہر چیز سانس، دھڑکن، نظر، سب کچھ جامد ہو گیا ہو۔

سامنے جھلنگا سی چارپائی پر جگر کے عارضے میں مبتلا ایک نحیف سا وجود لیٹا ہوا تھا، اس وجود نے بلب کی روشنی میں بمشکل آنکھ کی پتلیوں کو گھما کر دیکھا۔ ان کا پورا وجود ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا، کم خوراک، ادویات کی عدم دستیابی یا شاید اپنے آپ سے بے نیازی نے ان کو بہت جلد ضعف میں مبتلا کر دیا تھا۔

”زلفی چچا! کیسے ہیں آپ؟“ درشہوار فکرمند انداز میں ان کی طرف بڑھی، وہ گم صم کیفیت کے ساتھ چھت کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”کیا ہوا ہے انہیں؟“ سعد نے پریشانی سے پوچھا۔

”سائیں بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں، پچھلے کچھ دنوں سے بار بار بخار ہو رہا ہے، میں کئی بار بتا چکا ہوں بڑے صاحب کو۔ ان کا آرڈر آئے گا تو پھر ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں گے۔“ ملازم نے جھٹ سے اپنی صفائی دی۔

درشہوار نے ہاتھ کے اشارے سے ملازم کو کمرے سے نکل جانے کو کہا تو وہ فوراً چلا گیا۔ وہ اور سعد پریشانی سے ہادی کی طرف دیکھ رہے تھے جو آستین سے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

چارپائی پر لیٹے لاغر وجود کو دیکھ کر ہادی کو لگا جیسے کسی نے بدن سے اس کی روح کو کھینچ لیا ہو۔ اس کا دل پگھل کر آنکھوں سے رسنے لگا۔ چارپائی پر لیٹا ہوا کمزور شخص اس وقت بخار کی حدت سے جھلس رہا تھا۔

ہادی بے خودی کی کیفیت میں اس شخص کے عین سامنے جا کھڑا ہوا، جو اس کا باپ تھا، جس نے ایک عورت سے محبت کی سزا اپنے خونی رشتوں کی ساری زندگی کی نفرت کو سہتے ہوئے گزار دی تھی۔ وہ اس وقت لاچاری کی اس اسٹیج پر تھا جہاں ظالم سے ظالم شخص کا دل بھی انہیں ایک بار دیکھ کر پسیج جاتا۔ پتا نہیں حاکم علی کو اللہ نے کس مٹی سے بنایا تھا جو اپنے ہی وجود کے ایک حصے کو بے دردی سے پھینک کر بڑے مزے سے اپنی زندگی جی

رہے تھے۔

کمرے میں خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا، درشہوار، سائیں بابا کا ہاتھ پکڑے محبت سے سہلا رہی تھی اور ان کی آنکھوں میں موجود ہلکی سی شناسائی سے ہادی کو اندازہ ہوا کہ وہ گھر کے مکینوں سے اتنے بھی لاتعلق نہیں تھے۔ ہادی ان کے قریب آیا اور اسے اپنے باپ کے تنفس کی ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔

”ذلفی چچا دیکھیں کون آیا ہے آپ سے ملنے۔ آپ کا احمد، آپ کا بیٹا!“

درشہوار کے جذباتی انداز پر اس لاغر وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی، وہ بے تاثر آنکھوں کے ساتھ ناخن چباتے ہوئے چھت کو گھورنے لگے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر ہادی کا سانس سینے میں اٹکنے لگا۔

”میں انہیں ابھی اور اسی وقت اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا ہاسپٹل، اور خود ان کا علاج کرواؤں گا۔“ ہادی کی اس بات پر درشہوار نے خوف زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ جو زبردستی سائیں بابا کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”فار گاڈ سیک ہادی! ایسا مت کرنا، پورے خاندان میں طوفان آجائے گا، یہ لوگ مجھے مار دیں گے کیونکہ ملازم بتا دے گا کہ تم میرے ساتھ آئے تھے اور ان کو زبردستی اپنے ساتھ لے کر گئے ہو۔“ درشہوار نے گھبرا کر ہادی کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکنے کی کوشش کی۔

ہادی نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر درشہوار کو پیچھے کیا، وہ خوف زدہ انداز میں دیوار سے جا لگی۔

”وہ ٹھیک کہہ رہی ہے ہادی۔“ سعد بھی پریشان ہوا، وہ درشہوار کی باتوں کی سنگینی کو سمجھ رہا تھا۔

”خدا کے لیے سعد اسے سمجھاؤ، یہ اپنے ساتھ مجھے بھی مشکل میں ڈال دے گا۔“ درشہوار کی آواز مرتعش ہوئی۔

”اگر مجھ سے محبت کرتی ہو تو مجھے مت روکنا۔“ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے درشہوار کو ساکت کر دیا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھنے لگی، جس نے سعد کو گاڑی مزار کے احاطے میں لانے کی تلقین کی تھی۔ وہ اپنے باپ کو اٹھا کر جیسے ہی باہر نکلا، مزار پر موجود ملازم بھاگ کر اس کی طرف آئے اور ناگواری سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”ہم لوگ ان کو ہاسپٹل لے کر جا رہے ہیں، میں داجی کو خود بتا دوں گی۔“ درشہوار کے حاکمانہ انداز پر سب وہیں رک گئے، ہادی کو ہلکی سی ندامت کا احساس ہوا، وہ سعد کی مدد سے سائیں بابا کو گاڑی میں بٹھا چکا تھا۔ سعد نے جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

”آئی ایم سوری درشہوار، گاڑی میں بیٹھو، ہم لوگ تمہیں راستے میں ڈراپ کر دیں۔“ ہادی شرمندگی سے اس کے پاس آیا۔

”تم جاؤ، میں خود چلی جاؤں گی۔“ درشہوار نے نظریں چرا کر اس سے کہا۔

”کیسے جاؤ گی تم؟ پلیز بحث مت کرو، ہمارے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے۔“

”تمہاری ہی بہتری کے لیے کہہ رہی ہوں ہادی، تم ذلفی چچا کو لے کر جتنی جلدی یہاں سے نکل سکتے ہو نکل جاؤ، ورنہ ایسا طوفان آئے گا جو ہم سب مل کر بھی نہیں سنبھال پائیں گے۔“

اس کی بات ہادی کی سمجھ میں آگئی تھی، وہ پریشانی سے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آن بیٹھا، اس کے باپ کا وجود بخار کی حدت سے جلتا ہوا انگارہ بنا ہوا تھا اس کے بیٹھتے ہی سعد نے بہت تیزی سے گاڑی مزار کے احاطے سے نکالی تھی اور پہلی بار ہادی کو احساس ہوا کہ وہ اپنی خاطر درشہوار کو بہت بڑی مشکل میں ڈال آیا ہے۔

☆☆☆

کمرہ عدالت میں حاکم علی شدید غم و غصے کی کیفیت میں مبتلا تھے۔

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ یہاں موجود سب ہی لوگوں کو گولیوں سے اڑا دیتے۔

اس پیشی کی تمام چیزیں ان کے خلاف ہی گئی تھیں اور اس بات نے ان کے دونوں بیٹوں خاقان علی اور محتشم کو اچھا خاصا پریشان کر دیا تھا۔ خاقان علی تو دہری اذیت کا شکار تھے کیونکہ سزا پانے والا ان کا باپ تھا تو سزا دلوانے والی ان کی سگی بیٹی۔

بیرسٹر شیری کے پاس ایسے ثبوت تھے جو اگلی پیشی پر خاقان علی کے باپ کو تختہ دار پر لٹکنے سے نہیں روک سکتے تھے، اس بار تو مسز قریشی اور عبداللہ صاحب بھی اس کے ساتھ کمرہ عدالت میں آئے تھے، کیوں کہ اب یہ ان سب کی ذاتی جنگ تھی۔ ایک طرف ہادی تھا تو دوسری طرف شہزاد اور دونوں ہی حاکم علی کے ڈسے ہوئے تھے اور اس ساری کارروائی کے دوران عدالت کے کٹہرے میں کھڑے شخص کو متنفر نگاہوں سے گھورتی رہی۔

یہ وہ شخص تھا جس نے اس کی ماں کی خوشیوں سے بھرپور زندگی میں اندیشے بھر دیے تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اس کے باپ کے پیروں میں خوف کی بیڑیاں ڈال دی تھیں اور وہ ساری زندگی اپنی ہی سگی اولاد سے نظریں بچائے گھومتے رہے۔

وہی شخص اس وقت کینہ توز نگاہوں سے بیرسٹر شیری کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کا دماغ ایک نئے جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔

شہزاد نے کمرہ عدالت میں اپنے دلائل کے ذریعے میر حاکم کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ اس کے پاس ایک ایک چیز کا ثبوت تھا اور جیسے جیسے وہ معزز عدالت کے سامنے وہ سارے حقائق پیش کر رہی تھی ویسے ویسے حاکم صاحب کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔

ایک دو دفعہ تو مسز قریشی خود بھی تھوڑا بے چین ہوئیں، انہوں نے بھی شہزاد کا یہ نڈر اور بے باک روپ پہلی بار دیکھا تھا، ورنہ تو وہ بڑی سے بڑی بات بھی بڑے متوازن اور ہموار لہجے میں کہنے کی عادی تھی لیکن اس کیس میں اس کا رنگ ڈھنگ ہی الگ تھا۔

وہ پیشی کے بعد مسز قریشی کے ہمراہ کورٹ سے سیدھی اپنے چیمبر پہنچی تو اسے حمزہ کی اپنے سیل فون پر کال موصول ہوئی۔ وہ تھوڑا پریشان لگ رہا تھا۔

”شہزاد میں دو پرائیوٹ سیکورٹی گارڈز تمہارے بھجوا رہا ہوں، تم ان کے بغیر کہیں نہیں نکلو گی۔“

”پھر میری سیکورٹی کا دورہ پڑ گیا تمہیں؟“ اس نے بات کو ہنس کر ٹالنے کی کوشش کی۔

”میں تمہیں جو بات کہہ رہا ہوں، تم اسے غور سے سنو۔“ وہ تھوڑا تلخ ہوا تو شہزاد کو بھی معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔

”آخر ہوا کیا ہے حمزہ؟ تم مجھے کھل کر کیوں نہیں بتا رہے۔“

”میں تمہیں کھل کر اور دو ٹوک انداز میں بتا رہا ہوں کہ محتاط ہو جاؤ اور اپنی آمد و رفت تھوڑی محدود کر دو اور یہ بات کان کھول کر سن لو کہ تم ان سیکورٹی گارڈز کے بغیر کہیں نہیں جاؤ گی، کیوں کہ میں اب اس بات پر کوئی کمپرومائز نہیں کروں گا۔ چاہے تم جتنا بھی شور مچاؤ۔“ شہزاد نے اس کی بات کو ان سنی کیا۔

”اچھا فون بند کرو، مام کی کال آ رہی ہے، میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔“ شہزاد نے اس کی کال کاٹ کر ٹینا بیگم کی کال لی۔

”جی مام، خیریت؟“

”شیری کہاں ہو بیٹا؟ میں نے آج روبی کے ہونے والے بچے کے لیے کافی شاپنگ کی ہے، تم اس سے

برونائی کا ایڈریس لے کر مجھے فارورڈ کرو، میں آج ہی اسے یہ ساری چیزیں کوریئر کروانا چاہ رہی ہوں۔" دوسری طرف ٹینا بیگم خوش گوار لہجے میں اس سے مخاطب ہوئیں۔

"خیر ہے مام! آج بہت لاڈ آرہا ہے رومی پر۔" اس نے ہنس کر مام کو چھیڑا۔

"ہاں، بہت دنوں بعد آج کچھ اچھا سننے کو ملا ہے، میں آج دل سے خوش ہوں شیری۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسیں تو شہرزاد کو بڑا اچھا احساس ہوا۔

"چلیں، اچھی بات ہے، میں رومی سے ایڈریس پوچھ کر آپ کو واٹس ایپ کرتی ہوں۔" شہرزاد نے مسکرا کر کہا۔

"بات سنو شیری! اگر تم ٹائم نکالو۔ تو آج ماں بیٹی ایک ساتھ مل کر اچھا سا لنچ کرتے ہیں اور میں تم سے ایک بہت خاص بات بھی شیئر کرنا چاہتی ہوں۔" ٹینا بیگم کے لہجے کی کھنک اس بات کی گواہ تھی کہ وہ آج واقعی بہت خوش تھیں۔

"آف کورس مام! آپ مجھے چیمبر سے پک کرلیں، چلے چلتے ہیں۔"

شہرزاد تھوڑی دیر پہلے کی حمزہ کی ہدایات بھلائے ان کو انکار نہیں کر سکی۔ دن دو بجے کے قریب ٹینا بیگم نے اسے چیمبر سے اپنی گاڑی پر پک کیا تھا اور جس وقت وہ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر نکل رہی تھی اسی وقت حمزہ کے بھجوائے ہوئے دو سیکورٹی گارڈز وہاں پہنچے تھے۔

ٹینا بیگم کو آج سے پہلے اتنا خوش شہرزاد نے کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ گرے کلر کے بریزے چکن کے سوٹ میں بے انتہا حسین لگ رہی تھیں اور آج تو انہوں نے اپنا میک اپ بھی بہت دل لگا کر کیا تھا، اس لیے کافی فریش لگ رہی تھیں۔ شہرزاد نے کئی بار انہیں توصیفی نگاہوں سے دیکھا۔

وہ دل ہی دل میں ان کو نظر نہ لگنے کی دعا دیتے ہوئے حاکم علی کی پیشی کا احوال سنا رہی تھی، جسے ٹینا بیگم گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بہت انہماک سے سن رہی تھیں۔ جیسے ہی اس نے بات ختم کی، ٹینا بیگم خوش گوار لہجے میں گویا ہوئیں۔

"تمہیں پتا ہے آج خاقان تمہارے کورٹ جانے کے بعد دوبارہ گھر آیا تھا۔"

"واٹ؟" وہ شاکڈ ہوئی۔ "آپ اس وجہ سے خوش ہو رہی ہیں مام۔" شہرزاد کو تاسف نے آن گھیرا۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو شیری۔" وہ گھبرا کر بولیں۔

"آئی ایم سوری مام! آپ کے لہجے کی کھنک، مجھے بغیر کہے وہ سب بتا رہی ہے، جو آپ مجھ سے شیئر کرنا چاہتی ہیں۔" وہ ہلکی سی خفا ہوئی تو ٹینا بیگم کو چند لمحوں کے لیے چپ سی لگ گئی۔ کچھ توقف کے بعد ایک گہرا سانس بھر کے گویا ہوئیں۔

"تم نہیں جانتی ہو شیری! میں نے اس شخص کو کسی زمانے میں ٹوٹ کر چاہا تھا۔ اس کے لیے ساری دنیا کے سامنے ڈٹ گئی تھی اور جب کوئی نہیں مانا تو چپکے سے اس کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔"

"اور اس شخص میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ آپ کو ساری دنیا کے سامنے اپنا تا۔ اس کی بزدلی نے آپ کی زندگی کو برباد کیا، آپ کے بچوں سے باپ کی شفقت چھین لی، آپ کو تنہائی کے جہنم میں پھینک دیا کیا وہ سب بھول گئیں آپ؟" وہ تلخ ہوئی۔

"سب کچھ یاد ہے شیری! میں نے تمہارے باپ سے محبت کی سزا خود کو ساری زندگی دی ہے، لیکن میں اس شخص سے نفرت کرتے کرتے تھک گئی ہوں اور اب تھوڑا ریلیکس کرنا چاہتی ہوں۔" انہوں نے پشاور روڈ سے پی سی ہوٹل کی طرف جانے کے لیے یوٹرن لیا اور شہرزاد کو لگا جیسے وہ اپنی زندگی میں بھی کوئی بڑا یوٹرن لے چکی ہیں۔ شہرزاد نے مڑ کر اپنی ماں کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔

"آپ صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتیں، میر خاقان علی کیا ڈیل کر کے گئے ہیں آپ کے ساتھ۔" شہرزاد ان سے کافی بدگمان تھی اور اس ملاقات کو کسی اور ہی تناظر میں دیکھ رہی تھی۔

"بائے گاڈ شیری! خاقان نے اپنے باپ کے کیس کے بارے میں مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا۔ بہت سال بعد اس نے پہلی بار مجھ سے صرف اپنی اور میری بات کی ہے۔ تم میری بات کا یقین کرو شیری۔" شہرزاد کی خفگی ٹینا بیگم کو پریشان کر رہی تھی۔

"دھیان سے گاڑی چلائیں، وہ بلیک ہنڈا سوک بہت بری طرح اوور ٹیک کر کے گئی ہے۔" شہرزاد نے انہیں ٹوکا، وہ تھوڑی ڈسٹرب ہو چکی تھیں۔

"تم جب پوری بات سنو گی تو آئی سوئیر، تمہاری ساری ناراضی ختم ہو جائے گی۔" وہ ہوٹل کی پارکنگ میں اپنی گاڑی لے آئیں، شہرزاد نے ان کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ سیاہ رنگ کی ہنڈا سوک ان کی گاڑی کے عین سامنے آکر پارک ہوئی۔

ٹینا بیگم کی باتیں سن کر شہرزاد کا ذہن بری طرح سے الجھ چکا تھا اور وہ دل ہی دل میں قیاس لگا رہی تھی کہ خاقان صاحب کی اس میٹنگ کا اصل مقصد کیا ہو سکتا ہے، اسی وقت اس کے سیل فون پر حمزہ کی کال آنے لگی۔

وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر گاڑی سے نیچے اتری اور اس نے بڑی بے دلی کے ساتھ حمزہ کی کال اٹینڈ کی۔ ٹینا بیگم گاڑی لاک کر کے جیسے ہی مڑیں ان کی نگاہ سامنے کار میں موجود شخص کے ریوالور پر پڑی، جو شہرزاد کا نشانہ باندھ رہا تھا۔ ٹینا بیگم کے کلیجے میں ہاتھ سا پڑا۔

شہرزاد اپنے سیل فون کی طرف متوجہ تھی، اسی وقت ٹینا بیگم نے بجلی کی سی سرعت سے اس کے پیچھے سے آکر اسے سائیڈ پر دھکا دیا۔ شہرزاد اپنا توازن کھو کر زمین پر بری طرح سے جا گری اور اسی وقت فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونجی، شہرزاد کے لیے باندھا گیا نشانہ ٹینا بیگم کے پورے وجود کو چھلنی کر چکا تھا۔ یہ صرف چند سیکنڈ کا کھیل تھا اور شہرزاد کے ساتھ بات کرتے ہوئے حمزہ نے جیسے ہی اس کی چیخ کی آواز سنی، اس کا دل تھم کر رہ گیا۔

ہوٹل کے سیکورٹی گارڈز فائرنگ کی آواز سن کر بہت تیزی سے اس طرف دوڑتے ہوئے آئے اور ہنڈا سوک میں موجود دو افراد میں سے ایک کو فرار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جبکہ شہرزاد سکتے کے عالم میں ٹینا بیگم کا گرے رنگ کے نفیس سوٹ میں ملبوس وجود خون سے لت پت دیکھ رہی تھی، ان کی آنکھوں کی پتلیاں ساکت اور جسم بے جان ہو چکا تھا اور ان کے چاندی جیسے اجلے چہرے پر موت کی زردی قابض ہو چکی تھی۔

☆☆☆

قسمت آج کل در شہوار کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔

وہ زلفی چچا سے ملاقات کے بعد خوف زدہ انداز میں گھر میں داخل ہوئی تو وہاں ندرت بیگم اور نمیرہ کی گمشدگی کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا، وہ دونوں بہت خاموشی سے آج صبح اسلام آباد ایرپورٹ کے لیے نکلیں۔ وہاں سے ان کی پہلے دبئی اور پھر برونائی کے لیے فلائٹ تھی اور انہوں نے اپنی اس روانگی کو اس قدر خفیہ رکھا ہوا تھا کہ گھر میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔

تاجدار بیگم کو تو اس بات کا غم کھائے جا رہا تھا کہ کب ان کے ویزے لگے، کب ان کی ٹکٹس کنفرم ہوئیں اور وہ کیسے اتنی خاموشی سے نکل گئیں، ان میں سے کسی کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ ان کو اسلام آباد ایرپورٹ پر

پہنچانے سے لے کران کے تمام ڈاکومنٹس مکمل کروانے میں شاہ میر کا ہاتھ تھا، جس نے ارسل کے ساتھ اس دوستی کو خوب نبھایا تھا۔ وہ آج ایبٹ آباد جانے کا بہانا کرکے ان دونوں کو ایئر پورٹ ڈراپ کرآیا تھا اور جب تک نمیرہ نے اسے دوبئی جاکر اپنے پہنچنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ اس نے مری میں قدم نہیں رکھا تھا۔

گھر کے سارے مرد تو صبح سے اسلام آباد پیشی پر گئے ہوئے تھے اور تاجدار بیگم کی ویسے ہی رات سے طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ شارقہ بیگم اور انابیہ دونوں اپنے کمروں تک محدود تھیں۔ درشہوار ایک گھنٹے بعد گھر پہنچی تو وہاں ندرت بیگم اور نمیرہ کے جانے کی خبر اتنی گرم تھی کہ کسی نے اس کی غیر موجودگی کا نوٹس ہی نہیں لیا تھا۔ شاہ میر ایک سائیڈ پر بیٹھا بڑے پرسکون انداز میں سیب کھا رہا تھا۔

”تمہیں پتا تھا ناں کہ ندرت امی اور نمیرہ آج جارہی ہیں۔“ طوبیٰ نے جیسے ہی شاہ میر کو اکیلے دیکھا تو کمر پر ہاتھ رکھ کر ناراضی سے گویا ہوئی۔

”ہاں علم تھا، تمہیں کوئی ایشو ہے کیا۔“ شاہ میر کی اس بات پر اسے دھچکا لگا۔

”کتنے بُرے ہو تم میرو، تمہیں پتا ہے، بابا اور تایا ابا اس خبر سے کتنے اپ سیٹ ہوں گے۔“ طوبیٰ کو اس کی حرکت پر افسوس ہوا۔

”اور جو ندرت چچی کی یہاں رہ کر طبیعت خراب ہورہی تھی، اچھا ہے کوئی تو اس جہنم سے نکلا، بلکہ تم بھی اپنی پیکنگ اسٹارٹ کرلو، میری کوئٹہ کی تین سال کی پوسٹنگ آنے والی ہے، نکاح تو ہمارا ہو ہی چکا، رخصتی کسی نے نہ کی تو ایسے ہی ہاتھ پکڑ کرلے جاؤں گا۔“ وہ سیب کھاتے ہوئے بے تکلفی سے مسکرا کر بولا تو اس نے جھنجلا کر اس کے کندھے پر مکا مارا۔

اسی وقت درشہوار حواس باختہ انداز میں اندر داخل ہوئی، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شاہ میر اور طوبیٰ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”خدا کے لیے درشہوار! کوئی بُری خبر مت سنانا۔“ شاہ میر کی اس سے ناراضی کافی حد تک ختم ہوچکی تھی۔

”بہت بُری خبر ہے میرو، بیرسٹر شیری کی والدہ کا مرڈر ہوا ہے اور جس شخص کو گرفتار کیا گیا ہے اس نے بیان دیا ہے کہ وہ بیرسٹر شیری کو میر حاکم علی کے کہنے پر قتل کرنے نکلا تھا لیکن غلطی سے ان کی والدہ سامنے آگئیں۔“ درشہوار کی اس بات پر شاہ میر کا رنگ اڑا۔ طوبیٰ نے بھی بوکھلا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تینوں جیسے ہی ٹی وی لاؤنج میں پہنچے، سامنے تاجدار بیگم ٹی وی کی طرف دیکھ کر استہزائیہ انداز میں تبصرہ کررہی تھیں۔

”سچ کہتے ہیں سیانے، اللہ جب کسی بندے کو ذلیل کرنے پر آتا ہے تو اسے اس کے غلط فیصلوں کے ذریعے رسوا کرتا ہے۔ بابا جان نے اپنے تابوت میں آج آخری کیل بھی اپنے ہی ہاتھوں سے ٹھونک دی۔ مبارک ہو تم سب کو۔“

تاجدار بیگم اس وقت ٹی وی کے سامنے موجود تھیں جہاں ٹینا ہاؤس کے باہر کے لائیو مناظر دکھائے جارہے تھے اور ایک اور چینل پر گرفتار کیے جانے والے شخص کا بیان بار بار چلایا جارہا تھا اور شاہ میر نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا وہ ان کے منشی احمد بخش کا بیٹا سرفراز تھا۔ بابا جان نے حوالات میں رہتے ہوئے اپنی طرف سے بڑی ہوشیاری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن ان کا یہ آخری وار نہ صرف بُری طرح سے ناکام ہوا تھا بلکہ وہ حاکم صاحب کو بھی بُری طرح سے ایکسپوز کرگیا تھا۔ اب ان کو پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچاسکتا تھا۔

☆☆☆

ندرت بیگم اور نمیرہ آج شام ہی برونائی پہنچی تھیں۔

رومیصہ کو ٹینا بیگم کے اچانک انتقال کی خبر نے انتہائی صدمے سے دوچار کیا تھا، کئی گھنٹوں تک تو اس کا

دل ودماغ اس خبر کو قبول کرنے سے انکاری تھا لیکن جب پاکستانی چینلز پر اس نے اپنی ماں کا خون آلود چہرہ دیکھا تو اسے لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔

ارسل نے شہزاد سے بات کرکے ایئر ایجنسی میں ایک ٹکٹ ارینج تو کروالیا تھا لیکن وہ رومیصہ کو اس حالت میں اکیلے بھجوانا نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ اسے دوسرا ٹکٹ دو دن بعد کا ملا تھا۔ شہزاد تو بھی چاہتی تھی کہ وہ پاکستان نہ آئے لیکن رومی کی ایک ہی ضد تھی کہ اسے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کا آخری دیدار کرنا ہے۔ وہ مسلسل رورہی تھی اور اس کی یہ حالت ارسل کو سخت پریشان کررہی تھی۔

وہ رومی کو اس کی ماں کے جنازے سے صرف ایک گھنٹہ پہلے اسلام آباد پہنچانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ٹینا بیگم کی میت کو رومیصہ کی وجہ سے گزشتہ کئی گھنٹوں سے سرد خانے میں رکھا گیا تھا۔

ایئر پورٹ پر اسے حمزہ اور حریم ریسیو کرنے کے لیے آئے تھے اور وہ بُری طرح سے رورہی تھی، اس کی آنکھیں مسلسل رونے کی وجہ سے سوج چکی تھیں اور اسے بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ وہ برونائی جانے سے پہلے بھی آخری بار ماما سے مل کر نہیں گئی تھی۔

حریم اور حمزہ نے تاسف بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، جیسے ہی وہ ٹینا ہاؤس کے سامنے پہنچی، اس وقت جنازہ بالکل تیار تھا اور پوری اسٹریٹ لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ بے شمار میڈیا کی گاڑیاں، رپورٹرز اور کیمرہ مین اس جنازے کو لائیو کوریج دے رہے تھے کیوں کہ ٹینا بیگم کے قتل میں میر حاکم علی براہ راست ملوث تھے، جو سیاست کی دنیا کی ایک نمایاں شخصیت تھے۔

گزشتہ کافی مہینوں سے میڈیا بیرسٹر شیری کو بھی کافی کوریج دے رہا تھا، کیونکہ وہ ہمیشہ اہم اور بڑے کیسز میں ہی ہاتھ ڈالتی تھی اور یہ تو ان پر ہونے والا ڈائریکٹ قاتلانہ حملہ تھا، جس کا مجرم جائے واردات سے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔

حمزہ اور حریم لوگوں کو ایک سائیڈ پر کرتے ہوئے رومیصہ کو گھر کے گیٹ کی طرف لے جارہے تھے، کیونکہ حمزہ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے اپنی گاڑی گلی کی نکڑ پر ہی کھڑی کرچکا تھا۔ لوگوں کے پاس سے گزرتے ہوئے رومیصہ نے ایک سائیڈ پر کھڑے میر خاقان علی کی ایک جھلک نہ صرف دیکھی بلکہ پہچان بھی لی کیوں کہ ارسل کے سیل فون میں وہ ان کی بے شمار تصاویر دیکھ چکی تھی۔

رومیصہ سوجی آنکھوں اور متورم چہرے کے ساتھ لوگوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی خاقان علی کے سامنے پہنچی اور ان کا گریبان پکڑ لیا۔ اس کے ضبط کا دامن چھوٹ چکا تھا اور وہ نفرت بھری نگاہوں سے خاقان علی کی طرف دیکھ کر چیخ رہی تھی۔

”کیوں آئے ہیں آپ یہاں؟ میری ماں کی موت کا تماشا دیکھنے؟ کس نے اجازت دی ہے آپ کو یہاں کھڑے ہونے کی؟“

میڈیا کے کیمروں کا رخ رومیصہ اور خاقان کی طرف ہوا اور ان کو انہیں اگلے کئی دن کے لیے بیچنے کو چورن مل گیا۔

”میری ماں کو آپ کے باپ نے نہیں، آپ نے مارا ہے، کیونکہ مر تو وہ اسی دن گئی تھیں جس دن انہوں نے آپ سے چھپ کر نکاح کیا تھا۔“

وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے میڈیا کو ایک ساتھ کئی بریکنگ نیوز دے چکی تھی۔ حمزہ کو بڑی شدت سے اس کی بے وقوفی کا احساس ہوا۔

خاقان صاحب نے ایک بار بھی اس سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا چہرہ ضبط کی کوشش

میں لال ہو رہا تھا اور وہ راز جو ٹینا بیگم ساری زندگی دنیا سے چھپاتی رہیں کہ ان کا پہلا شوہر کون تھا، وہ ان کے مرنے کے بعد بہت بُرے طریقے سے سب کے سامنے عیاں ہوا تھا۔

میر خاقان علی کو یوں لگا جیسے بیچ چوراہے میں کسی نے ان کا لباس اتار دیا ہو۔ حمزہ اور ہادی نے بمشکل رومیصہ کو پکڑا اور زبردستی اسے اندر لے آئے۔ پورا گھر ٹینا بیگم کے ملنے والے شوبز کے لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا کیونکہ وہ اپنی زندگی میں خاصی سوشل تھیں۔

رومیصہ جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوئی، پورچ میں ٹینا بیگم کی گاڑی دیکھ کر اسے دھچکا لگا، یہ وہ گاڑی تھی جسے چلانے پر اس کا ہمیشہ ماں کے ساتھ جھگڑا رہتا تھا۔ اب وہ جھگڑنے والی اس کی ماں سفید رنگ کا کفن اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو چکی تھیں، ٹینا بیگم کو سفید رنگ سے بہت چڑ تھی اور وہ اسے بیواؤں کے لباس سے منسوب کرتی تھیں، ساری زندگی انہوں نے ہمیشہ شوخ اور فریش کلرز پہنے تھے لیکن اس وقت سفید لٹھے کے کفن میں لپٹا، موت کی زردی میں ڈوبا چہرہ اس کا دل چیر رہا تھا۔

لان میں سفید رنگ کی چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں اور بے شمار خواتین کے درمیان شہزاد سیاہ رنگ کے لباس میں صبر و تحمل کا پیکر بنی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں اگرچہ سرخ تھیں لیکن اس نے خود کو بہت کمپوز ڈ کر رکھا تھا۔ شہزاد کے عین سامنے ٹینا بیگم کا جنازہ تدفین کے لیے بالکل تیار تھا، اپنی ماں کو اس حالت میں دیکھ کر رومیصہ کا جسم بُری طرح سے کپکپانے لگا۔

”شیری!“ رومیصہ کی کرب ناک آواز پر شہزاد نے سر اٹھا کر دیکھا۔

شہزاد کے ہونٹ کانپے، لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا، وہ لوگوں کے سامنے کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی اور اس میں کامیاب بھی رہی، رومیصہ، حریم کا ہاتھ چھڑا کر شہزاد سے لپٹ گئی اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ شہزاد نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔ ان دونوں پر ایک جیسی ہی قیامت ٹوٹی تھی۔

”مام کو بتاؤ پلیز، میں آگئی ہوں، میں ان سے مل کر نہیں گئی تھی، وہ مجھ سے خفا ہوں گی۔ پلیز شیری ان سے کہو ایک بار تو آنکھیں کھول کر دیکھیں، وہ تمہاری بات ہمیشہ مان لیتی ہیں۔“ وہ بلند آواز میں روتے ہوئے بہت سے لوگوں کو رلا رہی تھی۔

”رومی، بی بریو۔“ شہزاد نے ضبط کا مظاہرہ کیا، جبکہ رومیصہ کی حالت بگڑ چکی تھی، وہ ماں کا آخری دیدار کرتے ہوئے جو بے ہوش ہوئی تو پھر اگلے کئی گھنٹوں تک اس کے اعصاب کو پرسکون رکھنے کے لیے اسے ادویات کے زیر اثر رکھا گیا۔ رومیصہ کے جذباتی پن نے کافی معاملہ خراب کر دیا تھا۔

اب میڈیا، میر حاکم علی کے کیس کو ان کی ذاتی لڑائی قرار دے رہا تھا اور یہ بات کم از کم حاکم صاحب کے حق میں جا رہی تھی، کیونکہ سارے گڑے مردے اکھاڑ دیے گئے تھے اور مونیکا کیس سے شروع ہونے والی کہانی ہادی پر آن پہنچی۔ مونیکا کے بھائی دلاور نے ان کے منع کرنے کے باوجود ہادی کا ذکر کر کے مسز عالیہ قریشی کی شخصیت کو بھی کافی متنازعہ بنا دیا تھا، ایک عجیب سی کھچڑی تیار ہو چکی تھی لیکن اس سارے معاملے کو مسز عالیہ قریشی بہت سلیقے سے ہینڈل کر رہی تھیں۔ وہ ہادی والے غم سے بھی باہر نکل آئی تھیں۔

روز میڈیا پر ایک نئی بات سامنے آتی اور اس پر گھنٹوں بے معنی بحث چلتی، لیکن سب سے خوش آئند بات یہ تھی کہ اس سارے قصے میں ایک بار بھی شہزاد اور میر خاقان نے میڈیا کو اپنا موقف نہیں دیا تھا۔

میر ہاؤس میں اس بار اصل قیامت تو شارقہ بیگم پر ٹوٹی تھی۔

وہ جو ساری زندگی ندرت بیگم کو ہی اپنی سوتن سمجھ کر کلیجہ جلاتی آئی تھیں ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میر خاقان کی ایک بیوی ٹینا سہگل اور ان کی دو بیٹیاں بھی تھیں اور ان میں سے ایک بیٹی بیرسٹر شیری تھی جس نے پورے خاندان کو لوہے کے چنے چبوانے پر مجبور کر دیا تھا۔

میر خاقان نے ٹینا بیگم کے انتقال کے بعد خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا تھا، ایک دو تیز قسم کے رپورٹرز ان کا نکاح نامہ اور شادی کی ایک تصویر بھی نکال کر لے آئے اور اس سارے قصے میں کسی کو بھی زلفی چچا کی گمشدگی کا احساس نہیں ہوا۔

میر حاکم علی کو سرفراز کے اقبالی بیان نے خاصا پریشان کر رکھا تھا اور رہی سہی کسر ٹینا بیگم اور شہزاد کی اصلیت جان کر پوری ہو گئی۔ وہ اگر حوالات میں نہ ہوتے تو اپنے بیٹے خاقان علی کو اپنے ہاتھوں سے گولی مار چکے ہوتے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ ٹینا بیگم نے ذاتی عناد کی خاطر اپنی بیٹی کو ان کے خاندان کے پیچھے لگا رکھا ہے اور وہ ابھی بھی اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں تھے۔

شارقہ بیگم کی خاقان صاحب سے بات چیت بند تھی اور طوبیٰ اور انابیہ بھی باپ سے دل ہی دل میں خفا تھیں اور اس سارے قصے میں تاجدار بیگم اور میر محتشم علی کا رویہ خاصا متوازن تھا اور وہ کھلم کھلا حاکم صاحب کے اس غلط فیصلے پر تنقید کر رہے تھے۔ محتشم علی نے تو غصے سے اپنے باپ کے پاس کچھ دن تک جیل جانا بھی چھوڑ دیا تھا کیونکہ ان کو لگتا تھا کہ انہوں نے ٹینا بیگم کے ساتھ سخت زیادتی کی ہے۔

اسی عرصے میں ایک اور بم میر فیملی پر اس وقت پھوٹا جب زلفی چچا کے بیٹے محمد ہادی نے اپنے تایا محتشم علی کے ساتھ رابطہ کر کے انہیں اپنے والد کو اپنے ساتھ لے جانے کا بتایا، وہ لوگ تو قسمت کی اس ستم ظریفی پر ششدر تھے جس نے ایک ننھی سی جان کو اس رات اس کے باپ کے لیے بچا لیا تھا۔

☆☆☆

ٹینا بیگم کی قل خوانی پر ارسل بھی پاکستان پہنچ گیا۔

وہ میر ہاؤس جانے کے بجائے سیدھا ٹینا ہاؤس پہنچا لیکن اس کی آمد کی اطلاع شاہ میر کے ذریعے وہاں بھی پہنچ چکی تھی۔

رومیصہ نے ابھی تک ٹینا بیگم کی موت کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اس لیے اس کی طبیعت ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ وہ بار بار ٹینا بیگم کی اس کے بچے کے لیے کی گئی آخری شاپنگ نکال کر بیٹھ جاتی اور چیزوں پر ہاتھ پھیر کر اپنے ماں کے لمس کو محسوس کرنے کی کوشش کرتی۔ شہزاد دانستہ اس کے سامنے اپنی ماں کے ساتھ ہونے والی آخری باتوں کو ڈسکس نہیں کر رہی تھی۔

وہ خود بھی بُری طرح ذہنی اور جسمانی طور پر تھک چکی تھی۔ اس تمام عرصے میں ایک بار بھی اسے حمزہ سے سکون سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ حمزہ نے ٹینا بیگم کی تدفین کے سارے انتظامات پوری ذمے داری کے ساتھ ادا کیے تھے۔ اس کے والد جنرل خالد صاحب بھی کئی بار اس کے گھر کا چکر لگا کر جا چکے تھے اور حریم بھی پورے تین دن شہزاد کے ساتھ رہی، جبکہ مسز عالیہ قریشی نے بھی اس موقعے پر ان دونوں بہنوں کا ایک ماں کی طرح بھرپور ساتھ دیا تھا۔

اس رات وہ رومیصہ کو سلا کر اپنے کمرے میں آئی تو حمزہ کی کال آئی۔

”تم تیار ہو جاؤ، میں تمہیں پک کرنے آ رہا ہوں۔ تھوڑا باہر نکلتے ہیں۔“ حمزہ جانتا تھا۔ اسے اس وقت ایک جذباتی سہارے کی اشد ضرورت ہے اور یہ کام اس سے بہتر کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔

وہ بالوں میں ہلکا سا برش کر کے اپنی سیاہ شال اوڑھ کر سٹنگ روم میں پہنچی تو سامنے ارسل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا، اسے دیکھ کر اس نے سیل فون پر ہاتھ رکھا اور جھجک کر گویا ہوا۔

"شیری! خاقان ماموں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"ان سے کہو، کل دوپہر میں آجائیں۔" شہرزاد کے جواب نے ارسل کو تعجب میں مبتلا کیا، وہ تو سمجھ رہا تھا کہ وہ بھی رومیصہ کی طرح بہت بُری طرح سے ری ایکٹ کرے گی لیکن شہرزاد اب چاہ کر بھی ایسا نہیں کرسکتی تھی، کیونکہ یہ وہ شخص تھا جس نے اس کی ماں کو مرنے سے پہلے آخری خوشی دی تھی۔ وہ اب حقیقتاً ان سے مل کر رومیصہ کے رویے کی تلافی کرنا چاہتی تھی۔

وہ ارسل کو بتا کر گھر سے باہر نکلی تو سامنے حمزہ کی گاڑی کھڑی تھی۔

اسے دیکھ کر حمزہ جھٹ سے گاڑی سے نیچے اترا اور اس نے دوسری طرف آکر شہرزاد کے لیے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ وہ جب اس کے ساتھ ہوتا تو اسے ایسے ہی اسپیشل پروٹوکول دیا کرتا تھا جسے شہرزاد باقاعدہ انجوائے کرتی تھی۔ وہ خاموشی سے فرنٹ سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔

حمزہ نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا، وہ بہت سوگوار نظر آرہی تھی۔ ٹینا بیگم نے اس کی آنکھوں کے سامنے جان دی تھی اور اس منظر کی اذیت اس کی آنکھوں سے صاف جھلکتی تھی۔

حمزہ کا بس چلتا تو اس کی وجود سے لپٹی اداسی کو نوچ کر اتار پھینکتا۔ وہ پچھلے تین روز سے اسے مسلسل لوگوں میں گھرے دیکھ رہا تھا اور اس نے ایک بار بھی اسے رومیصہ کی طرح ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی فیصل مسجد کی طرف جانے والی سنسان روڈ کی طرف لے کر ایک سائیڈ پر روکی، شہرزاد نے اس طرح گاڑی روکنے پر اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"شہرزاد! خود کو اور مجھے اذیت مت دو۔" وہ اس کے چہرے کو بنا پلک جھپکائے محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں تمہاری بات سمجھی نہیں حمزہ!" اس کی آنکھوں میں نمی لہرائی۔

"میرے کندھے سے لگ کر جتنا رونا چاہتی ہو، رولو، لیکن یہ خود پر چڑھایا ہوا ضبط کا خول اتار دو۔ جو آنسو بہتے نہیں ہیں، وہ اندر کہیں بہت آگ لگاتے ہیں اور میں تمہارے کرب کا بہت اچھی طرح اندازہ کرسکتا ہوں شہرزاد! میں ہمیشہ تمہارے ساتھ تھا، ہوں اور رہوں گا۔"

حمزہ کی اس بات پر بہتر گھنٹوں بعد شہرزاد کے ضبط کا پیمانہ بُری طرح چھلکا۔ اس کا دل بھر آیا، کوئی تو تھا جو بن کہے اسے سمجھتا تھا، جو جانتا تھا، وہ ضبط کے کس پل صراط پر ننگے پاؤں کھڑی ہے۔ کوئی تو اس کے بن روئے آنسوؤں کی اذیت کو سمجھتا تھا۔ وہ بے آواز رو پڑی۔ حمزہ کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا، یہ وہ لڑکی تھی جس کے ساتھ اس نے کئی سال یک طرفہ محبت میں گزار دیے تھے۔ اس کا دکھ اور تکلیف اسے ہمیشہ اپنے سینے میں اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

حمزہ اس کے ہاتھ کی پشت کو بہت نرمی اور پیار سے سہلا رہا تھا، وہ جانتا تھا وہ ان لوگوں کے سامنے کبھی نہیں روئے گی جو اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لینا چاہتے ہیں، جو اسے کمزور پڑتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ شہرزاد تھی جس نے زندگی کو ہمیشہ باوقار انداز میں جیا تھا۔ وہ بہت رونے پیٹنے اور واویلا کرنے کی قائل نہیں تھی۔

"میں نے منع کیا تھا ناں تمہیں، اس دن یوں اکیلے نکلنے سے۔ تم میری جب کوئی بات نہیں مانتی ہو، اپنا نقصان کرتی ہو اور تمہارا نقصان تم سے زیادہ مجھے اذیت دیتا ہے شہرزاد؟" حمزہ نے تین دن بعد اس سے انتہائی محبت سے گلہ کیا۔

"مام مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی تھیں، وہ اس دن اتنی خوش تھیں کہ میں انہیں منع نہیں کرپائی۔" اس کے گرم آنسو حمزہ کے دل پر گر رہے تھے۔

"وہ کوئی خاص بات کرنا چاہتی تھیں مجھ سے، ان کو میری ہی نظر لگ گئی، اتنی حسین تو مجھے وہ زندگی میں کبھی نہیں لگی تھیں جتنی وہ اپنی موت سے پہلے لگ رہی تھیں۔ اس کے باوجود میں ذرا سی بات پر ان سے خفا ہوگئی، وہ مجھے منانا چاہتی تھیں لیکن خود ہمیشہ کے لیے روٹھ گئیں۔"

شہرزاد کے دل میں پچھتاووں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ وہ ٹینا بیگم کے انتقال کے بعد پہلی بار کسی کے ساتھ ان کے آخری لمحات کی باتیں شیئر کررہی تھی، حالانکہ بہت سے لوگوں نے اس سے پوچھا تھا لیکن وہ ان کو سلیقے سے ٹال گئی تھی۔

"مجھے لگتا ہے، وہ میری وجہ سے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ کاش میں اس دن ان کے ساتھ نہ ہوتی، کاش میں تمہاری بات مان لیتی۔" آنسو تواتر کے ساتھ شہرزاد کے گالوں پر ایک لڑی کی صورت میں پھسل رہے تھے۔ حمزہ کو یکبارگی اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

"ساری زندگی وہ خوشیوں کی تلاش میں بھاگتی رہیں، اور جب خوشی ان کے دامن میں آئی تو موت ان کے تعاقب میں تھی۔" وہ اب دونوں ہاتھ منہ پر رکھے ہچکیوں میں رو رہی تھی، حمزہ نے ایک بار پھر اسے اپنے ساتھ لگا کر تسلی دی۔

"ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی شہرزاد! یاد ہے ناں، وہ ساری زندگی تمہیں اس خاندان سے دور رہنے کا مشورہ دیتی رہیں، اصل میں تو وہ اپنی ہی موت کو ٹال رہی تھیں۔ اب تو مجھے بھی یہی لگتا ہے تمہیں حاکم صاحب والا کیس لڑنا ہی نہیں چاہیے تھا، کیوں کہ اسی وجہ سے وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔" حمزہ کو بھی افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے آخری بار شہرزاد کو یہ کیس لڑنے کا مشورہ کیوں دیا۔

"ان کی خاقان صاحب کے ساتھ صلح ہوگئی تھی اور وہ یہی بات شیئر کرنے کے لیے مجھے لنچ کروانے لائی تھیں۔"

شہرزاد کی بات پر حمزہ کو دھچکا سا لگا، اور وہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اگر ان کی صلح ہوگئی تھی تو یہ سب کیوں ہوا؟" حمزہ کو حیرانی ہوئی۔

"ان کی صلح، خاقان صاحب کے ساتھ ہوئی تھی، ان کے باپ حاکم علی کے ساتھ نہیں اور یہ بات تو سرفراز بھی اپنی گرفتاری کے بعد بتا چکا ہے کہ ان کا ٹارگٹ میں تھی، مام نے تو مجھے بچاتے ہوئے اپنی جان دی۔" شہرزاد کی آنکھوں میں رقم کرب کی تحریر گہری ہوئی۔

"خاقان علی اپنے باپ کی طرح برے انسان نہیں ہیں حمزہ۔ ان کی بزدلی نے میری ماں کی زندگی کو جہنم بنایا، ان کے خودساختہ خوف ہم سب کی زندگیوں کے نقشے میں اذیتوں کے رنگ بھر گئے۔ میر ہاؤس میں ہونے والے سب غلط فیصلوں کے پیچھے ایک ہی شخص کا ہاتھ ہے اور وہ ہے حاکم علی، جس کو اللہ اس کے انجام تک ضرور پہنچائے گا۔" وہ بازو کی پشت سے اب اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔

حمزہ نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں، وہ جانتا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی، کیوں کہ ٹینا بیگم کے جنازے پر جب رومیصہ نے اپنے باپ کا گریبان پکڑا تھا تو ان کے چہرے پر موجود دکھ، شرمندگی اور صدمے کی کیفیت غیر حقیقی نہیں تھی۔

جس وقت میڈیا چیخ چیخ کر ان کے والد کو موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا، وہ اس وقت اسی عورت کے جنازے میں شریک تھے، جس کی زندگی بچانے کے لیے انہوں نے ساری عمر اپنے باپ سے اس تعلق کو چھپائے رکھا، اب وہی عورت جب زندہ نہیں رہی تھی تو خاقان صاحب کو بھی باقی دنیا کی پروا نہیں رہی تھی۔

اس لیے وہ ان کے جنازے میں پہنچ گئے۔ ان کی آمد پر میڈیا نے رنگ برنگی باتیں نشر کیں، چٹ پٹی

تھا، وہ ڈکٹیٹر شپ کے قائل نہیں تھے اور جیو اور جینے دو کی پالیسی پر کار فرما تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو محض ایک تلقین کی تھی کہ انسان زندگی میں جو بھی دوسروں کو دیتا ہے، وہ پلٹ کر اس کے پاس ضرور آتا ہے، چاہے وہ کسی کے ساتھ کی گئی ذرا برابر نیکی ہو یا بدی۔

میر ہاؤس میں اب چند گنے چنے لوگ ہی رہ رہے تھے۔ تاجدار بیگم کو درشہوار کی شادی کی پریشانی تھی کیونکہ درشہوار اپنے ہر پروپوزل پر صاف منع کر دیتی اور سختی کرنے پر ایسا رونا پیٹنا مچاتی تھی کہ تاجدار بیگم کو اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا اور پھر طوبیٰ کے ذریعے اسے ہادی کا پتا چلا تو وہ خاموش ہو گئیں۔

ذوالکفل کی جسمانی حالت کافی سنبھل چکی تھی، لیکن ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ انہیں ذہنی طور پر سنبھلنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔ عبداللہ قریشی اور عالیہ بیگم نے اس سلسلے میں ہادی کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور درشہوار بھی اکثر فون کر کے ان کی طبیعت کا پوچھتی رہتی تھی۔ محتشم علی اور خاقان صاحب بھی اس بات پر مطمئن تھے کہ وہ اپنے بیٹے کے پاس یہاں سے کافی بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ ہادی آفس سے آنے کے بعد اپنے باپ کو وقت دیتا اور ان کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا۔ ایک دن وہ ان کے کمرے سے باہر نکلا تو عالیہ قریشی نے سنجیدگی سے کہا۔

”میرے خیال میں بیٹا! تم درشہوار سے شادی کر لو۔“

عالیہ بیگم کے اس مشورے پر وہ چونکا اور محبت سے ان کے کندھے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کے گویا ہوا۔

”آپ کے حواسوں پر ابھی تک وہ لڑکی سوار ہے۔“

”اس لڑکی کے حواسوں پر بھی تم ابھی تک سوار ہو اور میرے خیال میں یہ فیصلہ تمہارے ساتھ تمہارے باپ کے حق میں بھی بہت بہتر ہوگا۔“ مسز عالیہ قریشی نے محبت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، جس نے ان کا بیٹا ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔

”آپ یہ بات کیسے کہہ سکتی ہیں؟“

”تمہارے باپ کے ساتھ درشہوار کا خونی رشتہ ہے اور میرے خیال میں جتنی محبت اور توجہ وہ اپنے سگے چچا کو دے سکتی ہے، کسی اور لڑکی سے تم اس کی توقع نہیں رکھ سکتے، تمہیں اس معاملے میں حقیقت پسند ہونا ہوگا۔“

مسز عالیہ قریشی کی بات میں دم تھا اور ویسے بھی درشہوار کافی عرصے سے اس کے دل میں اپنی کافی جگہ بنا چکی تھی۔ وہ ہر تیسرے دن چچا کی خیریت پوچھنے کے لیے اسے فون کرتی اور یونہی چھوٹی چھوٹی باتیں کیے جاتی۔ ہادی کو بھی اس کی عادت ہو گئی تھی اور وہ جانتا تھا۔ عادت محبت سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے اور اسے یقین تھا وہ لڑکی کسی دن اسے چاروں شانے چت کر کے اس کے دل پر بھی حکمرانی کرنے لگے گی کیونکہ اس نے خود کو ہادی کے لیے بدلا تھا، جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتی تھی اور ویسی ہی محبت کرتی تھی جیسی اس کے باپ نے کسی زمانے میں اس کی ماں سے کی تھی۔

”اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ لڑکی مجھے تمہارے حوالے سے پسند ہے۔“

مسز قریشی کی اس بات کے بعد ہادی کے سامنے بحث کے لیے کوئی جواز نہیں بچا تھا، وہ ان کی بات پر ہلکا سا مسکرایا اور سر جھکا دیا۔ درشہوار کی محبت کا قرض اب سود سمیت لٹانے کی باری ہادی کی تھی اور اس معاملے میں وہ اب اس لڑکی کو مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

ٹینا ہاؤس کے دو مکین پچھلے چھ ماہ سے ایک ساتھ ایک چھت تلے تھے۔

شہزاد اور اس کا باپ میر خاقان علی!

ٹینا بیگم کی موت نے بہت سے رشتوں کو آپس میں جوڑ دیا تھا جن میں سے ایک خاقان کا اپنی بیٹیوں کے کہانیاں بنائیں، لیکن ان کے ہونٹوں پر ایک جامد خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی اور وہ مرنے والی پر کوئی کمنٹ دے کر لوگوں کو ایک اور فضول بحث کے لیے ٹاپک دینا نہیں چاہتے تھے۔

اگلی دوپہر خاقان علی ان کے گھر افسوس کے لیے آئے تو ان کے ساتھ میر محتشم اور تاجدار بیگم کی آمد، ان دونوں بہنوں کے لیے بہت حیران کن تھی۔ وہ لوگ اپنے والد کی اس گھٹیا حرکت پر بہت شرمندہ تھے، وہ اس نقصان کا ازالہ تو نہیں کر سکتے تھے جو رومیصہ اور شہزاد کی قسمت میں لکھ دیا گیا تھا لیکن وہ ان سے معذرت اور افسوس کا اظہار کر کے اپنے اندر کی ندامت کو تو کم کر سکتے تھے۔

شہزاد نے حمزہ کی ہدایت کے مطابق رومیصہ کو اپنی ماں سے ملاقات کی آخری باتیں تفصیل سے بتا دی تھیں۔ جسے وہ منہ کھولے ششدر سی کیفیت کے ساتھ سن رہی تھی اور چونکہ اس وقت ارسل بھی وہیں موجود تھا اس لیے ان دونوں کو رومیصہ کو ہینڈل کرنے میں زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

”میں تو ساری زندگی ماما کو نہیں سمجھ سکی، جس شخص کو ساری زندگی انہوں نے گالیاں دیں، اس نے آخری ملاقات میں ایسا کیا طلسم پھونک دیا تھا کہ وہ اتنے سالوں کی نفرت کو ایک منٹ میں بھلا بیٹھیں۔“ رومیصہ اپنے مخصوص منہ پھٹ انداز میں بولی تو شہزاد چاہ کر بھی اسے نہیں بتا سکی کہ وہ نفرت نہیں تھی خود پر ڈالا گیا ایک خوساختہ جبر کا پردہ تھا۔ اسی لیے وہ کبھی ہارون رضا تو کبھی سیفی حسن کے پیچھے چھپنا چاہتی تھیں۔ وہ خود کو نہیں خاقان علی کو اذیت دینا چاہتی تھیں اور جب اسی شخص نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لی تو انہیں لگا کہ پوری کائنات ان کی مٹھی میں آ گئی ہے۔

☆☆☆

چھ ماہ کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔

ان چھ مہینوں میں کئی بڑے بڑے واقعات ہوئے جن میں سرفہرست حاکم علی کی ٹینا بیگم کیس میں عمر قید اور مونیکا کیس میں ان کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی جس پر انہوں نے اپیل دائر کر رکھی تھی۔ مونیکا کا بھائی دلاور واپس امریکا جا چکا تھا کیونکہ وہ جس انصاف کی تلاش میں یہاں آیا تھا، وہ اب صرف دو قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ جس شخص کو اپنے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ان کی اولاد نے تنہائی کا عذاب بھگتنے کے لیے بالکل اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ ان کی ذہنی حالت دن بہ دن ابتر ہوتی جا رہی تھی اور ماضی میں کیے جانے والے گناہ کسی عفریت کی مانند ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے وہ بلند آواز میں رونے لگتے، اپنے بال نوچتے اور خود کو کوستے لیکن ظالم وقت ان کے ہاتھوں سے پھسل چکا تھا۔ اب مکافات عمل تھا۔

محتشم علی تو کبھی کبھار ان سے ملنے چلے جاتے لیکن خاقان علی تو ایک بار بھی نہیں گئے تھے۔ ارسل اور رومیصہ اپنی ایک کیوٹ سی بچی کے ساتھ برطانیہ میں سیٹ ہو گئے تھے اور ندرت بیگم اور ارسل نے وہیں پر ایک مناسب رشتہ دیکھ کر نمیرہ کی بھی شادی کر دی تھی۔ اس شادی میں شرکت کرنے کے لیے محتشم علی اور خاقان صاحب خصوصی طور پر پاکستان سے وہاں گئے تھے۔ ندرت بیگم ارسل اور رومیصہ کے ساتھ ہی رہ رہی تھیں اور فون پر سب کے ساتھ رابطہ رکھتی تھیں۔

اسی دوران سعد کی منال کے ساتھ انگیج منٹ ہو گئی اور وہ دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ فون پر باتیں کر کے حیران ہوتے تھے کہ وہ اتنے عرصے سے ایک دوسرے سے الگ کیسے رہ رہے تھے۔ شاہ میر، طوبیٰ کو رخصت کروا کے کوئٹہ لے گیا تھا اور انابیہ کی گود میں اللہ نے ایک بیٹے کی صورت میں اپنی نعمت ڈال دی تھی، وہ برہان کے ساتھ کافی بہتر زندگی گزار رہی تھی۔

میر ہاؤس میں اب محتشم علی کی حکمرانی تھی لیکن انہوں نے اپنے والد صاحب کی غلطیوں سے بہت سبق سیکھا

ساتھ تعلق تھا، جس پر بہت سالوں کی بدگمانی کی گرد پڑی ہوئی تھی، اور اس گرد کو صاف کرنے کے بعد اندر سے بہت شفاف اور اجلے منظر نکلے تھے۔

حمزہ ایک سال کا کورس کرنے ملک سے باہر چلا گیا اور اس کی واپسی پر دونوں کی شادی کی تاریخ طے ہونا تھی اور شہرزاد یہ تمام عرصہ اپنے باپ کی خواہش پر ان کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی جو میر ہاؤس کو مستقل بنیادوں پر چھوڑ کر اس کے پاس ٹینا ہاؤس میں شفٹ ہو گئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس وقت ان دونوں کو ہی ایک دوسرے کی ضرورت تھی اور اس فیصلے نے رومیصہ کو بھی ان کے قریب کر دیا تھا اور وہ اس بات پر مطمئن تھی کہ شہرزاد اب اکیلی نہیں۔

خاقان علی نے ٹینا بیگم کے نام پر کئی رفاہی اداروں کی بنیاد رکھی تھی اور انہیں بہت کامیابی سے چلا رہے تھے۔ ان دونوں باپ بیٹی کی آپس میں زیادہ بے تکلفی نہیں تھی لیکن ٹینا بیگم ان دونوں کے درمیان ایک ایسا مشترکہ ٹاپک تھی جس پر وہ دونوں کئی گھنٹے بول سکتے تھے اور خاقان علی کو یقین تھا کہ فاصلے کی یہ آخری دیوار بھی کسی نہ کسی دن گر ہی جائے گی۔

شہرزاد کو آج بھی اس بات کا افسوس تھا کہ کاش وہ اس دن اپنی ماں کے ساتھ خفا نہ ہوتی اور ان کی خوشی کو دل سے قبول کر لیتی، کیونکہ اس عورت نے ساری زندگی اپنی دونوں بیٹیوں کو ظالم اور بے رحم دنیا سے دور رکھنے کی کوشش میں گزار دی۔ وہ کبھی ہارون رضا اور کبھی سیف الرحمٰن کے سہارے ڈھونڈتی رہیں لیکن ان کی زندگی میں وہ سکون ناپید تھا جس کی کمی انہیں ساری عمر شدت سے محسوس ہوتی رہی۔

شہرزاد کو اپنے باپ کے ساتھ رہتے ہوئے بہت دفعہ یہ احساس ہوا کہ اس کی اور خاقان صاحب کی کئی عادتیں بہت ملتی تھیں، وہ دونوں ہی کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والے بہت کمپوزڈ انسان تھے۔ لیکن وہ اپنے باپ کے برعکس نڈر تھی اور اس کے اندر فیصلہ کر کے اس پر ڈٹ جانے کی جو قوت تھی، وہ بہت سے لوگوں کو اس سے متاثر ہونے پر مجبور کر دیتی۔ شہرزاد کو اب احساس ہوا تھا کہ ٹینا بیگم اسے دیکھ کر بعض دفعہ چونک کیوں جاتی تھیں۔ وہ یہ ساری باتیں حمزہ کے ساتھ کبھی فون پر اور کبھی ای میلو پر شیئر کرتی۔ اس نے زندگی میں لکھ کر اتنی باتیں کبھی نہیں کی تھیں جو حمزہ کے اس کورس کے دوران کر لی تھیں۔

حمزہ کو اس کی ای میلو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے اب کافی مطمئن تھی اور شاید یہی وہ زندگی تھی جس کا وعدہ خاقان صاحب نے آخری ملاقات میں ٹینا بیگم سے کیا تھا، جس نے ان کے لہجے کو سچی خوشی کی کھنک بخشی تھی لیکن اجل نے ان کو زیادہ مہلت نہیں دی۔

حمزہ بھی روزانہ رات سونے سے پہلے اسے ایک ای میل ضرور کرتا، اس وقتی جدائی نے ان دونوں کے درمیان موجود چاہت کو مزید گہرا کر دیا تھا، وہ واقعی اس کا "ہم زاد" تھا، ہر بُرے بھلے وقت میں اس کے ساتھ کھڑا ہونے والا۔ شہرزاد کو وہ کبھی کبھی اپنی کوئی انجانے میں کی گئی نیکی کا صلہ لگتا تھا۔

اس نے پہاڑوں پر بیٹھ کر لکھی ہوئی ایک ای میل میں شہرزاد سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ساری زندگی اپنے مشن پر کاربند رہے گی اور کمزور اور بے سہارا لوگوں کے انصاف کی جنگ لڑتی رہے گی اور اس مشن میں وہ اس کے شانہ بہ شانہ ہوگا۔ شہرزاد نے اس دن ای میل میں اسے یہ چند لائنیں لکھی تھیں۔

میں شہرزاد کا دوسرا جنم ہوں۔
اور اب نئے دیس میں نئے شاہ کے محل کے اندر زندہ ہوں۔
نئی کہانی شروع ہو چکی ہے۔
دیکھو، کب تک چلتی ہے۔

وہ جو عشق پیشہ تھے
دل فروش تھے، مر گئے
وہ ہوا کے ساتھ چلے تھے
اور ہوا کے ساتھ بکھر گئے

وہ عجیب لوگ تھے
برگِ سبز کو برگِ زرد کا
روپ دھارتے دیکھ کر
رُخِ زرد اشکوں سے ڈھانپ کر
بھرے گلشنوں سے مثالِ سایۂ ابر،
پل میں گزر گئے

وہ قلندرانہ وقار تن پہ لپیٹ کر
گھنے جنگلوں میں گھری ہوئی
کھلی وادیوں کی بسیط دُھند میں
رفتہ رفتہ اُتر گئے

احمد ندیم قاسمی

انتظارِ صبا رہا برسوں
اک دریچہ کھُلا رہا برسوں

ایک دن اُن کا پیار برسا تھا
اور میں بھیگتا رہا برسوں

اُن کی آنکھوں کے جام یاد رہے
جن پہ بھی نشہ رہا برسوں

تب کہیں جا کر اک غزل لکھی
میں اُسے سوچتا رہا برسوں

فاصلے کم نہ ہو سکے قیصرؔ
آمنا سامنا رہا برسوں

قیصر الجعفری

آپ کا انتظار کون کرے
روز کا انتظار کون کرے

ذکر مہر و وفا تو ہم کرتے
پر تمہیں شرم سار کون کرے

ہو جو اس چشم مست سے بے خود
پھر اسے ہوشیار کون کرے

تم تو ہو جان اک زمانے کی
جان تم پر نثار کون کرے

آفتِ روزگار جب تم ہو
شکوۂ روزگار کون کرے

وعدہ کرتے نہیں یہ کہتے ہیں
تجھ کو امیدوار کون کرے

داغ کی شکل دیکھ کر بولے
ایسی صورت کو پیار کون کرے

داغ دہلوی

اتنا سناٹا ہے بستی میں کہ ڈر جائے گا
چاند نکلا بھی تو چپ چاپ گزر جائے گا

کیا خبر تھی کہ ہوا تیز چلے گی اتنی
سارا صحرا میرے چہرے پہ بکھر جائے گا

ہم کسی موڑ پہ رک جائیں گے چلتے چلتے
راستہ ٹوٹے ہوئے پل پہ ٹھہر جائے گا

بادبانوں نے جو احسان جتایا اس پر
بیچ دریا میں وہ کشتی سے اُتر جائے گا

چلتے رہیے کہ صف ہم سفراں لمبی ہے
جس کو رستے میں ٹھہرنا ہے ٹھہر جائے گا

در و دیوار پہ صدیوں کی کہُر چھائی ہے
گھر میں سورج بھی جو آیا تو ٹھٹھر جائے گا

فن وہ جگنو ہے جو اُڑتا ہے ہواؤں میں قیصرؔ
بند کر لو گے جو مٹھی میں تو مر جائے گا

انتخاب قیصر

آئیے مسکرائیں

تلاش

زاہدہ نے اپنی سہیلی خالدہ سے کہا۔ ”تم اپنے آفس کے ساتھی خرم سے شادی کیوں نہیں کرلیتیں......؟ اچھا لڑکا ہے اور تم سے شادی کا خواہش مند بھی ہے۔“

”میں کسی ایسے شخص سے شادی کروں گی جو زندگی کی اونچ نیچ کو سمجھتا ہو اور جس میں برداشت کرنے کا حوصلہ۔“ خالدہ نے اپنا نکتہ نظر پیش کیا۔

”اچھا......اچھا...... میں سمجھ گئی۔“ زاہدہ نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ”تمہیں کسی رنڈوے کی تلاش ہے۔“

مریم خان

جواب

ایک کاریگر شہر کے چوراہے میں لگے ہوئے گھڑیال کی مرمت کر رہا تھا۔ جب ٹھیک کر چکا تو پسینے میں شرابور سیڑھی سے نیچے اترا۔ ایک صاحب بڑی دیر سے اسے گھڑیال ٹھیک کرتے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ ”کیوں بھائی! کیا گھڑیال خراب ہو گیا تھا۔“ کاریگر جھنجلا کر بولا۔ ”جی نہیں! میری آنکھیں کمزور ہیں، وقت دیکھنے کے لیے اوپر چڑھا تھا۔“

(ثروت یعقوب......لاہور)

جرأت

”تمہاری یہ جرأت کہ تم میرے ڈیڈی کو فضول اور بے ہودہ انسان کہہ رہے ہو۔“ لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ پر برہم ہوتے ہوئے کہا۔

”تو کیا کہوں؟“ بوائے فرینڈ نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”میں ان سے تمہارا رشتہ مانگنے گیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس پر وہ بولے ”کوئی بات نہیں......تدفین کے اخراجات میں برداشت کرلوں گا۔“

(فرزانہ علی......ٹنڈو محمد خان)

آئی سی یو

شادی دفتر میں اپنی ڈیمانڈ بتاتے ہوئے لڑکے والوں نے کہا۔ ”ہمیں ایسی لڑکی چاہیے، جو نہ زیادہ کھاتی ہو اور ہمیشہ چپ رہے۔“

”ایسی لڑکی آپ کو صرف آئی سی یو میں ملے گی۔“ شادی دفتر کے نگران نے کہا۔

(ثمینہ بٹ......آزاد کشمیر)

تحقیقات

ایک بحری جہاز میں اتفاق سے سارے مسافر ”سکھ“ تھے۔ نہ جانے کیا ہوا کہ تمام مسافر ڈوب کر مر گئے لیکن جہاز صحیح سلامت کھڑا رہا۔ جس ملک کی سمندری حدود میں یہ حادثہ رونما ہوا، وہاں کی انتظامیہ نے تحقیقات کا حکم دیا۔ تحقیقاتی ٹیم جائے وقوعہ پر پہنچی تو پتا چلا کہ جہاز کسی خرابی کے باعث سمندر میں رک گیا تھا۔ تمام مسافروں نے تدبیر سوچی اور اسے دھکا دینے کے لیے نیچے اتر گئے۔

فرق

بس میں سفر کرتے ہوئے مسافروں سے

کنڈیکٹر نے پوچھا۔ ”فرسٹ کلاس بیس روپے، سیکنڈ کلاس پندرہ روپے، تھرڈ کلاس پانچ روپے، کہیے کون سا ٹکٹ دے دوں؟“

مسافر نے کہا۔ ”بس ایک ہی ہے، ایک جیسی سیٹیں ہیں۔ مجھے تو تھرڈ کلاس کا ہی ٹکٹ دے دو، کوئی فرق تو ہے نہیں۔“ کنڈیکٹر نے اسے ٹکٹ دے دیا۔

تھوڑی دور جا کر بس خراب ہو گئی تو کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔ ”فرسٹ کلاس مسافروں سے گزارش ہے کہ وہ بیٹھے رہیں۔ سیکنڈ کلاس والے نیچے اتر کر ساتھ ساتھ چلیں اور تھرڈ کلاس والے بس کو دھکا لگائیں۔“

شکوہ

بیوی نے شوہر سے شکوہ کیا۔ ”آپ نے بتایا نہیں تھا کہ آپ شادی سے پہلے سگریٹ پیتے تھے۔“ شوہر نے فریاد کی۔ ”تم نے کون سا بتا دیا تھا کہ تم خون پیتی ہو۔“

منشور

ایک سیاسی لیڈر جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے پارٹی کا منشور پیش کر رہے تھے جذباتی تقریر کرتے ہوئے اچانک انہوں نے اپنا اخلاق اور اعلیٰ کردار بیان کرنا شروع کر دیا کہ

”آپ لوگ میری شرافت کا اندازہ اس بات سے لگا لیں کہ اس شہر میں منشیات کے کم از کم دو ہزار اڈے ہیں مگر میں نے ان میں سے ایک میں بھی قدم نہیں رکھا۔“

”وہ ایک اڈا آج ہی کھلا ہوگا۔“ مجمع میں سے آواز آئی۔

اردو ادب……

اردو کے پروفیسر گھر آئے تو بیوی سے پوچھا ”بیگم آج کیا پکایا ہے؟“ مہنگائی کے ہاتھوں پریشان عورت نے جواب دیا ”خاک پکائی ہے۔“ پروفیسر صاحب بولے ”خاک کو الٹ کریں تو کاخ بنتا ہے فارسی میں محل کو کاخ کہتے ہیں محل کو الٹا کریں تو لحم بنتا ہے لحم کو اردو میں گوشت کہتے ہیں تو اچھا بیگم آج گوشت پکایا ہے۔“

جواب میں بیگم نے کہا…… ”اگر گوشت کو الٹا کریں تو تشوگ بنتا ہے اور تشوگ سنسکرت میں سونے کو کہتے ہیں یہ کہہ کر بیگم اٹھی ہی تھیں کہ شوہر اگلی بات سمجھ گئے پھر جو ہوا وہ اردو ادب کی ایک الگ تاریخ ہے۔

غلطی

ایک صاحب گھڑی ساز کے پاس پہنچے اور اسے اپنی گھڑی ٹھیک کرنے کے لیے دیتے ہوئے بولے۔

”یہ گھڑی میری غلطی سے نیچے گر گئی تھی اسے ٹھیک کر دیجیے۔“ گھڑی ساز نے گھڑی کا بغور معائنہ کیا اور بولا۔

”اس گھڑی کو گرانے میں آپ نے کوئی غلطی نہیں کی تھی غلطی تو آپ نے اسے اٹھا کر کی ہے۔“

فاکہہ سہیل

جواب

بیوی اچانک میکے سے گھر پہنچی اور پہنچتے ہی چھری تیز کرنے لگی۔ شوہر نے گھبرا کر پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

بیوی نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”تمہارے پلنگ کے نیچے جو سینڈل دکھائی دے رہے ہیں اگر ان میں چھپے جاگتے پاؤں نہیں ہیں تو میں ناشتے کے لیے ڈبل روٹی کاٹوں گی۔“

اقصیٰ اکبر

* * *

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

فائزہ بھٹی ——— پتوکی

یہ کس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا محسن
کہ ساری کائنات دسترس میں لگتی ہے

سحر تبسم سموی ——— فضل پورہ

فراز وہ آنکھیں جھیل سی گہری تو ہیں
پر ان میں میرے نام کا کوئی عکس نہیں

اقصیٰ ناصر ——— کراچی

آنکھیں کھولیں تو جاگ اٹھیں حسرتیں تمام
اس کو بھی کھو دیا جس کو پایا تھا خواب میں

لائبہ، ایمن ——— مظفر آباد

انگلیاں ڈوبی ہیں میری اپنے ہی لہو میں
یہ کانچ کے ٹکڑے اٹھانے کی سزا ہے

نمرہ عاقب ——— گرین سٹی

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہو گئے
بادل کو کیا خبر کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے

عابدہ نثار ——— کراچی

یہ دن یہ رات یہ لمحے اچھے لگتے ہیں
تمہیں سوچوں تو سارے سلسلے اچھے لگتے ہیں
سفر دور تک کرنا پھر وہیں رہنا
مجھے تم سے تم تک فاصلے اچھے لگتے ہیں

اقراء عاشہ ——— کراچی

روح کی تھاپ نہ روکو کہ قیامت ہو گی
تم کو معلوم نہیں کون کہاں رقص میں ہے

فاخرہ بتول ——— موڑہ دھمیال

تو اب تو دشمنی کے قابل بھی نہیں رہا
اٹھتی تھی جو کبھی وہ عداوت تمام شد

علشبہ رزاق ——— کراچی

بات بے بات ٹوٹ جاتا ہے
دل بھی کچا مکان ہے شاید

حمنہ بیگ ——— کراچی

تمام عمر کی نامعتبر رفاقت سے
کہیں بھلا ہو کہ پل بھر ملیں یقیں سے ملیں

صدف عمران ——— کے ڈی، اے

ہم نہ ہوں گے تو بھلا کون منائے گا تمہیں
یہ بری بات ہے ہر بات پہ روٹھا نہ کرو

فاکہہ سہیل ——— سندھی مسلم سوسائٹی

بھول جانا بھی اسے یاد بھی کرتے رہنا
اچھا لگتا ہے اسی دھن میں بکھرتے رہنا

حمدہ خان ——— گلستان جوہر

گاؤں جیسا مزاج ہے میرا
مجھ میں شہروں سی خود پسندی ہے

ریحانہ چوہدری ——— مدوکے

تمہارے نام کے نیچے کھنچی ہوئی ہے لکیر
کتاب زیست ہے سادہ اس اندراج کے بعد

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

میں فنا بقا کے سفر میں ہوں
مجھے آگہی کی تلاش ہے

شازیہ ہاشم میولی ——— کھڈیاں خاص قصور

عجب واعظ کی دین داری ہے یا رب
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
کوئی اب تک نہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے

آمنہ سلیم ——— صادق آباد

اس کو جدا ہوئے بھی زمانہ بہت ہوا
اب کیا کہیں یہ قصہ پرانا بہت ہوا

مسرت ——— شادمان ٹاؤن

محبت اپنی بھی اثر رکھتی ہے فراز
بہت یاد آئیں گے ذرا بھول کر تو دیکھو

شگفتہ جاہ

یادوں کے دریچے سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عورت سے شادی چار خوبیوں کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ جمال کی وجہ سے، مال کی وجہ سے، خاندان کی وجہ سے اور دین کی وجہ سے۔ تو تم دین دار عورت سے شادی کرو۔"

(صحیح بخاری)

بہترین احسان،

مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"احسان کرنا تو ہر جگہ بہتر ہے لیکن اگر ہمسائے کے ساتھ کیا جائے تو بہترین ہے۔"

ہر وہ عمل عبادت ہے جو،

ہر وہ عمل جو موافق شریعت ہے، ذکر و عبادت میں شامل ہے اگرچہ خرید و فروخت ہو۔"

بھائی کی بے عزتی،

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"گناہ کرنے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا اپنے کسی بھائی کو بے عزت اور حقیر سمجھنے سے ہوتا ہے۔"

جب رب چاہتا ہے،

ابن جوزی نے فرمایا۔

"جب حق تعالیٰ کسی بندے کی بھلائی چاہتا ہے تو حسن عمل کا دروازہ اس پر کھول دیتا ہے۔"

عقل مند وہ ہے،

حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔

"عقل مند وہ ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہو تو اول روز وہی کرے جو کہ تیسرے روز کرے گا۔"

ماریہ نذیر۔ بھاگٹانوالہ

اللہ کی تدبیر،

بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کو مارنا چاہا مگر ناکام رہے۔ باپ کی نگاہوں سے دور کیا مگر محبت اور بڑھتی گئی۔ غلام بنا کر فروخت کر دیا مگر بادشاہ بن گئے۔ اس لیے لوگوں کی سازشوں اور خفیہ تدبیروں سے تم پریشان نہ ہو۔ اللہ کی تدبیر اور چاہت سب پہ بھاری ہے۔"

اقرا ممتاز۔ سرگودھا

حرمت، تکلیف اور قربانی،

قائد اعظمؒ نے فرمایا۔

"کوئی شاندار کارنامہ سر انجام دینے کے لیے اور ملک کی قومی زندگی میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لیے خدمت، تکلیف اور قربانی بنیادی تقاضے ہیں۔"

مال اور نفس ناپاک،

ابوالاعلیٰ مودودی نے فرمایا۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی دولت میں سے اللہ تعالیٰ کے بندوں کا حق نہیں نکالتا اس کا مال ناپاک اور مال کے ساتھ اس کا نفس بھی ناپاک ہے۔"

ثمرہ اقرا۔ کراچی

دستک تو دو،

عربی کا ایک مشہور مقولہ ہے جو دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور دروازے کو چھوڑتا نہیں ہے تو ایک نہ ایک دن دروازہ کھل ہی جاتا ہے اور وہ شخص اندر داخل ہو جاتا ہے۔

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

اخلاص،

خلیفہ عبدالملک کے بیٹے شہزادہ مسلمہ بن عبدالملک نے جہاد کے دوران دشمنوں کے ایک قلعے کا محاصرہ کیا۔ مسلمانوں کو قلعے کی دیوار میں ایک سوراخ نظر آیا جس سے صرف ایک آدمی داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن اس سے اندر داخل ہونے والے کے لیے شدید خطرہ تھا کہ انہیں اندر کے حالات کی خبر نہ تھی۔ اندر سوراخ کے پاس بہت سے لوگ بھی ہو سکتے تھے۔ یہ سیدھی سیدھی موت کے منہ میں جانے والی بات تھی۔

تب ہی ایک مجاہد سامنے آیا اور اس نے کہا۔

"میں جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اندر گیا اور صورت حال کو اس طرح سے سنبھالا کہ اور بھی بہت سے لوگ اندر داخل ہو گئے اور انہوں نے قلعہ فتح کر لیا۔

فتح کے بعد مسلمہ بن عبدالملک نے اعلان کیا۔

"سب سے پہلے اندر جانے والا شخص میرے سامنے آئے۔"

جب اس نے کئی بار اعلان کیا تو ایک شخص سامنے آیا اور اس نے کہا کہ وہ سپہ سالار سے ملنا چاہتا ہے۔ وہ صاحب نقب کے بارے میں جانتا ہے۔

مسلمہ نے فوراً اجازت دے دی۔ اس شخص نے کہا۔

"صاحب نقب کی اپنے بارے میں بتانے کے لیے تین شرطیں ہیں۔"

جب سپہ سالار نے شرطیں ماننے کی ہامی بھر لی تو اس نے کہا۔

"پہلی شرط یہ ہے کہ خلیفہ کو اس کا نام نہ لکھ کر بھیجا جائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اسے کسی انعام کی پیشکش نہ کی جائے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس سے اس کا اور اس کے قبیلے کا نام نہ پوچھا جائے۔"

جب مسلمہ نے تینوں شرائط منظور کر لیں تو اس نے کہا۔

"میں ہی وہ شخص ہوں۔"

اس واقعے کے بعد مسلمہ جب بھی نماز پڑھتے تو دعا کرتے۔

"یاالٰہی! مجھے آخرت میں صاحب نقب کا ساتھ نصیب فرما۔"

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

مردہ ہے،

حضرت حفص حداد کا مشہور قول ہے۔

"جو شخص ہر وقت اپنے اعمال اور حالات کا اندازہ قرآن و حدیث کی روشنی میں نہیں کرتا اور اپنے دل کے جذبات کو ملزم نہیں ٹھہراتا، اس کا نام مردوں کی فہرست میں ہے۔"

حضرت ابوحفصؒ کی توبہ،

حضرت ابوحفصؒ بڑے ولی گزرے ہیں۔ ان کی ابتدائے توبہ کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔ عالم شباب میں ایک لونڈی پر آپؒ فریفتہ ہو گئے۔ ہرچند ملنے کے لیے تدبیریں کیں مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

لوگوں نے بتایا کہ نیشاپور میں ایک یہودی رہتا ہے جو سحر و عمل کے ذریعے اس کام کو آسان کر سکتا ہے۔ ابوحفص اس کے پاس گئے اور اپنا حال بیان کیا۔

یہودی نے کہا۔ "اے حفص! تمہیں چالیس دن نماز چھوڑنا ہو گی اور اس اثنا میں نہ تو زبان دل پر اللہ کا نام لانا ہو گا اور نہ نیکی کا کوئی کام۔ اگر اس پر راضی ہو تو میں جنتر منتر پڑھتا ہوں تاکہ تمہاری مراد بر آئے۔"

حضرت حفص نے یہودی کی یہ بات مان لی اور چالیس دن اس طرح گزار لیے۔

یہودی نے اپنا سحر و عمل کیا مگر ان کی مراد بر نہ آئی۔ یہودی کہنے لگا۔

"غالباً تم نے شرط پوری نہیں کی۔ ضرور تم سے کوئی خلاف ورزی ہوئی ہے اور نیکی کا کوئی کام کیا ہے۔ ذرا سوچ کر بتاؤ۔"

ابوحفص نے کہا۔ "میں نے نہ کوئی نیکی کی اور نہ ظاہر اور باطن میں کوئی عمل خیر کیا۔ البتہ ایک دن میں نے راستے میں پتھر پڑا دیکھا۔ اس خیال سے اسے پاؤں سے ہٹا دیا کہ کسی کو ٹھوکر نہ لگ جائے۔"

اس پر یہودی کہنے لگا۔ "افسوس ہے تم پر کہ تم نے چالیس دن تک اللہ کے احکام کی نافرمانی کی اور اسے فراموش کیے رکھا لیکن اللہ نے تمہارے اس عمل کو بھی ضائع نہیں جانے دیا۔"

یہ سن کر ابوحفصؒ نے صدق دل سے توبہ کی اور وہ یہودی بھی اسی وقت مسلمان ہو گیا۔

(کشف المحجوب)

گوہر نایاب،

- دنیا کے مال پر مغرور نہ ہو۔ کیا خبر کہ اسی رات تیری جان تجھ سے طلب کر لی جائے۔

(حضرت عیسیٰؑ)

- اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری دعا قبول ہو تو حرام کے ایک لقمے سے بھی پرہیز کرو۔

(حضرت امام غزالیؒ)

- دل ایک آئینہ ہے۔ اگر وہ برائی سے پاک ہے تو اس میں خدا بھی نظر آتا ہے۔

(مولانا رومی)

عظیم مفکرین کے اقوال،

- میں تصنع اور بناوٹ کے ساتھ الفاظ کا جادو جگانے سے قاصر ہوں لیکن اپنی خوش گفتاری سے لوگوں کے دل موہ لیتا ہوں۔

(شیکسپیئر)

- مصیبتیں اور دکھ ہمیں اپنی کم ہمتی کے باعث زیادہ خوف ناک نظر آتے ہیں۔

(ارسطو)

- انسان کی قدر و قیمت اس چیز سے نہیں جو اسے حاصل ہو جائے بلکہ اس چیز سے ہے جس کے حصول کے لیے وہ تڑپتا ہے۔

(خلیل جبران)

ندا طارق۔ فیصل آباد

تاثیر میرے لہجے کی،

- کوشش کیجیے، جن کے ساتھ عمر گزارنے کا سودا طے ہو ان سے دل ملیں نہ ملیں، ذہن ضرور ملتے ہوں۔
- ندامت کا اظہار محض لفظوں کا محتاج نہیں۔ یہ رویوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔
- معاف کرنے کا مطلب ہے کسی بھی ناخوشگوار واقعے کو اس طرح سمجھ لیا جائے جیسے یہ وقوع پذیر ہی نہ ہوا ہو۔
- اپنی غلطی تسلیم کرنا مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے لیکن ناممکن کاموں میں سے نہیں۔
- ایسی خوبیاں، جو محض دنیا دکھاوے کو اپنائی گئی ہوں، خامیوں سے بھی بدتر ہوتی ہیں۔
- اگر تمام لوگ کائنات کی بدصورتی ہوتے تو یہ دنیا جہنم ہوتی اور اگر تمام لوگ کائنات کا حسن ہوتے تو یہ دنیا جنت ہوتی۔

نادیہ یاسر۔ گوجرہ

جھوٹ سے برا،

اماں کو میری بات ٹھیک سے سمجھ میں آ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ میری طرف کیے بغیر نئی روٹی بیلتے ہوئے پوچھا۔

"تو اپنی کتابوں میں کیا پیش کرے گا؟"

میں نے تڑپ کر کہا۔ "میں سچ لکھوں گا اماں اور سچ کا پرچار کروں گا۔ لوگ سچ کہنے سے ڈرتے ہیں اور سچ سننے سے گھبراتے ہیں۔ میں انہیں سچ سناؤں گا اور سچ کی تلقین کروں گا۔"

میری ماں فکر مند سی ہو گئی۔ اس نے بڑی درد مندی سے مجھے غور سے دیکھا اور کوئلوں پر پڑی ہوئی روٹی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تو نے سچ بولنا ہے تو اپنے بارے میں بولنا۔ دوسرے لوگوں کی بابت سچ بول کر ان کی زندگی عذاب میں نہ ڈال دینا۔ ایسا فعل جھوٹ سے بھی برا ہوتا ہے۔"

(اشفاق احمد)

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... صائمہ انصار
میک اپ ... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ..... موسیٰ رضا

احد میر سے ملاقات

شاہین رشید

"یقین کا سفر" کے بعد احد رضا میر نوجوان دلوں کی دھڑکن بن گئے تھے۔ اور اب "آنگن" میں اپنی بہترین پرفارمنس سے نوجوان لڑکیوں کے پسندیدہ ہیرو بن گئے ہیں۔ احد میر کم کام کرتے ہیں مگر بہترین۔

"کیا حال ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

"آپ اسکرین پہ دیکھ تو رہی ہیں۔"

"جی...... بالکل دیکھ رہی ہوں...... فیلڈ سے متعلق باتیں بھی ساتھ ساتھ چلیں گی اور پرسنل سوال بھی...... تو پہلے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ؟"

"میرا نام "احد رضا میر" ہے سب لوگ مجھے پیار سے بھائی بھی کہتے ہیں "احد" بھی کہتے ہیں۔ 29 ستمبر 1993ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ میری ہائیٹ 5 فٹ 9 انچ ہے جبکہ میرا استارہ "لبرا" ہے ہم دو ہی بھائی ہیں۔ بھائی مجھ سے چھوٹا ہے۔ چھوٹا بھائی پروڈکشن سائیڈ پہ ہے۔ میں نے ڈراما میں بیچلر کیا ہے یعنی "بیچلر آف فائن آرٹ ان ڈراما" میرا مائنڈ بزنس کی جانب ہے۔ دیکھیں فیوچر میں کیا کرتا ہوں...... مگر فی الحال ڈراما اور فلم کی سائیڈ ہوں۔"

"بچپن سے ہی یہ سوچا تھا کہ اس فیلڈ میں آنا ہے؟"

"بچپن میں تو انسان خواب دیکھتا ہے کہ میں ایسا کام کروں کہ سب خوش ہو جائیں اور سچ پوچھیں کہ بچپن میں ہی ماحول ایسا دیکھا تو خواہش ہوئی کہ اس فیلڈ میں آؤں...... چنانچہ کالج کے زمانے میں تھیٹر میں کام کیا اور پھر میں نے سوچا کہ جب مجھے اس فیلڈ میں آنا ہے تو اپنا وقت ضائع کیوں کروں۔ اس فیلڈ میں یعنی شوبز میں ہی کیوں نہ کام کروں...... اور اپنے اس خواب کو کیوں نہ پورا کروں...... چنانچہ پھر اس میں تعلیم حاصل کی۔"

''والد صاحب آئیڈیل بنے اس فیلڈ میں؟''

''آئی لو فلم...... مجھے شروع سے ہی فلم میں کام کرنا تھا۔ والد صاحب تو آئیڈیل ہیں ہی، مگر میرے اندر بھی اداکاری کا کیڑا اچھل رہا تھا اور جب پہلی بار اسٹیج کیا تو اس کیڑے نے اور بھی کھلبلی مچائی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اداکاری مجھے ورثے میں ہی ملی ہے کیونکہ میرے دادا بھی میڈیا میں تھے...... تو کچھ ہے کہ جس کی وجہ سے اداکاری میرا جنون بنی۔''

''پہلی بار آفر آئی یا آپ نے خود رابطہ کیا کسی سے؟ اور گھر والوں نے خوش دلی سے کہا کہ اس فیلڈ میں آجاؤ؟''

''گھر والوں نے مجھے کبھی روکا ٹوکا نہیں بلکہ فری ہینڈ دیا کہ جو تم کرنا چاہتے ہو، کرو...... اور مجھے سپورٹ بھی کیا، مگر میرے لیے یہ بات طعنہ بنی کہ چونکہ تم آصف رضا میر کے بیٹے ہو۔ اس لیے اس فیلڈ میں آسانی سے آگئے ہو...... مگر میں یہ کہتا ہوں کہ اگر مجھے اپنے باپ کے نام کا فائدہ اٹھانا ہوتا تو میں اس فیلڈ میں پڑھائی نہ کرتا میں آرام سے ''بزنس'' میں ڈگری لے سکتا تھا، مگر میں نے اس فیلڈ میں پڑھائی کی تاکہ میں اپنے بل بوتے پہ اس فیلڈ میں آسکوں اور آپ یقین کریں کہ میں جب اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تو فیلڈ میں اینٹری کے جو پروسس ہوتے ہیں، ان سب سے گزرا ہوں...... اور بہت سے لوگوں کو بہت بعد میں پتا چلا کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔''

''یقین کا سفر'' پہلا سیریل تھا؟''

''نہیں جی، پہلا سیریل ہم ٹی وی کا ''خاموشیاں'' تھا۔ پھر ''دسمی'' بھی کیا اور ''یقین کا سفر'' نے تو دھوم ہی مچادی۔''

''بچپن سے آپ اس فیلڈ کو دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ کیسی لگتی ہے، کام کے لحاظ سے، ماحول کے حساب سے؟''

''میرے خیال میں کام کے لحاظ سے اور ماحول کے لحاظ سے بہت اچھی فیلڈ ہے اور جب آپ کام کرتے ہیں اور آپ کی تعریف ہوتی ہے۔ آپ کو پہچان ملتی ہے، لوگوں سے پیار ملتا ہے۔ عزت ملتی ہے تو اس وقت بہت اچھا محسوس ہوتا ہے۔''

''لوگوں کا پیار، لپک کر ملنا...... سیلفیز بنوانا...... کبھی ان باتوں سے جھنجلاہٹ ہوتی ہے؟''

''بالکل ہوتی ہے...... آپ کی اپنی پرسنل لائف بہت متاثر ہوتی ہے مگر ہم کچھ کہہ نہیں سکتے کہ ڈر لگتا ہے کہ اللہ ناراض نہ ہو جائے اور ہمارے چاہنے والے ہم سے ناراض نہ ہو جائیں۔''

''روز مرہ کی روٹین کیا ہے اور بہن نہیں ہے آپ کی تو امی کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟''

''صبح اٹھ کر فریش ہوتا ہوں۔ آٹھ بجے میری صبح ہو جاتی ہے۔ فریش ہونے کے بعد جم جاتا ہوں اور پھر اپنے کام پر اور رہی بات امی کا ہاتھ بٹانے کی یا گھر کے کاموں میں دلچسپی کی تو جناب جب میں کینیڈا میں اکیلا رہتا تھا تو سب کام خود کرتا تھا۔ گھر کی صفائی خود کرتا تھا، کھانا بھی خود پکاتا تھا اور میں بہت اچھا کک ہوں اور مجھے اچھا لگتا ہے اپنا کام خود کرنا، اپنا کام کر کے بڑا سکون ملتا ہے۔''

''آپ کا ایک سیریل ''دسمی'' بہت مشہور ہوا تھا اور آج کل پھر ''آن ایر'' تو اس میں بال بہت لمبے ہیں تو کردار کی ڈیمانڈ تھی یا اپنا شوق تھا؟''

''جی...... ایک وقت تھا جب مجھے بڑے بال رکھنے کا شوق تھا اور جب کینیڈا میں تھا تب بال بڑے رکھے تھے۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جب میں پاکستان آؤں گا تو مجھے اپنے بال چھوٹے کرنے پڑیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ اپنی اینٹری بڑے بالوں سے دوں۔ قسمی کیا پھر جب ''یقین کا سفر'' کا اسکرپٹ میرے پاس آیا تو جیسا کہ شروع میں دکھایا گیا تھا کہ میں بہت فن کرنے والا لڑکا ہوں تو میں نے سوچا کہ بال بڑے ہی رہنے چاہئیں اور پھر جیسے ہی کردار کہانی کے حساب سے چینج ہوا میں نے اپنے بال کٹوا لیے۔ اس طرح جب فلم ''پرواز ہے جنون'' کی تب بھی بال چھوٹے رکھے کہ ایک فوجی کی جو ڈیمانڈ ہوتی ہے وہ پوری کی میں نے۔''

''پرواز ہے جنون'' تو ماشاء اللہ بہت کامیاب ہوئی، مزید فلمیں بھی انڈر پروڈکشن ہیں؟''

''ہاں جی...... ہیں مگر ابھی بتانا مناسب نہیں ہے۔''

''اتنی شہرت، اتنی عزت...... فخر کرتے ہیں اپنے آپ پر؟''

''جی...... بالکل اپنے آپ پر بھی بہت فخر ہوتا ہے جب کام کے حوالے سے کوئی میری تعریف کرتا ہے اور اس وقت اور بھی زیادہ فخر ہوتا ہے جب میں اپنے والد کو دیکھتا ہوں۔''

''اپنی کسی عادت سے خود پریشان ہوئے؟''

''میری بچپن سے ایک عادت ہے کہ دوسروں کو خوش کرنے کی خاطر اپنے آپ کو بھول جاتا ہوں۔ اب میرے پاس خواہ ٹائم ہو یا نہ ہو مگر سب کو خوش کرنے کے لیے ان کے ساتھ ٹائم ضرور گزارتا ہوں۔''

''غصہ آتا ہے؟''

''جی بالکل آتا ہے، کیونکہ میں بھی انسان ہوں اور میرا غصہ بالکل پریشر کوکر کی طرح ہے کہ جس میں کچھ پکتا رہتا ہے اور پھر کبھی وہ ایک دم سے پھٹ جاتا ہے۔ میرا غصہ بھی جب برداشت سے باہر ہو جاتا ہے تو ایک دم میں پھٹ پڑتا ہوں۔''

''تو گھر میں کسی کا غصہ تیز ہوگا نا...... تب ہی تو؟''

''میں کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتا...... لیکن گھر میں جب ''آصف رضا میر'' صاحب کو غصہ آتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے زمین ہل رہی ہو۔''

''اتنے سال کینیڈا میں رہ کر آئے ہیں تو یاد آتا ہے کینیڈا؟''

''میں اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہوں کہ میرے پاس پاکستان کا پاسپورٹ تو ہے ہی، میرے پاس کینیڈا کا پاسپورٹ بھی ہے۔ مگر دونوں ممالک ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں...... میں پاکستان میں ہوتا ہوں تو مجھے کینیڈا بہت یاد آتا ہے اور جب کینیڈا میں ہوتا ہوں تو مجھے پاکستان بہت یاد آتا ہے۔''

''جب لوگوں کے پاس پاسپورٹ نہ بھی ہو تب بھی وہ باہر جاتے ہیں تو ان کا واپس آنے کو دل نہیں چاہتا...... اور آپ؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں کبھی بھی اپنے ملک کا موازنہ دوسرے ملکوں سے نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اپنا ملک تو پھر اپنا ملک ہی ہوتا ہے...... بس ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ جو یہاں برا ہو رہا ہے اسے درست کر دیں۔''

''آپ کی پرفارمنس پہ تعریف تو بہت ہوتی ہے۔ کسی نے تنقید بھی کی کہ یہاں اچھا نہیں کیا...... یا یوں کر لیتے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑا تنقید نگار انسان کو خود ہونا چاہیے...... تو میں دوسروں کی تنقید کا انتظار نہیں کرتا بلکہ میں خود اپنے ڈراموں کو اور فلموں کو غور سے دیکھتا ہوں کہ کہاں غلط کیا ہے میں نے اور ہمیشہ اپنے آپ کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں...... اور میرے بابا سب سے بڑے کریٹک ہیں...... اور اب تک میں نے جتنا بھی کام کیا ہے ان میں صرف ایک ''سین'' کی تعریف انہوں نے کی ہوگی۔ اور مجھے بالکل بھی برا نہیں لگا۔ کیونکہ انہوں نے اس انڈسٹری کو بہت سال دیے ہیں۔ وہ جو کہیں گے سو فیصد ٹھیک ہوگا اور میں چاہتا ہوں کہ لوگ میری خامیاں بتائیں تاکہ میں مزید اچھا کام کر سکوں۔''

''باہر رہے مگر پھر بھی اردو بڑی صاف ہے؟ ...... وجہ؟''

''یہی بات میں بتانا چاہ رہا تھا کہ میں تنقید کو پوزیٹو لیتا ہوں، جب میں کینیڈا سے آیا تو مجھے اردو نہیں آتی تھی۔ مشکل سے بولتا تھا اور پڑھنی تو بالکل بھی نہیں آتی تھی...... مگر مجھے لگا کہ یہ میری خوبی نہیں میری خامی ہے۔ چنانچہ میں نے آہستہ آہستہ اردو پڑھنا سیکھی...... اور اب اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ

پڑھنا لکھنا آتا ہے...... اور کیوں نہ آئے کہ اب میرا بھی پروفیشن ہے۔ مجھے اردو اور انگریزی دونوں پہ عبور ہونا چاہیے۔"

"کوئی ایسا سین جس کو دیکھ کر آپ کے چاہنے والوں کو برا لگا ہو؟"

"جب میں نے ڈرامہ سیریل "سمی" میں "مرنے" کا سین کیا تھا اب گھر والوں کو تو پتا ہے کہ یہ ڈراما ہے پھر میں جیتا جاگتا ان کے سامنے تھا۔ مگر جو لوگ میرے فینز ہیں انہیں بہت جھٹکا لگا...... کہ میں نے ایسا سین کیوں کیا اور مجھے میسیجز آرہے تھے کہ اب میں سمی نہیں دیکھوں گی۔ میں سمی نہیں دیکھوں گی۔"

"کبھی اپنے والد کے ساتھ کام کیا؟"

"نہیں...... ابھی تک نہیں...... اور بڑی خواہش ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ کام کروں۔ دیکھیں کہ کب خواہش پوری ہوتی ہے۔"

"کون سا کردار ہے جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟"

"یہ نہیں کہوں گا کہ نگیٹو کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ایسا کردار جس میں یہ شو ہو کہ یہ بندہ پاگل نہیں ہے...... مگر سوچ کیا رہا ہے ایسا کردار ہو...... تھوڑا ذہنی معذور سا کردار ہو۔ ویسے کردار کرتے وقت میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ اسے رومینٹک کیسے بناؤں۔"

"اور مشہور کون سے ہوئے؟"

"سچ پوچھیں تو میرے سارے ہی کردار ہٹ ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی ڈاکٹر اسفند یار کا کردار جو میں نے "یقین کا سفر" میں کیا تھا۔ بہت ہٹ گیا تھا۔"

"کوئی کردار جو لینے سے انکار کیا ہو؟"

"مجھے ہمیشہ اچھے کردار ہی آفر ہوئے ہیں...... اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"باہر رہ کر آئے ہیں تو وقت پر سب کام کرتے ہیں یا دوسروں کو انتظار کرواتے ہیں؟"

"جو بندہ ملک سے باہر رہ کر آتا ہے وہ پھر وقت کی پابندی ٹھیک ٹھاک کرتا ہے...... میں بھی اپنے وقت سے پندرہ منٹ پہلے ہی پہنچ جاتا ہوں اور میں کہتا ہوں کہ اگر میں جان بوجھ کر لیٹ ہو جاؤں تو پھر بے شک آپ مجھے کام سے نکال دیں۔"

"تحفے عموماً دوسروں کو دیے جاتے ہیں۔ اگر کبھی اپنی کارکردگی سے بہت خوش ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟"

"جب اپنے کام سے خوش ہوتا ہوں۔ تو اپنے آپ کو یہ تحفہ دیتا ہوں کہ میں ٹریول کرتا ہوں...... کیونکہ مجھے ٹریولنگ کا بہت شوق ہے۔"

"گھر میں رف ٹف رہتے ہیں یا اپ ڈیٹ...... اور کھانا کھانے کے معاملے میں بھی کیا رف ٹف ہیں؟"

"گھر میں تو بے شک رف ٹف ہی طریقے سے رہتا ہوں، مگر کھانا میں ڈائننگ ٹیبل کے علاوہ کہیں نہیں کھاتا...... اپنے کمرے میں بھی نہیں کھاتا۔"

"ڈرامے کے کردار کیا حقیقت میں بھی ہوتے ہیں؟"

"جی بالکل ہوتے ہیں۔ تب ہی تو آپ کو نظر آتے ہیں اور ہمارے کرداروں میں اکثر لوگوں کو اپنا عکس نظر آرہا ہوتا ہے۔"

"آپ نے کہا کہ میں بہت اچھا کھانا بھی پکا لیتا ہوں تو کیا کیا پکا لیتے ہیں؟"

"میں سوائے دیسی کھانوں کے ہر کھانے پکا لیتا ہوں اور ویسے مجھے سبزیاں اچھی لگتی ہیں۔ میں "بھنڈی" بہت شوق سے کھاتا ہوں۔"

"آپ گلوکاری بھی کرتے ہیں اور اداکاری بھی...... پہلی ترجیح کیا ہوگی؟"

"اداکاری...... اداکاری سے مجھے زیادہ لگاؤ ہے۔"

"فیوچر پلاننگ کیا ہے......؟" ہم نے آخری سوال پوچھا۔

"اس فیلڈ میں بہت آگے جانا چاہتا ہوں اور اب ہماری فلم انڈسٹری اور ٹی وی انڈسٹری میں جو چینج آرہا ہے میں بھی اس کا حصہ بننا چاہتا ہوں اور اس انڈسٹری میں انقلاب لانا چاہتا ہوں۔"

* * *

[illegible]

واصفہ سہیل

شکایت

پی ایس ایل فور اختتام کو پہنچا اور تیسری مرتبہ فائنل میں پہنچنے والی ٹیم کوئٹہ گلیڈی ایٹرز نے بالآخر فائنل جیت کر پہلی مرتبہ ٹرافی اپنے نام کرلی۔

پی ایس ایل فور کے آغاز سے ہی کرکٹ کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگا تھا۔ ہر جگہ کرکٹ کے مداح خوش دکھائی دے رہے تھے۔ خاص طور پر کراچی کے لوگ ایک طویل عرصے کے بعد کسی ایونٹ میں یوں دل کھول کر شریک ہوئے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ پی ایس ایل فور کے آٹھ میچ کراچی میں ہوئے جس میں کراچی والوں کا روایتی جوش و خروش نظر آیا۔

پی ایس ایل سیزن فور کی افتتاحی تقریب میں نازیہ اور زوہیب حسن کا گانا "ڈسکو دیوانے" پر آئمہ بیگ اور شجاع حیدر نے پرفارمنس کی تھی (اور انتہائی بھدی کی تھی) ڈسکو دیوانے کو اجازت کے بغیر گانے پر زوہیب حسن نے برہمی کا اظہار کیا ہے (بالکل ٹھیک کیا۔ اتنی بری پرفارمنس پر تو ڈبل ناراضی۔) اور ایونٹ انتظامیہ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا اعلان کردیا ہے۔ (اب یہ صرف اعلان ہی نہ ہو کیوں کہ......؟) اس اعلان پر پی ایس ایل انتظامیہ اور عہدے داروں کی طرف سے خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ انہوں نے اس پر کوئی جواب نہیں دیا ہے۔

ڈسکو دیوانے میوزک البم 1980ء میں ریلیز کیا گیا تھا۔ اس کے کئی گانے مشہور ہوئے تھے لیکن ڈسکو دیوانے نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ اس گانے کو بھارتی موسیقاروں نے بھی کاپی کیا اور اس کے ری مکس بنائے۔

قرض

میرا نے شہریار منور کی اداکاری کی تعریف کی تو شہریار منور نے فوراً قرض اتارتے ہوئے کہا کہ "میرا

فلم انڈسٹری کی سینئر آرٹسٹ ہیں، وہ خود بہت بڑی اسٹار ہیں (آہم) ان کی پاکستان فلم انڈسٹری کے لیے بڑی خدمات ہیں (آہم آہم!!)

اپنے کیریر کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے شہر یار منور نے بتایا کہ ان کے پاس چار پانچ پروجیکٹ ہیں۔ ابھی وہ اسکرپٹ پڑھ رہے ہیں (ہائیں تو پہلے کیا بغیر پڑھے؟) فی الحال کچھ نہیں بتا سکتے، شروع میں فلمیں کرلیں (جی فلم نام ہی ایسا ہے کہ اداکار اسکرپٹ پڑھنے کی زحمت نہیں کرتے اور......؟) لیکن اب اسکرپٹ پڑھنے میں زیادہ وقت لگاتا ہے۔ (ایسا نہ ہو آپ زیادہ وقت اسکرپٹ میں لگا دیں اور کوئی اور یہ کردار کر بھی لے تو......) جس کی اسٹوری دل کو لگی اور جو مزے کی ہوئی، وہ ضرور کروں گا۔ (مطلب دماغ کی چھٹی؟) کہانی سب سے اہم ہے۔ (کہانی ہوتی ہے ہماری فلم میں؟ معصومانہ سا سوال ہے یہ۔)

تنازع

سنا ہے کہ میرا کو جس فلم کی اوپننگ کی تقریب میں دبئی سے بلایا گیا تھا اس سے انہیں نکال دیا ہے۔ میرا کے منیجر نے بتایا کہ میرا کو اس فلم کی اوپننگ میں مدعو کیا گیا تھا لیکن بعد میں انہیں کٹ کر دیا گیا (یعنی جلدی عقل آ گئی بھئی ڈائریکٹر کو اور کسے؟) معلوم ہوا ہے کہ میرا شروع سے ہی فلم میں نہیں تھیں (یعنی ماموں بنایا......نہیں بلکہ......؟)

فلم کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر نے کہہ دیا کہ میرا جو معاوضہ مانگ رہی ہیں، وہ بہت زیادہ ہے اور ویسے بھی میرا کا اس فلم میں کردار نہیں بنتا۔ (تو یہ بات اوپننگ میں بلانے سے پہلے نہیں پتا تھی جو......؟) فی الحال تو میرا کے منیجر اور فلم کے پروڈیوسر میں میرا کے سفری اخراجات کا تنازع چل رہا ہے۔

خواہش

صبا قمر کا شمار مقبول فنکاروں میں ہوتا ہے۔ اپنی ذاتی زندگی کے متعلق صبا کہتی ہیں کہ ”زندگی اتنی گلیمرس نہیں ہوتی جتنی آن اسکرین نظر آتی ہے“ (بالکل آج یہ بات سمجھنے کی زیادہ ضرورت ہے) اور ہر ایک کی طرح ان کے اندر بھی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہیں۔

لوگوں کو لگتا ہوگا کہ ان کے سامنے امیدواروں کی لمبی قطار ہوگی (ہیں، تو کیا نہیں ہے؟) جو ان سے شادی کرنا چاہتے ہیں مگر حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ (افسوس ہے صبا؟) میں تنہا ہوں (اپنی ذات میں سب ہیں) اور زندگی کا سفر اچھا ہے (ہم سفر کے بغیر؟) لوگوں کا تاثر ہے کہ بہت سے لوگ میرا ہاتھ تھامنے کے منتظر ہوں گے لیکن یہ حقیقت نہیں۔ میری خواہش ہے کہ ایسا ہوتا۔

کچھ ادھر ادھر سے

☆ اگر نئے پاکستان کے نئے وزیراعظم کی عوامی تقریر تھر کے ایک باسی کی سماعت سے سنی جائے تو ہمیں لبنان کے شاعر اور مفکر خلیل جبران کے یہ الفاظ یاد آ جاتے ہیں

”اگر تم بھوکے شخص کے سامنے گانا گاؤ تو وہ تمہارا گیت پیٹ سے سنے گا۔“

(اعجاز منگی۔ آواز حق)

☆ تھر کے لوگ غربت کے باعث قرض کے مرض میں مبتلا ہیں۔ جب وہ قرض ادا نہیں کر سکتے اور چھوٹے قرض دینے والی این جی اوز اور بینک انہیں پریشان کرتے ہیں تو وہ خودکشی کر لیتے ہیں۔ تھر میں خودکشی کی روایت بہت پرانی اور بے حد عام ہے۔ جب بھی کوئی تھری، خاص طور پر تھری عورت پریشان ہوتی ہے تو وہ کنویں کا رخ کرتی ہے۔ تھر کی عورتیں کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرتی ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ساری زندگی پیاس میں گزارتی ہیں اور سوچتی ہیں کہ مرتے ہوئے تو ان کی پیاس بجھ جائے۔

(اعجاز منگی۔ آواز حق)

امتہ الصبور

ٹیکسلا کی کہانی

یہ اس وقت کی بات ہے جب برصغیر کے مسلمان انگریزوں کی غلامی میں بدترین حالات کا سامنا کر رہے تھے۔ انگریز کے ظلم و ستم سے زمین و آسمان بھی کانپ رہے تھے۔ برصغیر کے شہروں میں ٹیکسلا انگریز حکومت کی چھاؤنی تھا۔

یہاں پر انگریزوں کے بڑے بڑے خاندان موجود تھے۔ انگریز یہاں مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے تھے پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ٹیکسلا میں زلزلہ آیا۔ مسلمانوں کو اللہ نے بچا لیا، جبکہ انگریز روندے گئے۔

کچھ سال یا مہینوں بعد ایسا پھر ہوا، تین بار تقریباً یہ عمل ہوا۔ دنیا کے لیے یہ مناظر نہایت عبرت ناک تھے۔ انگریز کے دور سے پہلے بھی ٹیکسلا ہزاروں برس سے آباد تھا۔ اس قدیم زمانے میں بھی ٹیکسلا میں بارہ دفعہ زلزلہ آیا اور یہ شہر تباہ ہوتا رہا۔ آج بھی یہاں پرانے وقتوں کے کھنڈرات موجود ہیں۔ کچھ کھنڈرات گاؤں بھڑور گاہی کے پاس واقع ہیں۔ یہاں پہلے بہت ظالم حکمران حکومت کرتے تھے۔

ٹیکسلا کا کھنڈر ”سری کپ“ ایک ایسے ہی جابر حکمران کی یاد ہے۔ وہ بادشاہ اپنی رعایا پر بہت ظلم کرتا تھا۔ اس نے سات علیحدہ کمرے بنوا رکھے تھے۔ وہ جوئے کا شوقین تھا۔ ان کمروں میں اس شرط پر جوا کھیلتا کہ ہارنے والے کا سر کاٹ دیا جائے گا۔ ہمیشہ یہی ہوتا کہ بادشاہ جیت جاتا۔

وہ ایک دن میں سات کمروں میں سات آدمیوں سے جوا کھیلتا، جو ہار جاتے تو ان کے سر قلم کر دیے جاتے۔

دراصل بادشاہ نے ایک تربیت یافتہ چوہا پالا ہوا تھا۔ جب بادشاہ جوا ہارنے لگتا تو چوہا لالٹین کو بند کر کے تاش کے پتے آگے پیچھے کر دیتا۔

ایک شخص بادشاہ کی چال سمجھ گیا۔ وہ بادشاہ کے ساتھ اس کمرے میں جوا کھیلنے گیا۔ اس کے پاس ایک بلی بھی تھی۔ اس بلی کو لالٹین کے پاس بٹھا دیا اور بادشاہ کے ساتھ کھیل میں مصروف ہو گیا۔ جب چوہا لالٹین کے پاس آیا تو وہاں بلی کو پا کر دم دبا کر بھاگ گیا۔ اس طرح بادشاہ جوا ہار گیا اور اس کا سر قلم کر دیا گیا۔

تب سے یہ جگہ (سری کپ) کہلاتی ہے۔ سری کپ کے معنی ہے سر کاٹنے والا۔ بعد میں یہ جگہ زلزلے سے تباہ ہو کر زمین میں دھنس گئی۔

یہاں پرانی چیزیں بھی ملتی ہیں اس لیے حکومت نے یہاں ایک میوزیم قائم کیا ہے۔ جہاں سپاہیوں کے ہتھیار، بت اور پرانے سکے موجود ہیں۔ کھنڈرات سے سونے، چاندی کا سامان بھی ملا ہے۔ اب وہاں کھنڈرات میں بچے کھیلتے ہیں اور بڑے بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں حالانکہ یہ عبرت کی جگہ ہے۔

شہناز شازے سیال...... ضلع خانیوال

جہلم

ایک عام غلط فہمی جو پیدا ہو چکی ہے وہ یہ ہے کہ ”جہلم“ سکندر اعظم کے گھوڑے کا نام تھا حالانکہ یہ بات حقیقت نہیں ہے۔ دراصل سکندر اعظم کے گھوڑے کا نام ”بیوک فالس“ تھا جسے بیوسی فالا بھی لکھا جاتا ہے۔ اس گھوڑے کو لڑائی کے دوران راجہ پورس کے بیٹے نے شدید زخمی کر دیا تھا۔ راجہ پورس کا بیٹا سکندر کے ہاتھوں مارا گیا۔ مگر سکندر کا یہ مشہور اور پیارا گھوڑا بھی جانبر نہ ہو سکا اور دم توڑ گیا۔ سکندر نے

اسے دلاور کے مقام پر دفن کر دیا اور یہاں آباد بستی کا نام بوکفالیہ رکھ دیا۔ اسی نسبت سے جہلم کا قدیم نام بوکفالیہ بھی ملتا ہے مگر بعض حضرات ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے موجود پھالیہ (منڈی بہاؤالدین) کو بوکھالیہ سمجھتے ہیں۔ سکندر نے جس مقام کو بوکفالیہ بنا دیا تھا، اس کا قدیم نام اودھی نگریا اودھم نگر مشہور تھا۔

جہلم کے نام کے بارے میں مؤرخین کی مختلف آرا ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ جہلم کا نام پہلے ”جلہم“ تھا۔ ”جل“ کا مطلب پانی اور ”ہم“ کا مطلب ٹھنڈا اور میٹھا ہے۔ جلہم کی ایک وجہ تسمیہ یہ بھی بیان کی ہے کہ جب دارائے اعظم اپنی فتح کے جھنڈے گاڑتا ہوا، دریائے جہلم کے کنارے واقع ایک مقام پر پہنچا تو اس نے اپنا پرچم وہاں نصب کر دیا اور اسے ”جائے علم“ یعنی ”پرچم کی جگہ“ قرار دیا۔ یہ لفظ کثرت استعمال سے ”جہلم“ ہو گیا جس جگہ اب آباد ہے اور ”دارا پور“ کے نام سے معروف ہے جو بجوالہ کلاں کے نزدیک پنڈ دادنخان روڈ پر واقع ہے۔ اسی مقام سے آگے ”دلاور“ کا تاریخی گاؤں ہے۔ جہاں مؤرخین کے مطابق سکندر اعظم کے بسائے ہوئے شہر بوکفالیہ کے آثار ہیں۔

ایک روایت دیگر کے مطابق حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بھائی حضرت سعید بن ابی وقاصؓ کو چین میں تبلیغ اسلام کے لیے بھیجا گیا تو وہ اپنے سفر کی منازل طے کرتے ہوئے ایک روز چاندنی رات میں جہلم کے پاس پہنچے تو انہوں نے اس شہر کا عکس جھلملاتے پانی میں دیکھ کر بے ساختہ کہا۔

”ہذا جہیلم“ جس کا مطلب ہے ”چاندنی میں نہایا ہوا لب دریا شہر“ اور ان کے ان الفاظ نے اس شہر کو جہلم کا نام دے دیا۔

ایک بڑی حیرت انگیز بات یہ بھی ہے کہ انگریزی زبان میں جہلم کے ہجے جہلم نہیں بلکہ ”جہیلم“ ہیں یعنی Jhelum جبکہ جہلم کے ہجے Jehlum ہونے چاہئیں۔

حمیرا افتخار......جہلم
(اقتباس......تاریخ جہلم)

ابلیس کے ساتھی

ابلیس کا اصلی نام عزازیل ہے۔ ابلیس کی کنیت ابو قیتر یعنی تکبر کا باپ ہے۔ ابلیس کے لفظی معنی ”انتہائی مایوس“ کے ہیں۔ اصلاحاً یہ اس جن کا نام ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے آدم علیہ السلام اور بنی آدم علیہ السلام کے لیے مطیع و مسخر ہونے سے انکار کر دیا۔ ابلیس کو انسان پر کوئی اختیار حاصل نہیں کہ وہ زبردستی اسے کھینچ کر اپنی راہ پر لے جائے۔ وہ صرف بہلانے، پھسلانے سے کام لے سکتا ہے۔ شیطان کے پانچ اہم ساتھی ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔

1 ثبر:۔ اس کے اختیار میں مصیبتوں کا کاروبار ہے جس میں لوگ ہائے واویلا کرتے ہیں اور گریبان پھاڑتے ہیں۔ منہ پر طمانچے مارتے ہیں اور جاہلیت کے نعرے لگاتے ہیں۔

2 اعور:۔ یہ لوگوں کو بدی کا مرتکب کرتا ہے اور اسے ان کو اچھا اور پسندیدہ کر کے دکھاتا ہے۔

3 مسوط:۔ یہ کذب اور دروغ پر مامور ہے، جسے لوگ کان لگا کر سنیں۔ یہ انسانوں کی شکل اپنا کر ان سے ملتا ہے اور انہیں فریاد برپا کرنے کی جھوٹی خبریں سناتا ہے۔

4 داسم:۔ یہ آدمی کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوتا ہے اور گھر والوں کے عیب اس کو دکھاتا ہے اور ان پر غضب ناک کرتا ہے۔

5 زلنبور:۔ یہ بازاروں کا مختار ہے۔ بازاروں میں آ کر یہ قسم قسم کی بدی اور بددیانتی کے جھنڈے گاڑتا ہے۔

(شیطان کا ایک اور ساتھی جس کا نام اذب ہے، حرم کعبہ کے قریب عقبہ نام کی کھائی میں مقیم تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مدینۃ النبیؐ کے لوگوں سے جنہوں نے اسلام قبول کیا، عقبہ کے مقام پر بیعت لے رہے تھے تو یہ ہی اذب جن چلایا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اے اذب بن اذیب واللہ! میں تیری سرکوبی کے لیے بھی فرصت نکالوں گا۔)

شیطان اور اس کے یہ تمام ساتھی روز محشر تک بنی نوع انسان کو بدی کی طرف مائل کرنے میں لگے رہیں گے۔

عرب میں بت پرستی کا آغاز

ود، سواع، یعوث، یعوق اور نسر حضرت نوح علیہ السلام اور ان سے پہلے کے زمانے میں پوجے جانے والے بت تھے۔ ان میں سے ود۔ مردانہ قوت اور عشق و قوت کا دیوتا تھا۔ اکثر لوگ اپنے بچوں کے نام اسی کے نام پر رکھتے۔

سواع:۔ محبوبیت اور حسن و جمال کی دیوی تھی۔

اس کا بت ایک حسین عورت کا سا تھا۔

یعوث:۔ جسمانی قوت کا دیوتا تھا۔ اس کی شکل شیر کی سی تھی۔

یعوق:۔ یعوق فتار کا دیوتا تھا۔ اس کی شکل گھوڑے کی سی تھی۔

نسر:۔ بصارت کا دیوتا تھا اور اس کی شکل باز اور گدھ جیسی تھی۔

طوفان نوح کے دوران یہ بت سیلاب میں بہہ گئے اور حجاز کی سرزمین میں جدہ کے ساحل پر ریت میں دب گئے۔ ایک طویل عرصے بعد ایک حجازی عمرو بن لحی نے انہیں ریت سے نکالا اور جدہ سے تہامہ لے گیا۔ عمرو بن لحی ایک کاہن تھا اور خانہ کعبہ کا متولی بھی۔ اس کی کنیت ابو شامہ تھی۔ حج کے موسم میں ابو شامہ نے اہل عرب کو بت پرستی کی دعوت دی۔ جسے عرب کے سرداروں نے بخوبی قبول کیا اور اس کی ابتدا ود سے کی گئی اور عرب کا ایک سردار عوف بن عذرہ ود کو اپنے ساتھ دومۃ الجندل لے گیا۔ (غزوہ تبوک کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو اس بت ود کو توڑنے کے لیے روانہ کیا۔ وہاں کے لوگ جب مانع ہوئے تو حضرت خالد بن ولیدؓ نے ان سے قتال کر کے اس بت کو توڑ دیا تھا۔) وہاں اس نے ود کے لیے معبد تعمیر کیا اور اسی بت کی نسبت سے اس نے اپنے بیٹے کا نام عبدود رکھا۔

دوسرا بت سواع بنی ہذیل کا ایک شخص حارث بن تمیم لے گیا اور اسے وادیٔ نخلہ میں رہاط کے مقام پر نصب کیا گیا۔ تیسرے بت یعوث کو قبیلہ مذحج کے ایک شخص انعم بن عمرو المرا کے سپرد کیا گیا۔ اس نے یعوث کے بت کو یمن میں ایک ٹیلے پر نصب کیا اور اس کا معبد بنوایا۔ چوتھے بت یعوق کو ہمدان کے شخص مالک بن مرثد نے خیوان کے مقام پر نصب کیا۔ پانچواں بت قبیلہ حمیر کے ایک شخص معدی کرب کو دیا گیا۔ یہ بت ارض سبا یعنی ارض یمن میں بلخع کے مقام پر نصب کیا۔ اس طرح وہ پانچوں بت جو سیلاب نوح میں کھو گئے تھے، ان کی پوجا پورے عرب میں ہونے لگی۔

ان پانچ بتوں کے علاوہ دوسرے بہت سے بتوں کو عرب میں لانے والا یہ ہی عمرو بن لحی ہے۔ ایک بار عمرو بیمار ہو گیا تو اسے کہا گیا کہ......

”اگر تو شام کی سرزمین میں بلقاء کے مقام پر موجود چشمہ میں جا کر نہائے تو ٹھیک ہو جائے گا۔“

جب یہ وہاں گیا تو اس نے دیکھا کہ لوگ وہاں بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اس نے پوچھا۔

”یہ کیا ہیں؟“

وہاں کے لوگوں نے اس سے کہا۔ ”ان بتوں سے ہم بارش پاتے ہیں اور اپنے دشمنوں پر غالب رہتے ہیں۔“

عمرو بن لحی نے ان سے کچھ بت مانگے۔ انہوں نے دے دیے اور عمرو نے لا کر خانہ کعبہ میں نصب کر دیے تھے۔

اس کے علاوہ یہ ہی عمرو تھا جس نے سرزمین عرب میں بحیرہ، سائبہ، وصلیہ اور حام کی صورت میں شرک کی ابتدا کی۔

ادارہ

خوب صورت بنیے

موٹاپا کم کرنے کی ورزشیں

ورزش نمبر 1

یہ ورزش موٹاپا کم کرتی ہے۔ بدن میں پھرتی پیدا کرتی ہے۔ ٹانگوں کے ڈھیلے پٹھوں کو مضبوط بناتی ہے۔

فرش پر سیدھی کھڑی ہوجائیں۔ دونوں ہاتھ کولہوں سے لگے رہیں۔ پیٹ کو اندر کی طرف سکیڑ لیں۔ سانس آہستہ آہستہ لیں۔ دائیں پیر کی ایڑی کو تیزی سے اٹھائیں۔ پورا پیر نہ اٹھائیں۔ پنجے زمین پر ٹکے رہیں۔ یہی عمل بائیں پیر کے ساتھ دہرائیں۔ یہ مشق دوڑنے کے مشابہ ہے۔ ایک ہی جگہ کھڑی رہ کر دوڑنے کی مشق کریں۔ ہر ٹانگ کو تقریبا سو بار اٹھائیں۔

ورزش نمبر 2

یہ ورزش کولہوں کی فالتو چربی کم کرتی ہے اور کمر کے نچلے حصہ کو آرام پہنچاتی ہے۔

فرش پر دونوں ہاتھ اور گھٹنوں کے بل جھک جائیں۔ ہاتھوں کو فرش پر اس طرح ٹکائیں کہ انگلیاں سامنے کی طرف رہیں۔ کمر سیدھی رکھیں۔ سانس آہستہ آہستہ لیں۔ بازو کندھے کے نیچے اور ٹانگیں کولہے کے نیچے عمودی شکل میں رہیں۔ سر کو نہ جھکائیں بلکہ کمر کی سیدھ میں رکھیں۔ اب پیٹ کو اندر کی طرف سکیڑ لیں اور کمر میں خم پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ پچاس سیکنڈ کے بعد پیٹ کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔ یہ عمل دس بار دہرائیں۔

ورزش نمبر 3

یہ ورزش رانوں کا گوشت کم کرتی ہے۔ کولہے کی چربی گھٹانے میں بھی مفید ہے۔

فرش پر سیدھی بیٹھ جائیں۔ پیٹ کو اندر کی طرف سکیڑ لیں۔ ٹانگوں کو سامنے کی طرف پھیلائیں۔ سانس آہستہ آہستہ لیں۔ دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر زمین پر رکھیں۔ صرف انگلیوں کی پوریں زمین پر ٹکائیں۔ اب دائیں گھٹنے کو خم دے کر بائیں طرف لے جائیں اور فرش کو چھو کر واپس لے آئیں۔ اب یہی عمل بائیں گھٹنے کے ساتھ دہرائیں۔ اس عمل کو دس بار دہرائیں۔ خیال رہے کہ انگلیوں کی پوریں ہر حالت میں زمین پر ٹکی رہیں۔ کچھ دنوں کی مشق کے بعد یہ عمل بیس بار دہرایا جاسکتا ہے۔

FaceFresh
Fairness Cream
Fairer Your Skin
Get it now →
Advanced FAIRNESS SOLUTION
FaceFresh
Fairness Cream
Soft & Fairer Skin within just few days
Extra Whitening Agents
HIGH SPF
Multi Vitamins
GMP
Pakistan Standards